بزنس سے پہلے

جلد اول

مؤلف

ندیم ایاز

مکتبہ دارالرحیل

تالیف :بزنس سے پہلے جلد اول
مولف : ندیم ایاز
قیمت : 500
مکتبہ :دارالرحیل
سال اشاعت :2022

Peaceofmindna.com website
Peaceofmind.na facebook page

مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے ایک سبب کاروبار چھوڑنا بھی ہے کہ سب مزدوری پہ لگ گئے اور جو تھوڑے بہت لوگ کاروبار کر بھی رہے تھے تو اسلامی تعلیمات سے ناواقف تھے الاماشاءاللہ۔

آج بھی ضرورت ہے کہ مہاجرین وانصار کی طرح قرآن وسنت کی روشنی میں زراعت اور کاروباری معاملات کئے جائیں۔

مختصر تعارف

میں نے قرآن کریم قاری نورالامین صاحب کے پاس حفظ کیا آخری 4 پارے بنوری ٹاون میں ۱۱ دن میں حفظ کئے ۔ حفظ دور قاری ظاہرصاحب کے پاس کیا ، درس نظامی کی کتابیں شیخ عبدالوکیل صاحب ، عنایت اللہ صاحب، شیر عالم صاحب ، روح الامین صاحب ، عبدالروف صاحب ، ھاشم صاحب اور صدرا لشھید صاحب اور بھی علماء سے کتابیں پڑھیں میں ان سب کے لئے دعا گو ہوں ۔
دورہ تفسیر القرآن شیخ عبدالسلام رحمہ اللہ، شیخ امین اللہ صاحب ، شیخ افضل خان شاہ پور شیخ ، شیخ طیب صاحب ، شیخ امیر حسین باچا صاحب ، اور شیخ روح الامین صاحب سے کئے ۔
اتحاد المدارس مردان اور وفاق المدارس السلفیہ فیصل آباد سے درس نظامی کے امتحانات دئیے ۔ تجوید اور حفظ کی بھی وفاق سے امتحان دیئے اور سب کے سند حاصل کئے ۔ ادیب عربی کا امتحان دیا اور سند حاصل کی ۔
تقابل ادیان کے تمام کورسز کئے ۔ اور اس کے علاوہ علم نفسیات میں بی ایس کیا ، پاکستان انسٹیٹیوٹ آف منیجمنٹ سے انڈسٹریل اینڈ ارگنائزیشنل سائکالوجی میں ڈپلومہ کیا ،ہیپی لائف سائکولوجیکل سروسز سے چھ مہینے کا کورس کلینیکل سائکالوجی میں کیا ۔ کمپلیمینٹری تھراپیز میں ڈپلومہ سری لنکا سے ، این ایل پی اور ہپناسز کورسز سر ارسلان لاڑیک اور سر سدید مرزا کے ذریعے امریکن بورڈ آف نیورولنگویسٹک پروگرامنگ سے کیا ،پریسٹن یونیورسٹی سے ڈاکٹر عمران صاحب سے این ایل پی کے ایک سالہ کورس میں داخلہ لیا لیکن ایک سیمیسٹر کے بعد مکمل نہیں کرسکا اور اسی طرح کئی آن لائن کورسز مکمل کئے اور ایک خاصی تعداد میں سیمینارز اور ورکشاپس اٹینڈ کئے ۔
عمرہ کے سفر میں جدہ ، مکہ ۔ مدینہ، طائف اور خیبر کے علاقوں کی زیارت نصیب ہوئی الحمد للہ ۔ دبئ کے سفر میں ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب کے تین روزہ پیس کانفرنس میں شرکت کی اور مختلف خوبصورت مقامات اور خصوصا ابوظہبی کی مشہور شیخ زید مسجد جانا ہوا۔
13مرتبہ خود دورہ تفسیر القرآن کے درس دئے مختلف مقامات پر ۔ اس کے علاوہ روزانہ کے دروس اور جمعہ کے خطبات اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بے شمار ہیں ۔

بہت سے طلباء اور طالبات نے مجھ سے قرآن و حدیث سیکھا میں ان سب کے لئے دعا گو ہوں یہ سب میرے اور میرے اساتذہ کے لئے صدقہ جاریہ ہیں ۔

تالیفات

(1) قرآنی دعائیں
(2) اللہ کے بندے مادہ پرست نہیں ہوتے
(3) اصلاح النساء
(4) طرق التفسیر
(5) قرآن مجید کی تفسیر کے اقسام
(6) المناهج المختلفة للمفسرين
(7) الكبائر التي ذكرها الإمام الذهبي
(8) اسلام سائنس اور الحاد
(9) ملحدین کے پچاس اعتراضات کے جوابات
(10) ملحدین کی اصلاح
(11) خدا کے بارے میں ملحدین کی پریشانی کا علاج
(12) پاکستان میں اسلامی دستور کے لیے علماء کے 22 متفقہ نکات
(13) أسهل طريقة لحفظ القرآن الكريم
(14) صحیفہ ہمام بن منبہ
(15) المعجم الصغير للطبرانی
(16) پیغام مدینہ جلد اول
(17) پیغام مدینہ جلد دوم
(18) پیغام مدینہ جلد سوم
(19) پیغام مدینہ جلد چہارم
(20) پیغام مدینہ جلد پنجم
(21) پیغام مدینہ جلد ششم

(22) پیغام مکہ جلد اول
(23) مقالات حصن المسلم جلد اول
(24) مقالات سیرت جلد اول
(25) مقالات سیرت جلد دوم
(26) مقالات سیرت جلد سوم
(27) مقالات حصن المسلم جلد دوم
(28) مقالات حصن المسلم جلد سوم
(29) مقالات حصن المسلم جلدچھارم
(30) مقالات حصن المسلم جلد پنجم
(31) مقالات حصن المسلم جلد ششم
(32) مقالات حصن المسلم جلدهفتم
(33) مقالات حصن المسلم جلد ہشتم
(34) بے قرار دل کا قرار
(35) گھر کا ماحول پرسکون اور خوشگوار کیسے بنائیں؟
(36) گناہوں سے کیسے بچیں؟
(37) محبت، دیوالی اور ویلنٹائن
(38) بزنس سے پہلے جلد اول
(39)

نوٹ : یہ کتاب Islamfort ویب سائٹ پر موجود مضامین سے انتخاب کر کے تیار کیا گیا ہے۔

(1) اسلام میں گردشِ دولت

فضیلۃالشیخ سید ابو بکر غزنوی رحمہ اللہ

تاریخ گواہ ہے جب بھی معاشرے میں نظمِ معیشت بگڑتا ہے اور دولت چند افراد کے ہاتھوں میں سمٹ آتی ہے، اس معاشرے کے لئے سب سے اہم مسئلہ یہ ہو جاتا ہے کہ زندگی کی ضروریات کیسے میسر آئیں، روٹی کہاں سے کھائیں اور تن ڈھانپنے کو کپڑا کہاں سے لائیں؟ یہ بات ہمیں تسلیم کر لینی چاہیے کہ افلاس انسان کی روحانی اور اخلاقی اقدار کو برباد کر دیتا ہے،

وہ شخص جس کے پاس پیٹ بھرنے کیلئے روٹی نہ ہو اور تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا نہ ہو وہ اس بات پر کان نہیں دھر سکتا کہ زندگی کا مقصد اللہ کی محبت اور اور اس کی عبادت ہے۔ شیخ شیراز نے بجا کہا تھا:

چناں قحط سالے شُد اندر دمشق

کہ یاراں فراموش کردند عشق

ایک سال دمشق کے اندر ایسا قحط پڑا کہ یار لوگ عشق کرنا ہی بُھول گئے۔

پاکستان میں بھی دولت چند ہاتھوں میں سمٹ آئی اور معاشرہ بھوک اور ننگ کے ہاتھوں کراہنے لگا۔ عوام کی زبانوں پر ایک ہی سوال ہے:

ہمارے معاشی مسائل کا حل تمہارے پاس کیا ہے؟" اس سوال نے اس شدت کے ساتھ سر اٹھایا ہے کہ آپ اسے ٹال نہیں سکتے۔ اس کا جواب دیجئے اور واضح اور متعین جواب دیجئے۔

اسلام ایک مکمل ضابطہء حیات ہے، وہ عبادت بھی ہے، روحانیت بھی، وہ تدبیر منزل بھی ہے اور اصول تمدن بھی، وہ ہماری سیاست بھی ہے اور ہماری معیشت بھی ہے۔ آئیے ہم کتاب وسنّت کی روشنی میں اپنے معاشی مسائل کا حل تلاش کریں۔

سرمایہ کا چند ہاتھوں میں سمٹ آنا بدترین اور سنگین جرم ہے:

یہ بات تو بالکل صاف اور واضح ہے کہ معاشرے میں دولت کا چند ہاتھوں میں سمٹ آنا، اسلامی نقطہء نظر سے ایک بدترین اور سنگین جرم ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ

فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ﴾

التوبة:34-35

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بے شک بہت سے عالم اور درویش یقیناً لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، تو انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری دے دے۔[34] جس دن اسے جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس کے ساتھ ان کی پیشانیوں اور ان کے پہلوؤں اور ان کی پشتوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے جو تم نے اپنے لیے خزانہ بنایا تھا، سو چکھو جو تم خزانہ بنایا کرتے تھے۔[35]

اسلام یہ چاہتا ہے کہ سرمایہ معاشرے میں یوں گردش کرے جیسے خون رگوں میں گردش کرتا ہے، وہ نظام جس میں چند افراد بے زمام اور بے مہار ہو کر کھیل کھیلتے ہوں اور معاشرے کا خون چوستے ہوں اسلام اسے باطل نظام قرار دیتا ہے، وہ ہمیں خبردار کرتا ہے کہ:

﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ﴾

الحشر:07

ترجمہ:" ایسا نہ ہو کہ دولت صرف سرمایاداروں ہی میں گردش کرتی رہے"۔

اکتناز کی بدترین صورت سود کا کاروبار ہے جس نے ساری اجتماعی معیشت کی باگ ڈور چند خود غرض سرمایاداروں کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ نے بجا کہا تھا:

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جُوا ہے
سُود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ سیاست
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
ذخیرہ اندوزی حرام ہے

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وَالْمُحْتَكِرُ مَلْعُونٌ

احتکار کرنے والے پر اللہ کی پھٹکار ہے۔

شریعت کی بولی میں احتکار سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص بعض اجناس کو بہت بڑی مقدار میں اس لئے خریدے کہ بازار میں وہ اجناس کمیاب یا نایاب ہو جائیں اور لوگ مجبوراً اسی کی طرف رجوع کریں۔ وہ من مانی قیمت ٹھہرائے، لوگوں کو وہی نرخ قبول کرنا پڑے۔

ایسے شخص پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: " اللہ تعالیٰ کی پھٹکار ہو"۔

اصُول معاشیات قرآنِ کریم کی روشنی میں

قرآن مجید نے نظمِ معیشت کو متوازن کرنے کیلئے چند اصول انسان کو بخشے، قرآن مجید اس بات پر زور دیتا ہے کہ: ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ البقرۃ: 29

"وہی ہے جس نے تمہارے لئے یہ سب کچھ پیدا کیا جو روئے زمین پر ہے"۔

اور سورہ حم سجدہ میں فرمایا: ﴿وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ﴾ فصلت: 10

"چار معین مدتوں میں روئے زمین پر مختلف غذاؤں کو اندازے سے پیدا کیا، تمام ضرورت مندوں کا ان غذاؤں پر برابر حق ہے"۔

اور سورۃ النحل میں فرمایا: ﴿وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ ۚ أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾ النحل: 71

"اور اللہ نے تم کو رزق میں ایک دوسرے پر برتری عطا کی ہے، پھر جن کو برتری عطا کی گئی ہے وہ اپنا رزق اپنے زیر دستوں کو نہیں لوٹاتے ہیں کہ وہ اس میں برابر کے شریک ہو جائیں۔ پھر کیا یہ اللہ کی نعمتوں کے صریحاً منکر نہیں ہو رہے ہیں؟"

ان آیتوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن مجید اس بات پر زور دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے رزق کی تمام انواع واقسام پیدا کی ہیں، وہی ہر فرد کی کفالت کرنے والا ہے اور اللہ کی مخلوق کو اس کی پیدا کی ہوئی غذاؤں پر برابر کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: ﴿أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ﴾ ترجمہ: "یہ جو تم کھیتی باڑی کرتے ہو کیا تم نے اس پر نظر ڈالی ہے؟ کیا تم انہیں اگاتے ہو یا ان کے اگانے والے ہم ہیں؟" یہ ہوائیں کون چلاتا ہے؟ کون ہے جو مینہ برساتا ہے؟ یہ کس نے دھوپ پیدا کی ہے؟ جس کی کرنوں سے تمہاری

فصل پکتی ہے، اگر یہ سب کچھ ہم ہی نے پیدا کیا ہے تو اسے ہماری خاطر معاشرے پر خرچ کرنے سے دریغ کیوں کرتے ہو؟

گردش دولت کا نظام

دولت کو گردش میں لانے کے لئے اور معاشرے کے تمام افراد میں پھیلانے کے لئے اسلام نے یہ ترغیب دی کہ: ﴿أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ﴾ البقرۃ: 267

ترجمہ: " اور جو کچھ تم نے کمایا ہے اور جو کچھ زمین سے ہم نے تمہارے لئے نکالا اس کا بہترین حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور ردّی چیزیں چھانٹ چھانٹ کر اللہ کی راہ میں نہ دیا کرو"۔

زکوٰۃ و عشر

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی اور زکوٰۃ کو واجب ٹھہرایا اور مالداروں سے اڑھائی فیصد جبراً وصول کرنے کا حکم دیا اور یہ اسلام میں کروڑوں کی رقم صرف مساکین کے لئے روزگار فراہم کرنے کے لئے وقف کر دی جاتی ہے۔

قانون وراثت

دولت کو گردش میں لانے کے لئے حکم دیا کہ ہر شخص کی وفات پر اس کے مال اور اس کی زمین کو اس کے قریب اور دور کے رشتہ داروں میں بانٹ دیا جائے۔ جائیداد کے حصّے بخرے کر دیئے جائیں تاکہ دولت مرکوز نہ ہو، اولاد اکبر کی جانشینی کا قانون Law of Primogeniture اسلام نے اسی لئے ناجائز قرار دیا کہ اس سے دولت مرکوز ہو جاتی ہے۔

اس مقصد کے پیش نظر کہ نظامِ معیشت غیر متوازن نہ ہو، حکم ہوا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ﴾ النساء: 29

ترجمہ: " اے ایمان والو ایک دوسرے کے اموال ناجائز طریقوں سے نہ کھایا کرو"۔

ہر وہ بات جس سے نظمِ معیشت بگڑ جانے کا خدشہ تھا اور اس کے غیر متوازن ہونے کا امکان تھا، ناجائز قرار دی گئی، سود خوری، رشوت ستانی، ذخیرہ اندوزی، سٹّہ (speculation) اور تجارتی قمار بازی کو حرام ٹھہرا دیا گیا۔

یوں اسلام زکوٰۃ عشر اور قانون وراثت کو نافذ کر کے اور سود خوری، ذخیرہ اندوزی اور تجارتی قمار بازی کو حرام ٹھہرا کر ایک متوازن نظام معیشت قائم کرتا ہے۔

یہ سمجھنا صریحاً غلط ہے کہ زکوٰۃ اور عشر ادا کر دینے کے بعد معاشرہ کا کوئی حق باقی نہیں رہتا، ترمذی شریف کی حدیث ہے کہ: أَنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ یقیناً مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی معاشرہ کا حق ہے"۔

قرآن مجید ہر قانون کی ارتقائی کڑیوں کو محفوظ کرتا ہے تاکہ جب بھی کسی معاشرے میں اسلامی قوانین کو نافذ کیا جائے، وہ انہی ارتقائی منزلوں سے گذرا کریں۔ جیسے شراب کی حرمت کا قانون جن مرحلوں سے گزرا، قرآن مجید نے ان تمام مرحلوں کو محفوظ کیا، حرمت شراب کا پہلا مرحلہ یہ تھا:

﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ﴾ النساء: 43

ترجمہ: " نماز کے قریب مت جاؤ جب تم نشے کی حالت میں ہو"۔

اور حرمت شراب کی آخری ارتقائی منزل کا ذکر اس آیت میں کیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ﴾

المائدۃ: 90

ترجمہ: " اے ایمان والو! شراب، جوا، بت اور پانسے شیطانی عمل کی نجاست ہے تم اس سے دور ہٹ جاؤ"۔

اسی طرح اسلام کے نظام معیشت کی آخری ارتقائی منزل قرآن نے یوں بیان کی:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ البقرۃ: 219

"یہ لوگ جن کے پاس سرمایہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر پوچھتے ہیں کہ ہمیں کس حد تک خرچ کرنا ہوگا۔آپ ان سے کہہ دیجئے کہ تمہاری ضرورت سے جو کچھ زیادہ ہے،وہ تمہیں معاشرے پر خرچ کر دینا چاہیے"۔

حکیم الامت اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اسی آیت کی طرف اشارہ کیا تھا:

جو حرفِ قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اِس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

یہ جو بات میں کہہ رہا ہوں مصر کے بہت سے عالموں نے بھی یہ بات کہی ہے۔ میں دانستہ طور پر ایک ثقہ عالم کا حوالہ اور کسی تجدد پسند کا حوالہ نہیں دیتا کہ آپ کے نزدیک ان کی ثقاہت محل نظر ہو۔ میری مراد مولانا محمود حسن رحمہ اللہ سے ہے۔ ایضاح الادلۃ میں ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ البقرۃ: 29 کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جملہ اشیاء بہ دلیل فرمان واجب الاذعان ﴿خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ تمام بنی آدم کی مملوک معلوم ہوتی ہیں، یعنی غرض الہیٰ تمام اشیاء کی پیدائش سے رفع حوائج جملہ ناس (انسان) ہے اور کوئی شے فی حدّ ذاتہ کسی کی مملوک خاص نہیں، بلکہ ہر شے اصل خلقت میں جملہ ناس میں مشترک ہے اور من وجہ سب کی مملوک ہے۔ ہاں بوجہ رفع نزاع و حصولِ انتفاع قبضہ کو علت ملک مقرر کیا گیا اور جب تک کسی شے پر ایک شخص کا قبضہ تامہ مستقلہ باقی رہے، اس وقت تک کوئی اور اس میں دست درازی نہیں کر سکتا۔

ہاں خود مالک و قابض کو چاہیے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے بلکہ اس کو اوروں کے حوالے کر دے کیونکہ باعتبار اصل اوروں کے حقوق اس کے ساتھ متعلق ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مال کثیر حاجت سے بالکل زائد جمع رکھنا بہتر نہیں، اگر زکوٰۃ بھی ادا کر دی جائے۔ انبیاء علیہم السلام اور صلحاء رحمہم اللہ اس سے نہایت مجتنب رہے۔ چنانچہ احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے بلکہ بعض صحابہ و تابعین نے حاجت سے زائد رکھنے کو حرام ہی فرمادیا۔] 1[

قُلِ الْعَفْوَ کا مفہوم سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ والی حدیث وضاحت سے متعین کرتی ہے۔ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "مَنْ كَانَ مَعَهُ فَضْلُ ظَهْرٍ فَلْيَعُدْ بِهِ عَلَى مَنْ لَا ظَهْرَ لَهُ، وَمَنْ كَانَ لَهُ فَضْلٌ مِنْ زَادٍ فَلْيَعُدْ بِهِ عَلَى مَنْ لَا زَادَ لَهُ، قَالَ: فَذَكَرَ مِنْ أَصْنَافِ الْمَالِ مَا ذَكَرَ، حَتَّى رَأَيْنَا أَنَّهُ لَا حَقَّ لِأَحَدٍ مِنَّا فِي فَضْلٍ

صحیح مسلم، کتاب اللقطۃ، باب استحباب المؤساۃ بفضول المال المحلی) 282/4(

"سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے پاس فالتو سواری ہو وہ اسے لوٹا دے، جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس کے پاس ضرورت سے زائد غذا ہے وہ ان لوگوں کے حوالے کر دے، جن کے پاس غذا نہیں ہے"۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک جنس اور مال کی ایک ایک قسم کا جدا جدا ذکر کیا حتیٰ کہ ہماری یہ رائے ہو گئی کہ فالتو مال پر ہمارا کوئی حق نہیں رہا۔"

یہ " رأینا " جو یہاں ہے اس کے یہ معنی نہ خیال لیجئے کہ " ہم نے یہ خیال کیا"۔ یہ میں عربی کے طالب علموں سے کہہ رہا ہوں۔ فقہ کی بولی میں ہم " رأینا " اس وقت کہتے ہیں جب ہم کوئی فتویٰ دے رہے ہوں اور اپنی علمی رائے کا اظہار کر رہے ہوں پس یہ جو ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حتی رأینا أنہ لا حق لأحد منا فی الفضل تو اس کا معنی یہ ہوا کہ " حتیٰ کہ ہماری فقہی رائے یہ ہو گئی کہ فالتو مال پر ہمارا کوئی حق نہیں"۔

کیا اسلامی حکومت جبراً چھین سکتی ہے؟

اس بارے میں ایک سوال بہت اہم ہے جو ہمارے سامنے آتا ہے، اگر دولت چند افراد کے ہاتھوں میں یوں سمٹ آئی ہو کہ خدشہ ہو کہ یہ اصول معاشیات جو ہم نے بیان کئے ہیں، ان کو تدریجی اور ارتقائی طور پر نافذ کرنے سے پہلے ہی یہ معاشرہ دم توڑ دے گا، اور کیفیت یہ ہو کہ:

"تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود" کہ جب تک عراق سے تریاق لایا جائے گا اتنی دیر میں مریض مر جائے گا، تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟

امام ابن حزم رحمہ اللہ نے جو ایک عظیم انقلابی مفکر ہیں، " المحلّٰی" کی چھٹی جلد میں بہت فاضلانہ بحث اس پر کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ کتاب و سنت کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر نظم معیشت یکسر غیر متوازن ہو گیا ہو اور خدشہ ہو کہ تدریجی اور ارتقائی طور پر اصول معاشیات کے نفاذ سے پہلے ہی معاشرہ دم توڑ دے گا، تو اسلامی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سرمایہ داروں سے پیسہ اور غلہ جبراً وصول کرے:

اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دیکھو قرآن مجید بار بار کہتا ہے کہ سرمایہ داروں کی دولت میں مساکین کا " حق" ہے قرآن مجید لفظ " حق" بار بار استعمال کرتا ہے:

﴿وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾ الذاریات: 19

اور سورہ اسراء میں ہے: ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ﴾ الإسراء: 26

وہ فرماتے ہیں کہ اس میں احسان کا کوئی سوال نہیں اور جن کی طرف مال لوٹایا جارہا ہے، وہ سرمایہ داروں کے رہین منت نہیں۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ " المحلّی" کی چھٹی جلد میں یوں رقم طراز ہیں:

"اگر ارباب ثروت ایسے عادلانہ معاشی نظام کو قبول نہ کریں، تو اسلامی اسٹیٹ کا فرض ہے کہ اسلام کے اجتماعی معاشی نظام کے مطابق ارباب ثروت کو قانوناً مجبور کرے اور اگر ملی خزانے کا میزانیہ کافی نہ ہو تو محروم المعیشت انسانوں کو سنبھالہ دینے کیلئے صنعت کاروں اور جاگیرداروں سے پیسہ اور غلہ جبراً حاصل کر کے حق معیشت کی مساوات بروئے کار لائے، خواہ اہل دولت مالیانہ اور سرکاری واجبات ادا کر چکے ہوں۔][2]

سیدنا ابو عبیدۃ بن جراح رضی اللہ عنہ اور تین سو جلیل قدر صحابہ رضوان اللہ علیہم نے باوثوق ذرائع سے بیان کیا ہے کہ ایک سال غلّہ کا قحط ہوا سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے ہم سب کو حکم دیا کہ ہم سب اپنا غلہ اسٹاک کرنے کے مرکزوں میں اکٹھا کریں، پھر ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ ان مراکز میں سے خود ہر ایک فرد کو مساوی طور پر خوراک دیتے رہے۔ اس کے بعد امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فَهَذَا إِجْمَاعٍ مَقْطُوعٌ بِهِ مِنْ الصَّحَابَةِ لَا مُخَالِفَ لَهُمْ مِنْهُمْ اس پر صحابہ کرام کا قطعی اجماع ہے، ان میں سے کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے"۔

یحیٰ بن آدم رحمہ اللہ جو ایک جلیل القدر محدث تھے، نے زراعت کے موضوع پر اپنی کتاب "الخراج" میں لکھا ہے:

عن عبد الله ابن أبي بكر قال جاء بلال بن الحارث المزني رضي الله عنه إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فاستقطعه أرضاً فاقطعها له طويلة عريضة فلما ولي عمر رضي الله عنه قال له يا بلال إنك استقطعت رسول الله صلى الله عليه وسلم أرضاً طويلة وعريضة قطعها لك وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يكن يمنع شيئاً فيسأله وأنت لا تطيق ما في يديك فقال أجل! فانظر ما قويت منها فأمسكه ما لم تطق وما لم تقو عليه فارفعه إلينا نقسمه بين المسلمين فقال لا أفعل والله أقطعنيه رسول الله فقال عمر والله لتفعلن فأخذ منه ما عجز عن عمارته فقسمه بين المسلمين

"سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فرزند سیدنا عبد اللہ رضی اللہ عنہ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب صحابی اور کفار مکہ کی سازشوں کی اطلاع دینے والے فداکار مسلمان، جنگ مکہ سے لے کر طائف کے لوگوں تک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش بدوش لڑنے والے تھے۔ روایت کرتے ہیں کہ بلال رضی اللہ عنہ بن حارث

المزنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زمین کا ٹکڑا مانگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لمبا چوڑا رقبہ عطا فرمادیا، جب سیدنا عمر رضی اللہ خلیفہ ہوئے تو بلال رضی اللہ عنہ سے کہا :بلال رضی اللہ عنہ! تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زمین کا ایک لمبا چوڑا قطعہ مانگا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمادیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو یہ عالم تھا کہ مانگنے والے کی کسی بات کو رد نہ کرتے تھے۔ بلال رضی اللہ عنہ! زمین کی جو مقدار تم نے حاصل کی ہے وہ تمہاری بساط اور قوت کاشت سے زیادہ نہیں ہے؟" بلال رضی اللہ عنہ: ہاں یہ ٹھیک ہے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دیکھو تم جتنی زمین آباد کر سکتے ہو اسے اپنے پاس رہنے دو اور جو تمہاری قوت کاشت سے زیادہ ہے، وہ ہمارے حوالے کر دو تاکہ ہم اسے مسلمانوں میں بانٹ دیں۔ بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں ہر گز واپس نہیں کرونگا۔ اللہ کی قسم یہ قطعہ زمین تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بخشا تھا۔ میں ایسا ہر گز نہیں کروں گا۔ عمر بن الخطاب نے فرمایا: اللہ کی قسم تم کو ایسا کرنا پڑے گا۔ پس زمین کا وہ حصہ جسے آباد کرنے سے بلال رضی اللہ عنہ قاصر رہے تھے سیدنا عمر رضی اللہ نے اسے چھین لیا اور مسلمانوں میں اسے بانٹ دیا۔] ."3[

"میں یہ کہتا ہوں کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بخشی ہوئی زمین ملی مفاد کی خاطر چھینی جا سکتی ہے تو وہ جاگیریں جو مسلمانوں پر گولیاں برسانے کے صلے میں دی گئی تھیں، وہ جاگیریں جو مسلمانوں کا لہو بہانے میں عطا کی گئی تھیں، وہ جاگیریں جو ملک و ملت کے ساتھ غداری کے صلے میں بخشی گئی تھیں، کیوں نہیں چھینی جا سکتیں؟

میں یہ واضح طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ اس ملک میں غریب اور مزدور کی حمایت کا حق ادا نہیں کیا گیا۔ میں مجمع الزوائد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پڑھ رہا تھا اور سر دُھن رہا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **خير الكاسب العامل إذا نصح**

کسب معاش کرنے والوں میں سب سے بہتر اور معزز مزدور ہے، جب وہ اخلاص کے ساتھ کام کرتا ہے"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدور کو معاشرے کا معزز ترین فرد قرار دیا ہے۔

ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ ہم نے اس معاشرے میں مزدور کی توہین و تذلیل کی ہے اس کا دامن، اس کا گریبان ہماری دست درازیوں سے گلہ مند ہے۔ اس ملک میں عین اس وقت جب کہ مزدور پٹ رہا تھا اور زخموں سے کراہ رہا تھا، ہم نے اس کے زخموں پر نمک چھڑکا، ہم نے اس سے کہا اور ٹھوکے دے دے کر کہا کہ دیکھو یہ

ٹھیک ہے تم کہتے ہو سرمایہ دار پر تمہارے حقوق ہیں، مگر یہ ہر گز نہ بھولنا کہ تم پر بھی سرمایہ دار کے حقوق ہیں۔ ہم نے اس سے یہ بات عین اس وقت کہی جب کہ وہ سسکیاں لے لے کر دم توڑ رہا تھا۔ ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد ہر بات کا ایک محل ہوتا ہے، میں ایک موٹی سی مثال دیتا ہوں، دو بھائیوں کی آپس میں لڑائی ہو جائے، آپ دیکھیں کہ ایک موٹا مسٹنڈا ہے اور دوسرا جو کمزور اور نحیف و نزار ہے، مجروح ہے، پٹ رہا ہے اور نزع کی حالت میں پنڈلی پر پنڈلی پٹک رہا ہے، اگر اس وقت کوئی آکر اس دم توڑنے والے کو یہ کہے کہ یہ ٹھیک ہے گو تم مر رہے ہو اور دم توڑ رہے ہو، مگر تم یہ نہ بھولنا کہ اس ہٹے کٹے بھائی کے بھی تم پر حقوق ہیں، یہ بات اس ملک میں کہی گئی۔ عین اس وقت جب کہ غریب اور مزدور کے پیٹ میں بھوک سے قراقر اٹھ رہا تھا، ہم نے اس سے یہ کہا کہ دیکھو تمہاری زندگی کا مقصد پیٹ نہیں، دل ہے۔ وہ بھوکا تھا، وہ دل کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا، عین اس وقت جب کہ وہ بھوک سے پیچ و تاب کھا رہا تھا ہم اللہ سبحانہ وتعالی کی محبت کے گیت اس کو سنانے لگے، وہ بھوک سے نڈھال تھا، وہ محبت کے گیتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا تھا، وہ ہم سے روٹی مانگتا رہا، ہم اسے محبت کے گیت سناتے رہے، نتیجہ کیا ہوا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سرخ جھنڈیاں لے کر چوراہوں میں ناچنے لگا، وہ مذہب سے برگشتہ ہوا، وہ علماء سے برگشتہ ہوا حتی کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالی سے برگشتہ ہوا، وہ سرخ جھنڈیاں لے کر چوراہوں میں ناچ رہا تھا، ہاں وہ غیروں سے اپنی وابستگی کا اعلان کر رہا تھا، میں نے جو اسے دیکھا، تو میرے ذہن کو کوئی جھٹکا نہ لگا، اس لئے کہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا تھا کہ: کاد الفقر أن یکون کفرا مفلسی انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے۔][4]

دیکھئے معاشی مسائل کا حل واضح اور متعین پیش کیجئے۔ مزدور اس ملک میں صدیوں سے مامتا سے محروم ہے، اس کے زخموں پر نمک مت چھڑکیں، اس کو مامتا بخشیں، اس سے جھگڑا نہ کریں، اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک میں سوشلزم نہ آئے، تو اس کا یہ علاج تو نہ تھا۔ منبر و محراب سے غلط آوازیں اٹھتی رہیں، آپ یقین کیجئے کہ اگر مزدور اور غریب کے معاشی مسائل کا واضح اور متعین حل اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پیش نہ کیا گیا اور اگر مزدور کا غم کھانے میں ہم سوشلسٹوں سے آگے نہ نکل گئے (جیسا کہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا تقاضہ ہے) تو یہ عارضی بند جو سوشلزم کے امنڈتے ہوئے سیلاب پر باندھا گیا ہے، ٹوٹ جائے گا اور اس کی موجیں جو ابھی تک پایاب ہیں، ہمارے سروں سے گذر جائیں گی۔

کیپٹلزم، سوشلزم اور اسلام

اسلام ہمارے تمام دکھوں کا مداوا ہے، وہ ہر درد کا درماں ہے، وہی اعتدال کی راہ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ اس میں چند افراد جو بد دیانتی، رشوت ستانی اور ذخیرہ اندوزی سے دولت سمیٹ لیتے ہیں، وہ تمام معاشرے کے اوپر مسلط ہو جاتے ہیں اور ذہنی قابلیت رکھنے والے محنت کرنے والے، کاروبار کو کاوش سے چلانے والے سب ان چند سرمایہ داروں کے سامنے ہیچ ہو جاتے ہیں۔ اس نظام میں فرد (individual) بے زمام، بے مہار ہوتا ہے، وہ پورے معاشرے کا خون چوستا ہے۔

سوشلزم کیا ہے؟ یہ اسی سرمایہ دارانہ نظام کا ردعمل ہے۔ سوشلسٹوں نے یہ سمجھا کہ یہ فرد (individual) ہی تمام فساد کی جڑ ہے، اس کی تقریر پر پابندی لگادو، اس کی تحریر پر قدغن لگادو، اس کی رائے پر قدغن لگادو، اس کی اقتصادی آزادی اس سے چھین لو، اور تمام ذرائع پیداور (means of production) کو قومی ملکیت میں دے دیا جائے۔ " نیشنلائزیشن آف پروڈکشن" یہ ترکیب بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے، لیکن ایک طالب علم کے ذہن میں فوراً یہ سوال ابھرتا ہے کہ قومی ملکیت میں دے دینے سے کیا مراد ہے؟ کیا قوم کا ہر فرد اس پر قبضہ واختیار رکھتا ہے؟ یہ تو ناقابل عمل ہے۔ تحقیق کی جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ سوشلسٹ حکمران پارٹی کے چند مخصوص افراد کے تصرف واختیار میں تمام ملک کے ذرائع پیداوار دے دئے جاتے ہیں، پس ملک کے وہی چند افراد جن کے ہاتھوں میں فوجی، سیاسی اور قانونی طاقت سمٹی ہوئی ہے، ملک کے تمام ذرائع پیداوار بھی انہی کے قبضہ واختیار میں چلے جاتے ہیں، یوں ملک کی تمام طاقتیں چند ہاتھ سمیٹ لیتے ہیں، تمام معاشی، سیاسی اور فوجی قوتوں کا یہ ارتکاز سرمایہ دارانہ نظام کی انتہائی بھیانک صورت ہے، جو ایک خطرناک آمریت کو جنم دیتی ہے۔

بھائیوں اور بزرگوں! مقصد تو یہ تھا کہ ڈی سنٹرالائزیشن ہو، دولت اور قوت بکھرے۔ کیپٹلزم کا جو ردعمل ہوا، اس میں تو پھر تمام قوتیں سمٹ کر چند ہاتھوں میں آگئیں اور ایسا شدید ارتکاز ہوا کہ اس نے انتہائی بھیانک آمریت کو جنم دیا۔ یہ دونوں افراط وتفریط کی راہیں ہیں۔ یہ دونوں نظام انسان کے ذہن کی پیداوار ہیں، وہ انسان جو جذبات کا بندہ اور خواہشات کا پجاری ہے، اسلام شخصی ملکیت اور قومی ملکیت میں ایک حسین امتزاج پیدا کرتا ہے، وہ فرد کے حقوق واختیارات اور حکومت کے حقوق واختیارات میں ایک توازن قائم کرتا ہے۔

شخصی ملکیت

بعض ہمارے بھائی جو اشتراکی نظام سے متاثر ہیں، یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام بھی انفرادی ملکیت کو ناجائز قرار دیتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو یہ صنعتی، معاشی، انتظامی وسائل میسر ہوتے، جو اس دور کی حکومتوں کو حاصل ہیں، تو انفرادی ملکیت کو ختم کرنے کے لئے انہیں کوئی تامل نہ ہوتا۔ اس بات کے لئے ان کے پاس کوئی سند یا دلیل نہیں ہے۔ اس بحث میں بھی کچھ دَھرا بندی کی بات پیدا ہو چلی ہے۔ کوئی پیغمبر اس روئے زمین پر ایسا نہیں گذرا، جس نے انسان کو کسی اقتصادی آزادی سے محروم کیا ہو، کوئی صحیفہ آسمانی ایسا نہیں، جس میں انسان کو اس کی شخصی آزادی سے محروم کیا ہو، پھر وہ سید الاولین و سید الآخرین، وہ سرورِ دُنیا و دین صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت کا ایک اہم مقصد یہ بیان کیا گیا ہے ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ الأعراف:157

یعنی وہ جو انسانوں کو بے جا بندھنوں اور غلامیوں سے آزاد کرانے کے لئے آیا تھا، یہ کیوں کر ممکن تھا کہ انسان کو اس کی اقتصادی آزادی سے محروم کر دیتا اور تمام معاشرے کے افراد کو ریاست کا بے دست و پا غلام بنا دیتا۔ اسلام انفرادی آزادی کو شخصی ارتقاء کے لئے ناگزیر سمجھتا ہے، وہ فرد کی آزادی پر اس وقت قدغن لگاتا ہے، جب مفادِ عامہ کو اس سے دھچکا لگے اور معاشرے کے اجتماعی حقوق کو صدمہ پہنچے۔

ذرائع پیداور کو قومی ملکیت میں لینا

قرآن و حدیث میں کسی صنعت، تجارت یا ذریعہ پیداور کو قومی ملکیت میں لینے کے خلاف ایک حرف بھی میری نظر سے نہیں گذرا۔ اگر مفاد عامہ اور ملی مصلحتوں کے پیش نظر اسلامی حکومت کسی صنعت یا تجارت یا ذریعہ پیداور کو قومی ملکیت میں لینا چاہے، تو وہ ایسا کرنے کی مجاز ہے۔ اگر کوئی صنعت یا تجارت چند افراد کے ہاتھوں میں ہو اور اس کی شخصی ملکیت اجتماعی مفاد کے لئے نقصان دہ ہو تو حکومت ان افراد کو معاوضہ دے کر وہ کاروبار اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے لیکن اسلام اس بات کو ایک اُصول کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا کہ دولت کی پیداوار کے تمام ذرائع حکومت میں یوں چلے جائیں کہ ملک بھر کی تمام صنعتوں اور تجارت کی منڈیوں پر وہ تنہا قابض ہو اور حکومت تمام اراضی کی واحد مالک ہو۔

پس اسلام شخصی اور اجتماعی ملکیت میں ایک توازن قائم کرتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت یہ دونوں باطل ہیں علامہ اقبال رحمہ اللہ نے بجا کہا تھا۔

ہر دو را جاں ناصبُور و ناشکیب

ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب

دونوں کی روحیں روحانی سکون سے ناآشنا، دونوں اللہ سے غافل، دونوں اللہ سے جاہل، دونوں اپنے ذاتی اغراض کے لئے ہر فریب، دھاندلی بد دیانتی، لوٹ کھسوٹ، مار دھاڑ اور قتل وغارت کو روا رکھنے والے اور اپنی ادنیٰ سی خواہش کے لئے ہزاروں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دینے والے:

غرق دیدم ہر دو را در آب و گل ہر دو را تن روشن و تاریک دل

فرماتے ہیں:" میں نے سرمایہ دارانہ نظام کو بھی دیکھا اور اشتراکی نظام کو بھی جانچا، دونوں مادیت میں ڈوبے ہوئے، دونوں کا منتہائے نظریہ جہانِ آب و گل، دونوں بدن سنوارنے میں لگے ہیں، دونوں کے دلوں پر ظلمت کا سناٹا چھایا ہوا ہے"۔

اسلام اور اشتراکیت یکجا ہو سکتے ہیں؟

ایک اور سوال ہمارے بعض بھائیوں نے اٹھایا ہے، ہمارے جو بھائی اشتراکیت سے متاثر ہیں، کہتے ہیں: اسلام اور اشتراکیت کو یکجا کر دو، بات لمبی اور بحث طلب ہے۔ لیکن وقت کی قلت کے پیش نظر بات سمیٹتا ہوں۔ کارل مارکس کا" داس کیپٹل" جو کمیونزم کی بنیادی کتاب ہے، اگر اس کی پہلی جلد کے ابتدائی صفحات ہی آپ پڑھ ڈالیں، تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اشتراکیت کا فلسفہء زندگی "جدلیاتی مادیّت" کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے، میں اس فلسفہ کی تشریح اس وقت نہیں کر سکتا، صرف اتنا کہتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو فلسفہ کی ابجد ہوز سے بھی واقف ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ جدلیاتی مادیّت کے نظریے میں اللہ، رسول، وحی و تنزیل، حیات بعد الممات، روح ،ملائکہ اور دوسرے مابعد الطبیعاتی (Metaphysical Realities) حقائق کے تصور کی قطعاً گوئی گنجائش نہیں۔

کارل مارکس کا فلسفہ زندگی جدلیاتی مادیت پر مبنی ہے، اس کے فلسفہ تاریخ کی اساس بھی جدلیاتی مادیت ہی پر ہے، اس کا اقتصادی نظام بھی قطعی طور پر (Dialectical materialism) کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ کارل مارکس کے اقتصادی نظام میں حلال و حرام میں کوئی حد فاصل نہیں کھینچی گئی۔

پس آپ یقین کیجئے کہ اگر اس ملک میں سوشلزم آتا ہے تو ہماری اخلاقی اور روحانی قدروں کا برباد ہونا یقینی امر ہے ،اگر سوشلزم اس ملک میں آتا ہے تو ہماری اخلاقی و روحانی قدروں کا یقیناً وہی حال ہو گا جو سمرقند و بخارا میں ہوا، جو مشرقِ وسطی میں ہوا، ہم اس سے مختلف نتائج کی توقع اس ملک میں نہیں رکھتے ہیں۔ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے

کہ اسلام اور اشتراکیت کو یکجا کر دو تو یا تو دونوں کے مفہوم سے ناواقف ہے یا وہ لوگوں کی آنکھوں میں قصداً اور ارادتاً دھول جھونک رہا ہے، وہ فلسفہ زندگی جس کی بنیادوں پر ایک نظام قائم ہوتا ہے، آپ اس فلسفہ زندگی کو اس نظام سے کاٹ کر الگ نہیں پھینک سکتے۔

روٹی ہماری زندگی کا مقصد نہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے ہمیں نہایت متوازن اقتصادی اور سیاسی نظام بخشا ہے، لیکن مسلمان کی زندگی کا مقصد محض روٹی نہیں، میں نے یہ کہا تھا کہ جس وقت مزدور بھوکا ہو، وہ اللہ کی محبت اور عبادت کے گیتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا، اس کا پیٹ بھرنے کے بعد ہم اسے کہیں گے کہ دیکھو روٹی تمہاری زندگی کا مقصد تو نہیں ہے، مسلمان کی زندگی کا مقصد اللہ کی ذات اور اس کی صفات کی معرفت حاصل کرنا اور اس کی صفات سے خود کو متصف کرنا ہے اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اللہ کا قرب اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے کھپا دینا ہے، مسلمان کی رُوح ہر آن اور ہر لمحہ نغمہ سرا ہے۔

إِلَٰهِيْ أَنْتَ مَقْصُوْدِیْ وَرِضَاكَ مَطْلُوْبِی

انسان کی زندگی کا مقصد اس روئے زمین پر اللہ کی خلافت کا قائم کرنا ہے اور یہ معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی نظام جو اسلام نے ہمیں بخشا ہے، ان مقاصد کے حصول کے لئے محض وسائل اور ذرائع ہیں۔ میں علامہ صاحب رحمہ اللہ کے خط کا اقتباس آپ کو سناتا ہوں جو اخبار زمیندار میں 24 جون 1923ء کے شمارے میں چھپا تھا، میں اس وقت جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کی تائید و تصدیق اور تشریح و توضیح کے لئے حکیم الامت کی شہادت بس کرتی ہے۔

علامہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

میں مسلمان ہوں، میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل اور براہین پر مبنی ہے۔ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے، سرمایہ داری کی قوت جب اعتدال سے تجاوز کر جائے، تو دنیا کے لئے ایک قسم کی لعنت ہے، لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریقہ یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے، جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لئے قانون میراث اور زکوۃ وغیرہ تجویز کیا ہے، مغربی سرمایہ داری اور رُوسی دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے شریعتِ حقہ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک

جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے اور اس کے حصول کے لئے میرے عقیدے کی رو سے وہی راہ آسان اور قابلِ عمل ہے، جس کا انکشاف شارع علیہ السلام نے کیا ہے۔

اسلام سرمایہ داری قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا، بلکہ فطرت انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے برقرار رکھتا ہے اور ہمارے لئے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے، جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔

مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا

میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے، جب تک وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں، جس کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق اور تولید ہو اور مجھے یقین ہے کہ خود رُوسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے ناقص تجربے سے معلوم کر کے ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی، جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔

موجودہ صورت میں رُوسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو، ان کے طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی سیاسی اقتصادیات پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں، ان کے لئے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کی اقتصادی تعلیم پر نظرِ غائر ڈالیں، مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔[5] ساتھیو! یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ ہم ملی انفرادیت (National Individuality) کھو بیٹھے ہیں، ہم کبھی امریکہ اور کبھی روس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں، کبھی چین کو دیکھ کر ہماری رال ٹپکتی ہے۔ ہر دور کے لات و عزیٰ ہوتے ہیں۔ اور امریکہ اور روس اس دور کے لات و عزّیٰ ہیں: ﴿أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ﴾ النجم: 19-20

وقت کا سب سے عظیم انسان اور سب سے عظیم مسلمان وہ ہو گا جو ان تازہ خداؤں کی ذہنی غلامی سے انسانیت کو رہا کرے اور اسلام کے اقتصادی اور سیاسی نظام کو ایک مکمل اور باضابطہ صورت میں پورے یقین اور اذعان کے ساتھ کائنات کے سامنے پیش کرے اور اس کائنات میں اس نظام کو نافذ کرنے کے لئے ایسی مؤثر اور گرجدار آواز بلند کرے کہ یہ کائنات اس آواز سے گونج اٹھے۔

[1]ایضاح الأدلۃ:ص268

[2]المحلیٰ: 6/156 ایضاً 6/ 158

[3]کتاب الخراج:ص 93، کنزالعمال2/191، سنن البیہقی:6/138۔149 علامہ البانی رحمہ اللہ ارواء الغلیل میں فرماتے ہیں:" یہ حدیث بحیثیت مجموعی طرق سے ثابت ہے"۔

[4]مشکاۃ المصابیح: باب ماینہی،الفصل الثالث، تحقیق علامہ ناصر الدین البانی، شیخ البانی نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔شعب الإیمان للبیہقی: باب فی الحث علی ترک الغل والحسد۔

[5]زمیندار۔24جون1923ء

(2) سود حیلہ سازی

قرآن وسنت کے بیشتر دلائل سے سود کی حرمت روز روشن کی طرح واضح ہے۔ مگر کچھ لوگ اس دنیا کی خاطر آخرت کو داؤ پر لگاتے ہوئے اس حرمت سے بچنے کیلئے چور دروازے ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔چنانچہ وہ لوگ نصوص صحیحہ کی من مانی تاؤیلات کرکے سود کی مختلف صورتوں کو جائز قرار دینے کے درپے ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ تمام حیلے بہانے سود کو حرمت کے دائرہ سے خارج نہیں کرتے۔ سود کے اس دروازے کو بند کرنے کے لئے شریعت نے سود کھانے کے لیے بہانہ بازی اور حیلہ سازی کو حرام قرار دیا ہے، یہی نہیں بلکہ اسلام نے تو کسی بھی حرام شے کو بذریعہ حیلہ حلال کرنے کی سختی سے مذمت کی ہے اور اس طرح کے کسی بھی فعل کو حرام ٹھہرایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر گائے کی چربی حرام کی تھی مگر انہوں نے اسے حلال کرنے کیلئے یہ حیلہ رچا کہ چربی کو پگھلا کر بیچتے پھر اس کی قیمت استعمال کرتے۔چنانچہ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُودَ إِنَّ اللّٰهَ لَمَّا حَرَّمَ شُحُومَهَا جَمَلُوهُ ثُمَّ بَاعُوهُ فَأَكَلُوا ثَمَنَهُ**

صحيح بخاري: كتاب البيوع، باب البيع الميتة والأصنام، حديث رقم: 2236 صحيح مسلم: كتاب المساقاة، باب تحريم بيع الخمر والميتة الخنزير والأصنام، حديث رقم 4026

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ان یہودیوں کو غارت کرے جب اللہ تعالیٰ نے ان پر چربی کو حرام کیا تو انہوں نے اسے پگھلایا پھر بیچا اور اس کی قیمت کھائی۔

عصرِ حاضر میں سود کو بذریعہ حیلہ سازی حلال کرنے کی تفصیل سے قبل حیلہ کی تعریف اور اس کا مفہوم جاننا ضروری ہے۔

لغوی تعریف:

"حِيَلٌ" حیلہ کی جمع ہے، جس کے معنی " مہارت، چالاکی، باریکی سے کوئی کام انجام دینا"۔[1]

اصطلاحی تعریف:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " لغت میں باریک بینی سے کسی کام کو انجام دینا حیلہ کہلاتا ہے۔ جبکہ اصطلاح دین میں اس لفظ کا استعمال مہارت اور چالاکی کے ساتھ اپنے غرض ومقصد کو پالینے کے معنی میں کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ " اس فعل کا ارتکاب نہ کرنا جس کا ارتکاب یہودیوں نے کیا کہ اللہ تعالی کی حرام کردہ چیزوں کو حیلوں کے ذریعے حلال کرلو"۔[2]

فقہاء کے عرف میں حیلے کا معنی حرام کردہ امور کو تاویلات کے ذریعے حلال کرنے کی کوشش کیا جاتا ہے]. 3[

امام شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " شریعت کے کسی حکم کے ابطال کی غرض سے ایسا عمل انجام دینا جو بظاہر جائز معلوم ہو (اسے حیلہ کہا جاتا ہے)"[4]۔

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وَالْحِيَلُ كُلُّهَا غَيْرُ جَائِزَةٍ فِي شَيْءٍ مِنْ أُمُورِ الدِّينِ

المغني:63/4

دین کے کسی بھی معاملے میں کسی بھی قسم کا حیلہ حرام اور ناجائز ہے۔

پھر حیلے کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں" حیلہ یہ ہے کہ کوئی شخص جائز عقد و معاملے کو ظاہر کرے مگر پھر بطور دجل و فریب حرام معاہدہ و معاملہ کرے۔ یا (ایسا طریقہ استعمال کرے جس سے) حرام کو حلال کرنا، واجب کو ساقط کرنا، یا حق کو رد کرنا مقصود ہو"۔[5] گزشتہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ لغت کے اعتبار سے "حِیَل" کا لفظ انتہائی وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ کسی بھی معاملے میں ذھانت اور ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اسے صحیح طرح انجام دینا بھی حیلہ ہے لیکن فقہاء کے عرف میں اس کا مذموم معنی ہے بحثیت طوالت ہم اسی مذموم معنی کو ہی لے کر اپنے مضمون کو آگے بڑھائیں گے۔ ورنہ تمام اقسام کے حیلے اور ان کے احکام ذکر کرنے سے مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ وباللہ استمد العون والتوفیق۔

سود کو حلال کرنے کیلئے جو حیلے بہانے اختیار کئے جاتے ہیں ان میں سے چند ایک کی تفصیل ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

سودی معاملات میں تعاون کرنا

کچھ لوگ سودی معاملات میں تعاون کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم خود تو سود نہیں کھا رہے۔ جبکہ یہ ایک انتہائی بھونڈی دلیل ہے کیونکہ اسلام نے سود کا دروازہ بند کرنے کے لئے ایسا ضابطہ دیا ہے کہ سودی معاملے سے منسلک ہونے والا ہر شخص برابر کا گنہگار ہوتا ہے۔ جن میں سود لینے والا، دینے والا، سودی دستاویز لکھنے والا، سودی کاروبار میں واسطہ بننے والا، سب گناہ میں برابر ہیں۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں لَعَنَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آكِلَ الرِّبَا وَمُوكِلَهُ وَشَاهِدَيْهِ وَكَاتِبَهُ وَقَالَ هُمْ سواءٌ

صحیح مسلم: کتاب المساقاۃ، باب لعن آکل الربا و موکلہ، حدیث نمبر 1598

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے اور سود دینے والے اور اس کے لکھنے والے اور اس کے گواہ بننے والوں پر لعنت بھیجی ہے اور فرمایا کہ یہ سارے لوگ گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔

چنانچہ سود سے منسلک لوگوں کے ساتھ کسی قسم کا تعلق درست نہیں۔ اور اس کے جواز کے تمام حیلوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث نے باطل کر دیا ہے۔

بیع عینہ کو اختیار کرنا

اس کی صورت یہ ہے کہ احمد نامی شخص نے سلیم نامی شخص کو کوئی سامان خاص مدت کے لئے ادھار بیچا اور پھر اسی سامان کو احمد نے سلیم سے اس سے کم قیمت پر نقد خرید لیا علماء محققین نے اس قسم کے تجارتی معاملے کو سود قرار دیا ہے۔

اس بارے میں حدیث میں وعید بھی وارد ہوئی ہے، چنانچہ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے " جب تم سودی کاروبار کرنے لگو گے اور کھیتی باڑی پر راضی ہو جاؤ گے اور بیلوں کی دمیں پکڑ لو گے اور جہاد کو چھوڑ دو گے تو اللہ تعالی تم پر ذلت و پستی مسلط کر دے گا۔ اور اسے اس وقت تک تم سے دور نہیں کرے گا جب تک تم اپنے دین کی طرف واپس نہیں آ جاتے"۔[6]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " مفسرِ قرآن عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے فتوی پوچھا گیا کہ ایک آدمی نے حریز (مخصوص کھانہ) ایک مدت کے لئے ادھار بیچا، پھر اسے اس سے کم قیمت پر نقد خرید لیا تو انہوں نے جواباً کہا: "یہ ان معاملات میں سے ہے جسے اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے"۔[7]

چنانچہ یہ بیع جمہور علماء کے نزدیک حرام ہے۔

قرض دینے پر کسی بھی قسم کا نفع حاصل کرنا

سود کا دروازہ بند کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اس نفع کے حصول سے بھی منع فرمایا ہے جس سے شبہ پیدا ہو کہ یہ قرض دینے کے سبب حاصل ہوا ہے مثلاً: کوئی ہدیہ دینا،[8] یا قرض دینے والے کا کوئی کام مفت انجام دینا وغیرہ۔ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

إِذَا أَقْرَضَ أَحَدُكُمْ قَرْضًا فَأَهْدَى لَهُ أَوْ حَمَلَهُ عَلَى الدَّابَّةِ فَلَا يَرْكَبْهَا وَلَا يَقْبَلْهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ جَرَى بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ قَبْلَ ذَلِكَ

سنن ابن ماجہ: کتاب الصدقات، باب القرض، حدیث: 2432۔ یہ حدیث حسن ہے
"جب تم میں سے کوئی کسی کو قرض دے اس پر اسے ہدیہ دیا جائے یا سواری پر بٹھایا جائے تو وہ نہ بیٹھے اور نہ ہدیہ قبول کرے، ہاں! اگر قرض دینے سے پہلے ہی سے یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے تو کوئی حرج نہیں]" 9[

علماء کرام اس باب میں ایک اصولی قاعدہ ذکر کرتے ہیں:

كُلُّ قَرضٍ جَرَّ مَنفعةً فَهُوَ رِبًا

مجموع فتاوی و مقالات متنوعہ: ج25

ترجمہ: " جو قرض بھی نفع لائے وہ سود ہے"۔

اس بارے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے چند آثار ملاحظہ ہوں:

علامہ ابن سیرین رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ: " سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اُبَیّ بن کعب رضی اللہ عنہ کو دس ہزار درہم قرض دئے تو اُبَیّ بن کعب رضی اللہ عنہ نے اپنی زمین کا پھل انہیں بطور ہدیہ دیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے وہ ہدیہ قبول کرنے سے انکار کر دیا"۔ اس پر اُبَیّ بن کعب عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے:

'اہل مدینہ کو علم ہے کہ میرا پھل سب سے بہتر اور اچھا ہوتا ہے، اور ہمیں اس کی ضرورت بھی نہیں، تو آپ نے ہمارا ہدیہ کیوں قبول نہیں کیا؟ پھر جب انہوں نے دوبارہ دیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے اسے قبول کر لیا"۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ ہدیہ اس خیال سے رد کیا کہ کہیں یہ ہدیہ قرض کی بنا پر نہ ہو لیکن جب انہیں یہ یقین ہوا کہ یہ قرض کی بنا پر نہیں تو انہوں نے ہدیہ قبول کر لیا، اور مقروض شخص کا ہدیہ قبول کرنے سے باب میں یہ روایت فیصل ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ "نیل الاوطار" میں لکھتے ہیں:

"ماحصل یہ کہ اگر تو ہدیہ یا عاریہ قرض میں اور مہلت لینے اور وقت زیادہ کرنے کے لئے ہو، یا قرض خواہ کے لئے بطور رشوت ہو، یا قرض خواہ کو قرض کے بدلے نفع دینے کے لئے ہو تو یہ حرام ہے، کیونکہ یہ سود اور رشوت کی ایک قسم میں سے ہے۔

اور اگر مقروض اور قرض خواہ کی عادت میں سے ہو کہ وہ اس قرض سے قبل بھی ایک دوسرے کو ہدیہ دیتے ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں، اور اگر یہ اصلاً اس غرض سے نہیں تو ظاہر یہی ہے کہ اسے قبول نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ اس کی ممانعت مطلقاً ہے]" 10[

اگر آپ یہ کہیں کہ:

کیا ہدیہ رد کرنے کے علاوہ اور بھی کوئی حل ہے، اور سود میں واقع ہونے کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے : جی ہاں، اگر آپ اسے رد کرنے سے انکار کریں، اور ضرور قبول کرنا چاہیں تو پھر آپ کے سامنے دو راستے ہیں ان میں سے جو چاہیں اختیار کریں:

یا تو اسے اسی طرح کا ہدیہ دیں جو اس سے بھی بہتر اور اچھا ہو، یا پھر اسے قرض میں شامل کریں اور اس کی قیمت قرض میں سے کم کر کے ہدیہ کے مالک سے اتنا قرض کم واپس لیں۔ سعید بن منصور رحمہ اللہ اپنی سنن میں بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا:

میں نے بغیر کسی تعارف کے ایک شخص کو قرض دیا، تو اس نے مجھے کچھ ہدیہ دیا، ابن عمر رضی اللہ عنہما کہنے لگے :اسے اس کا ہدیہ واپس کر دو یا اسے قرض میں سے شامل کر لو"

اور سعید بن منصور ہی بیان کرتے ہیں کہ سالم بن ابی جعد نے بیان کیا: "ایک شخص ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہنے لگا:

"میں نے ایک مچھلی فروش کو بیس درھم قرض دئے تو اس نے مجھے ایک مچھلی ہدیہ دی، میں نے اس مچھلی کی قیمت لگوائی تو وہ تیرہ درھم تھی، اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمانے لگے :" اس سے سات درہم لے لو]"11[

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اگر کوئی کہنے والا کہے کہ جب یہ مسئلہ ہے ہی حرام تو اسے اصل پر کیوں نہیں لوٹایا جاتا (یعنی اسے بالکل منع ہی کیوں نہیں کر دیا جاتا)؟

تو ہم کہیں گے: اس لئے کہ ہو سکتا ہے اسے حیاء اور شرم روک دے اور ہدیہ رد کرنے سے ہدیہ دینے والے کا دل ٹوٹ جائے تو ہم کہتے ہیں:

اس سے لے لو اور اسے اتنا یا اس سے بھی زیادہ بدلہ دینے کی نیت کر لو، یا اس کی قیمت قرض میں شامل کر لو تو اس میں کوئی حرج نہیں کچھ کمی و بیشی کے ساتھ "۔[12]

اسی ضمن میں ایک اور ممنوعہ صورت کا ذکر کرتے چلیں کہ ایک شخص اگر کسی کو 10 ہزار روپے ادھار دے پھر ساتھ میں اپنا کوئی سامان جس کی قیمت 4 ہزار روپے ہو وہ 5 ہزار میں بیچ دے یہ بھی ناجائز ہے۔ کیونکہ یہ 1 ہزار روپے کا منافع صرف اور صرف اس کے قرض دینے کی وجہ سے لیا جا رہا ہے۔ اور قرض دار قرض کی مجبوری کی وجہ سے اس کا سامان خریدنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے چنانچہ یہ بھی ایسا قرض ہے جو منافع لاتا ہے لہٰذا شرعی اصول کی بنا پر یہ ناجائز ٹھہرا۔ اور اس کی حرمت پر سلف کا اجماع ہے۔] 13[

اس صورت میں ایک اور قباحت یہ ہے کہ اس میں ادھار اور خرید ایک ساتھ جمع ہو رہی ہیں جو کہ شرعاً ممنوع ہے۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "قرض کی شرط پر بیع حلال نہیں، اور نہ ہی ایک بیع میں دو شرطیں، اور نہ ہی اس میں منافع ہے جو مضمون نہ ہو اور جو تیرے پاس نہیں اس کی بیع نہیں "۔[14]

انتھی واللہ اعلم

دو خرید و فروخت کرنے والوں کا تیسرے شخص کو واسطہ بنانا:

اس کی صورت یہ ہے کے دو آدمی کسی سودی معاملہ پر اتفاق کر لیں اور دوکان کے مالک کہ پاس آئیں اور اس سے کسی قیمت پر کوئی سامان کا مطالبہ کریں اور وہ سامان ان میں سے ایک آدمی خرید لے پھر دوسرے کے ہاتھ خریدی ہوئی قیمت سے زیادہ قیمت پر ادھار پر اپنے ساتھی کو بیچ دے، اور جب اس کا ساتھی خرید چکے تو پھر دوکان کے مالک کو اس سے کم قیمت پر واپس کر دے اس طرح دوکان کے مالک نے دونوں کے درمیان واسطہ بن کر منافع کمایا اس صورت کو علماء نے "حیلہ ثلاثیہ" سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اس میں تین لوگ شریک ہوتے ہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں" بلاشبہ یہ صورت سود میں سے ہے "۔[28]

اس صورت میں ایک اور قباحت یہ بھی ہے کہ پہلے آدمی نے سامان اپنے قبضے میں لئے بغیر ہی بیچ ڈالا جو کہ ناجائز ہے جیسا کہ حدیث میں ذکر ہوا۔

مخابرۃ ومزابنہ ومحاقلۃ

یہ اقسام بھی ربا(سود) کے سد باب کے لئے حرام کی گئی ہیں۔المخابرۃ:یعنی کھیت کی پیداوار سے اپنے لئے کچھ حصہ خاص کر لینا۔مثلاً زمین کا مالک کسان سے کہے کہ زمین کے آخری حصہ میں جو کاشت کرو گے وہ تمھارا ہو گا تو یہاں ربا کا دروازہ کھل رہا ہے کیونکہ وہاں زراعت کا ہونا یا نا ہونا یقینی نہیں،ہاں اگر پوری زمین میں سے فیصد کے ساتھ تقسیم ہو کہ مکمل زراعت میں سے 5 فیصد تمہارا ہو گا تو یہ جائز ہے۔

مزابنہ سے مراد یہ ہے کہ مثلاً درخت میں لگی ہوئی کچی کھجور کو پکی ہوئی کھجور سے بیچنا۔

محاقلہ:یعنی کھیت میں لگے ہوئے کچے اناج کو پکے ہوئے اناج سے خریدنا۔وغیرہ

امام ابن کثیر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:"خرید و فروخت کے اس معاملے کو اور ان جیسے دیگر معاملات کو اس وجہ سے حرام قرار دیا گیا ہے تاکہ سود کا مادہ ختم ہو اور اس کی جڑ کٹ جائے کیونکہ سوکھنے سے پہلے دونوں چیزوں میں ہم وزنی مماثلث اور برابری معلوم نہیں ہے اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے **الجهل بالمماثلة كحقيقة المفاضلة**

ترجمہ:" دو چیزوں میں برابری و مماثلت معلوم نہ ہونا ہی سود کی حقیقت ہے"۔[29]

سود کو منافع اور فائدہ سے تشبیہ دینا:

حیلوں میں سے یہ بھی ہے کہ سود لینے والے لوگ اسے فائدے، نفع سے تعبیر کرتے ہیں۔تاکہ جو قرآن وحدیث کے نصوص میں سود سے متعلق وعیدیں ہیں ان سے بچا جا سکے جبکہ یہ نہایت ہی بچگانہ عمل ہے۔ہم ان سے پوچھتے ہیں کیا یہ مال اور منافع جو آپ نے لیا کیا اس لئے نہیں لیا کہ آپ نے ایک مدت کیلئے قرض دیا اور اب واپسی کے وقت آپ اس پر نفع مانگ رہے ہیں؟ یہ تو بعینہ ربا ہے آپ اسے جو چاہیں نام دیں،کیا خنزیر کو اگر بھیڑ بکری کہہ دیا جائے تو وہ حلال ہو جائیگا؟ ہر گز نہیں،اسی طرح کچھ لوگ ایک اور حیلہ ڈھونڈتے ہیں کہ ہم کفار کے ممالک میں اپنا مال رکھیں گے پھر ان سے نفع لے کر ان کے ملک کے اقتصاد کو کمزور بنائیں گے۔یہ بھی مضحکہ خیز ہے،آپ کے ان ممالک میں مال رکھوانے سے حقیقت میں اُن کا اقتصاد مضبوط ہو رہا ہے کیونکہ ان کے ملک کی دولت بڑھ رہی ہے کبھی بھی وہ مجبوری میں اس مال کو استعمال کر سکتے ہیں اور اکثر ممالک یہ فوائد مسلم ممالک کو نقصان پہنچانے کے لئے استعمال کرتے ہیں یا مسلمانوں کو سودی قرضے دے کر ان پر مزید دباؤ بڑھاتے

ہیں۔ اسی طرح آج کل کے ایک نام نہاد ڈاکٹر پروفیسر صاحب کا فتوی نظر سے گزار کہ فرماتے ہیں کافر ممالک میں رہائش پذیر لوگ سود لے سکتے ہیں سود کے یہ احکام صرف مسلمان ممالک پر لاگو ہوتے ہیں۔
ایسا عجیب فتوی یقینا مسلمانوں کے لیے شرّ عظیم کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔اگر کوئی اسی قسم کی بات زنا / حرام گوشت، کھانے وغیرہ کے بارے میں کہے تو ہمارا کیا ردعمل ہوگا؟ کیا یہ امور بھی وہاں حلال ہو جائیں گے ؟
اللہ تعالی ہمیں ربا کے تمام حیلوں سے بچنے اور اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکامات کے سامنے سر خم تسلیم کرنے والا بنائے (آمین)
وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین

[1]لسان العرب 185/1
[2]رواہ ابن بطة فی کتابہ "إبطال الحیل" شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس سند کو حسن قرار دیا ھے دیکھئے مجموع الفتاوی 29/29
[3]الفتاوی الکبری 191/3
[4]الموافقات 201/4
[5]المغني:63/4
[6]سنن ابی داود: کتاب الإجارة، باب في النهي عن العينة، علامہ البانی نے اس روایت کو سلسلة الصحیحہ میں صحیح قرار دیا ھے۔
[7]فتاوی ابن تیمیہ 446/29
[8]تاکہ قرض دار اپنے قرض کا مطالبہ مؤخر کر دے۔
[9]فتاوی الکبری 159/6 شیخ الاسلام نے اس حدیث کو حسن کہا ھے۔
[10]نیل الأوطار:257/6
[11]مجموع الفتاوی الکبری لإبن تیمیة 159/6
[12]شرح الممتع 61/9
[13]المغني لابن قدامة 211/4
[14]جامع الترمذي: کتاب البیوع، باب ما جاء في کراهیة بیع ما لیس عندك، امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ھے. سنن أبي داؤد کتاب الإجارة، باب في الرجل یبیع ما لیس عنده
[15]مجموع الفتاوی الکبری لإبن تیمیة 159/6

[16]شرح الممتع 61/9
[17]المغني لابن قدامة 211/4
[18]جامع الترمذي: كتاب البيوع، باب ما جاء في كراهية بيع ما ليس عندك، امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے. سنن أبي داؤد كتاب الإجارة، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده
[19]مجموع الفتاوى الكبرى لإبن تيمية 159/6
[20]شرح الممتع 61/9
[21]المغني لابن قدامة 211/4
[22]جامع الترمذي: كتاب البيوع، باب ما جاء في كراهية بيع ما ليس عندك، امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے. سنن أبي داؤد كتاب الإجارة، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده
[23]فتاوى اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء 141/13 مجموع فتاوى ابن باز 225/19
[24]صحيح البخاري: باب بدء الوحي
[25]تهذيب السنن لإبن القيم 5\80
[26]سنن أبي داؤد: كتاب الإجارة، باب في الطعام قبل أن يستوفي.
[27]رسالة المداينة للشيخ العثيمين رحمہ اللہ
[28]المجموع: 441/29
[29]تفسیر ابن کثیر 1/581

(3) سودی معیشت اور جدیدبینکاری

الشیخ ضیاء الرحمٰن مدنی حفظہ اللہ

اسلام ایک فطری مذہب ہے یہ حقوق العباد کو حقوق اللہ کی طرح بڑی اہمیت دیتا ہے بلکہ بعض روایات سے تو یہاں تک واضح ہوتا ہے کہ حقوق اللہ کی نسبت حقوق العباد کی اہمیت زیادہ ہے کیونکہ حقوق اللہ کی بابت تو یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالی عفو وکرم کرتے ہوئے بندے کو معاف کردے گا اس کے برعکس حقوق العباد کے متعلق یہ آیا ہے کہ جب تک حق والا معاف نہیں کرے گا اللہ تعالی بھی اسے معاف نہیں کرے گا۔اسی لئے اسلام نے ہر اس عمل کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے جس سے لوگوں کے حقوق کی پامالی اور حق تلفی ہوتی ہو۔اسلام نے جن باتوں کو ناجائز اور حرام قرار دے کر انسانوں کو ان سے روکا ہے ان میں سے ایک سود بھی ہے۔چونکہ سود وہ معاملہ ہے جس میں تھوڑی رقم یا جنس دے کر زیادہ رقم یا جنس لی جاتی ہے۔اس میں سود دینے والے پر ظلم ہوتا ہے اور سود لینے والا بیٹھے بٹھائے بغیر کسی محنت کے منافع کمارہا ہے اسی لئے اسلام نے اسے حرام قرار دیا ہے۔

سود کی مذمت:

﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا ۗ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۚ فَمَن جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (275) يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ ۗ وَاللَّهُ لَا

يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ(276)إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (277)يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (278)فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ)279(﴾

البقرة:275–279

ترجمہ:"جولوگ سود کھاتے ہیں وہ(قبروں سے)اس طرح(حواس باختہ)اٹھیں گے جیسے کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنادیاہو یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ سود بیچنا بھی(نفع کے لحاظ سے)ویساہی ہے جیسے سود(لینا)حالانکہ سودے کواللہ نے حلال کیاہےاور سود کو حرام تو جس کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ(سود لینے سے)باز آگیاتو جو پہلے ہو چکاوہ اس کااور(قیامت میں)اس کا معاملہ اللہ کے سپرد اور جو پھر لینے لگے گاتوایسے لوگ دوزخی ہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں جلتے رہیں گے۔اللہ سود کو نابود(یعنی بے برکت)کرتااور خیرات(کی برکت)کو بڑھاتاہےاور اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو دوست نہیں رکھتا۔جولوگ ایمان لائےاور نیک عمل کرتےاور نماز پڑھتےاور زکوۃ دیتے رہےان کوان کے کاموں کا صلہ اللہ کے ہاں ملے گااور(قیامت کے دن)ان کو نہ کچھ خوف ہو گااور نہ وہ غمناک ہوں گے۔اے ایمان والواللہ تعالٰی سے ڈرواور جو سود باقی رہ گیاہے وہ چھوڑ دواگر تم سچ مچ ایمان والے ہو۔ اوراگر ایسانہیں کرتے تواللہ تعالٰی سے اوراس کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤہاں اگر توبہ کرلوتو تمہارا اصل مال تمہاراہی ہے،نہ تم ظلم کرواور نہ تم پر ظلم کیاجائے"۔

نیزارشادہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

آل عمران:130

ترجمہ:" اے ایمان والو!دگناچوگنا سود نہ کھاؤاور اللہ سے ڈروتاکہ نجات حاصل کرو"

نیزارشادہے:

﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَن سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا ○ وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا﴾

النساء:160-161

ترجمہ:تو ہم نے یہودیوں کے ظلموں کے سبب (بہت سی) پاکیزہ چیزیں جو ان کو حلال تھیں ان کو حرام کر دیں اور اس سبب سے بھی کہ وہ اکثر اللہ کے راستے سے (لوگوں کو) روکتے تھے۔اور اس سبب سے بھی کہ باوجود منع کئے جانے کے سود لیتے تھے اور اس سبب سے بھی کہ لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے اور ان میں سے جو کافر ہیں ان کے لئے ہم نے دردد ینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

نیز اللہ تعالی نے فرمایا:

﴿وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ﴾ الروم:39

ترجمہ:اور جو تم سود دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں افزائش ہو تو اللہ کے نزدیک اس میں افزائش نہیں ہوتی اور جو تم زکوۃ دیتے ہو اور اس سے اللہ کی رضامندی طلب کرتے ہو تو (وہ موجب برکت ہے اور) ایسے ہی لوگ (اپنے مال کو) بڑھانے والے ہیں۔

سود کا مفہوم

قرآن مجید میں سود کے لئے ربوا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کا معنی ہے اضافہ اور زیادتی۔ گویا لغوی طور پر اصل رقم پر جو بھی اضافہ ہو اسے سود کہا جاتا ہے۔ مگر رقم پر اضافہ کی ہر صورت ربوا یا سود نہیں بلکہ اس کی بعض سورتیں جائز اور بعض ناجائز ہیں۔ مثلاً کاروبار اور تجارت کے ذریعہ بھی اصل رقم پر منافع کی صورت میں اضافہ ہوتا ہے یہ شرعاً بھی جائز ہے اور اخلاقاً بھی۔ مگر سود اصل رقم پر مخصوص انداز کا اضافہ ہے جس کی اجازت قطعاً نہیں بلکہ یہ سرے سے حرام ہے۔اسی لئے اللہ تعالی نے فرمایا:

﴿اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ البقرۃ:275

ترجمہ: کہ اللہ تعالی نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام ٹھہرایا ہے۔

چونکہ عربوں میں سود یا ربوا کی صورت متعین اور معلوم تھی اس لئے اس کی وضاحت اور تشریح کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ:" دور جاہلیت میں ایک آدمی دوسرے کے ہاتھ کوئی چیز فروخت

کرتااور قیمت کی ادائیگی کے لئے وقت مقرر کرلیتا۔اگر مقررہ مدت پر وہ ادائیگی نہ کر سکتاتو وہ قیمت میں اضافہ قبول کر کے مزید مہلت لے لیتا تھا۔اسے سود کہتے تھے"۔

اسی طرح مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے۔"قبل از اسلام رواج تھا کہ ایک آدمی قرض لیتااور کہتا کہ اگر تم مجھے اتنی مہلت دے دو تو میں اصل رقم سے اتنی رقم زائد دوں گا"۔یہ بھی سود کی ایک صورت تھی جسے قرآن مجید نے حرام قرار دیا ہے۔

تجارت اور سود میں بنیادی فرق: سود خور لوگ اس معاملہ کو جائز ثابت کرنے کے لئے کہا کرتے ہیں کہ ہمارا یہ معاملہ بھی ایک قسم کی تجارت ہے جس طرح تجارت میں منافع جائز ہے اس طرح ہم بھی اپنی رقم پر منافع لیتے ہیں۔

ان لوگوں کی بات سراسر غلط اور خلاف حقیقت ہے کفار بھی یہی کہا کرتے تھے۔چنانچہ اللہ تعالی نے ان کا ذکر یوں کیا ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾

البقرۃ:275

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گے جیسے کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنادیا ہو یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ سودا بیچنا بھی (نفع کے لحاظ سے) ویسا ہی ہے جیسے سود (لینا) حالانکہ تجارت کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام"۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ ربوا یعنی سود کو ایک قسم کی تجارت کہتے تھے۔اللہ تعالی نے تجارت کو حلال اور ربوا یعنی سود کو حرام کیا ہے۔

تجارت اور سود میں فرق

حالانکہ یہ دونوں معاملے الگ الگ ہیں۔ تجارت میں ایک آدمی اپنی چیز کو فروخت کرنے کے لئے پیش کرتا ہے اور دوسرا اسے خرید رہا ہوتا ہے۔اس میں تاجر جو اصل رقم سے زائد رقم لیتا ہے اسے نفع کہا جاتا ہے۔ تجارت کا نفع اس لئے جائز ہے کہ بیچنے والے نے پہلے اس چیز کو خود تیار کیا یا وہ اسے کہیں سے خرید کر لایا، پھر کچھ عرصہ

اسے اپنے پاس رکھا پھر اس سلسلہ میں اس نے اپنی بدنی، ذہنی اور مالی صلاحیتوں کو صرف کیا اور اس کے عوض وہ منافع لے رہا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ جائز ہے۔ اس کے برعکس سود میں ایک آدمی دوسرے کو اپنی رقم دے کر اسے کچھ مہلت دیتا ہے اور وہ اس مہلت کے بالمقابل زائد رقم طلب کرتا ہے جس کے لئے اس نے کچھ بھی محنت نہیں کی ہوتی۔ یہ سود ہے جسے اللہ تعالی نے حرام قرار دیا ہے۔

اسی طرح تجارت میں ایک طرف ایک جنس ہوتی ہے اور اس کے بالمقابل رقم یا قیمت ہوتی ہے یہ جائز ہے کہ دونوں طرف چیز الگ الگ ہوتی ہے۔ جبکہ سود کے معاملہ میں دونوں طرف ایک ہی چیز ہوتی ہے۔ اسی طرح تجارت میں ایک آدمی اپنی چیز دے کر اس کے عوض میں کوئی چیز لے رہا ہوتا ہے۔ مگر سود میں ایک فریق کو تو معاوضہ مل رہا ہوتا ہے۔ جبکہ دوسرے فریق کو کچھ نہیں ملتا بلکہ الٹا وہ دے رہا ہوتا ہے۔ نیز تجارت میں تو ایک دفعہ منافع لے کر معاملہ مکمل ہو جاتا ہے اس کے برعکس سود کی صورت میں رقم دینے والا اپنی رقم پر مسلسل سود لیتا رہتا ہے۔ اور عموماً یہ سود اصل رقم سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے اسباب کے پیش نظر اللہ تعالی نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔

ان کے علاوہ سود خور اخلاقی پستی کا بھی مریض ہوتا ہے وہ خود غرض، بخیل، بے رحم اور زر پرست بن جاتا ہے ایک اچھے مسلمان میں ایسی باتیں قابل مذمت ہیں۔ ان بدعات کے نتیجہ میں انسانوں کے مابین نفرت، عداوت اور قطع تعلقی وغیرہ جیسی عادات آ جاتی ہیں جن کی اسلام قطعاً اجازت نہیں دیتا۔

چونکہ سود انسان کے دین کا بھی دشمن ہے اور اخلاق کا بھی۔ اس لئے اللہ تعالی نے انتہائی سخت الفاظ کے ساتھ سود سے منع فرمایا اور اسے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے مترادف ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَذَرُوا۟ مَا بَقِىَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓا۟ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا۟ فَأْذَنُوا۟ بِحَرْبٍ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ﴾

البقرۃ: 278-279

ترجمہ: اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو اگر تم سچ مچ ایمان والے ہو۔ اور اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

یہی وجہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ "جاہلیت کے تمام سودی معاملات کالعدم ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس کا سود ساقط کرتا ہوں انہوں نے لوگوں سے جو سود لینا تھا وہ نہیں لیں گے"۔] 1[

اللہ تعالی نے انسانوں کو بہت سے گناہوں سے منع کیا ہے مگر جس قدر وعید سود کے متعلق ہے ایسی سخت وعید دوسرے کسی گناہ پر نہیں ہے۔ سنن ابن ماجہ میں ایک حدیث ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سود کے ستر درجے ہیں اور اس کا کم از کم گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرے"۔]2[

ایک اور حدیث میں ہے آپ نے فرمایا: " سود لینے والا، کھانے اور کھلانے والا، دینے والا، اس کی دستاویز لکھنے والا اور ایسے معاملہ پر گواہ بننے والا سب لوگ لعنتی ہیں"۔[3] یاد رہے کہ جنس کا جنس سے یعنی غلہ کا غلہ سے تبادلہ کرتے ہوئے برابری ضروری ہے ورنہ یہ بھی سود بن جائے گا۔

سود کے نقصانات

سابقہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ کوئی آدمی اپنی اصل پر بغیر محنت و مشقت کئے اور بغیر اپنی کسی صلاحیت کو استعمال کئے جو زائد رقم لے وہ سود ہے جس سے شریعت نے منع کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر غور کیا جائے تو سود کے بہت سے نقصانات بھی ہیں۔ مثلاً سود خور آدمی خود غرض، مفاد پرست، حریص، تنگ دل اور زر پرست بن جاتا ہے۔ اور اس کے دل میں مال و دولت کی ہوس مزید پروان چڑھتی چلی جاتی ہے اس کے برعکس اسلامی تعلیمات کے نتیجہ میں انسان ایک فیاض، سخی، ہمدرد، فراخ دل، عالی ظرف اور دوسروں کا خیر خواہ اور خیر اندیش ہوتا ہے۔ سود خوران تمام صفات عالیہ سے یکسر محروم ہوتا ہے۔

سود کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ اس طرح غریب طبقہ مزید غریب اور محروم کیا جاتا ہے ایک شخص پہلے ہی ضرورت مند اور محتاج ہوتا ہے اور اسے سود پر رقم ملے تو وہ مزید زیر بار ہو جاتا ہے اور اس کی رہی سہی قوت خرید بھی آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے اور وہ جو کچھ کماتا ہے وہ ساہوکار لے جاتا ہے۔

جواز سود کی عقلی توجیہات

(1) بعض مغرب زدہ لوگوں میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ سود صرف اسی صورت میں قابل اعتراض ہے جب وہ ذاتی ضروریات کیلئے دی گئی رقم پر لیا جائے ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی آدمی کاروبار کیلئے کسی سے رقم لے یا کسی کو

رقم دے تو ایسی صورت میں سود کا لین دین حرام نہیں بلکہ سراسر معقول، جائز اور حلال ہے۔ مگر ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ یہ بھی اصل رقم سے زائد ہے جو وہ بلاوجہ اور بلا معاوضہ لے رہا ہے لہذا یہ بھی ناجائز ہے۔

(2-)اس طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم جب اپنی رقم کسی کو دیتے ہیں تو اپنی ضرورت کو روک کر دوسرے کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور اس میں رقم کے ڈوبنے کا خطرہ بھی ہوتا ہے اس لئے اس پر سود لینا جائز ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر مال دار آدمی کو رقم ڈوبنے کا اندیشہ ہو تو وہ ایسا کام ہی نہ کرے اور بے خطر ہو جائے یا پھر وہ مدیون سے کوئی چیز بطور ضمانت لے کر رکھ لے۔

(3) نیز بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں دوسرے کو اپنے مال سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ دیتا ہوں، لہذا اس میں سے مجھے بھی حصہ ملنا چاہئے۔ یہ بات اگرچہ درست ہے مگر اسے ایسی صورت میں مشارکت کا معاملہ کرنا چاہئے کہ اگر رقم لینے والے کو کاروبار میں نفع ہوا تو یہ نفع میں شریک ہو اور اگر اسے خسارہ آئے تو یہ خسارہ میں بھی حصہ دار بنے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ وہ منافع میں تو حصہ دار بننے پر تیار ہے مگر خسارہ کی صورت میں بالکل الگ تھلگ ہو جائے؟

ہماری اب تک کی گزارشات سے یہ واضح ہو چکی ہے کہ سود شرعی طور پر قطعاً ناجائز اور حرام ہونے کے ساتھ ساتھ انسانوں پر ظلم ہے نیز اس کے روحانی اور اخلاقی نقصانات بھی زیادہ ہیں۔

اصلاح احوال

ایک سوال: ہماری اس قسم کی گفتگو سن کر بعض مغرب زدہ دانشور کہہ دیا کرتے ہیں کہ چونکہ اب تک غیر سودی نظام مالیات مدون نہیں ہوا۔ لہٰذا عارضی طور پر سودی نظام جاری رہنا چاہیے۔ جب غیر سودی نظام سامنے آ جائے گا تو اسے ختم کر دیں گے۔ یہ محض خام خیالی ہے سود چونکہ شرعاً حرام ہے اسے دستوری طور پر بھی ممنوع قرار دینا چاہیے۔ اس کے نتیجے میں خود بخود غیر سودی نظام سامنے آ جائے گا اگر سودی نظام اسی طرح چلتا رہے تو قیامت تک اس سے جان نہیں چھوٹ سکتی۔ اور بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ سود کے بغیر ہمارا ملک چل ہی نہیں سکتا۔ یہ محض شیطانی وسوسہ ہے ہم سود جیسی نحوست کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی بندہ جرأت کر کے سود کو مکمل طور پر ممنوع قرار دے پھر دیکھیں کہ کیوں کر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا فضل ہمارے شامل حال ہوتا ہے۔ اِن شاء اللہ۔

یہ تو ہیں سود کے متعلق اسلامی احکامات۔ان کے علاوہ کوئی بھی سنجیدہ، غیر متعصب اور انسانیت کا خیر خواہ آدمی سود کو قبول کرتا ہے نہ پسند۔اگر ہم مغربی ماہرین معاشیات کی کتابوں کا وسیع مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بھی سود کو انسانیت کے لئے بہت زیادہ نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ معروف مغربی ماہر اقتصادیات سر رائے ہارڈ نے لکھا ہے کہ انسانی معاشرہ کی بہتری چاہتے ہو تو سود سے نجات حاصل کرو۔

بینکاری کا آغاز

مغربی ممالک میں بینکاری کا آغاز یوں ہوا کہ ابتدا میں جب کاغذ کے نوٹ نہ ہوتے تھے اس وقت لوگ اپنی دولت سونے یا چاندی کی صورت میں جمع کیا کرتے تھے۔ جس کے پاس زائد از ضرورت دولت ہوتی وہ اسے بطور امانت سناروں کے پاس رکھ کر اس سے رسید لے لیتا کہ میری اتنی دولت فلاں سنار کے پاس بطور امانت پڑی ہے پھر وہی رسیدیں خرید و فروخت کے سلسلہ میں ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہونے لگیں۔ہر لین دین کے موقعہ پر سنار سے سونا لے کر ادائیگی کرنے کی بجائے محض رسیدوں پر خرید و فروخت کرنے میں لوگوں کو سہولت تھی۔چنانچہ کاروبار کا یہ انداز لوگوں میں رائج ہو گیا۔ موجودہ زمانہ میں بینک نوٹ، چیک اور ڈرافٹ وغیرہ اسی رسید کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔آہستہ آہستہ ان سناروں اور ساہوکاروں نے محسوس کیا کہ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو بیک وقت اپنی تمام رقم کی واپسی کا مطالبہ کریں۔ سونے چاندی کی بہت بڑی مقدار ان کے پاس یوں ہی بے کار پڑی رہتی ہے۔انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ اس ذخیرہ کا کچھ حصہ بطور قرض دے کر اس پر منافع کمایا جائے۔ جن سے یہ کاروبار منافع بخش ثابت ہوا تو انہوں نے لوگوں سے زیادہ سونا چاندی حاصل کرنے کی خاطر امانت پر سود دینا شروع کر دیا۔اس طرح وہ تھوڑی شرح سود پر رقم لے کر حاجت مندوں کو زیادہ شرح سود پر قرضہ دے کر منافع کمانے لگے۔ؤ

موجودہ زمانے کے بینک اسی طریقہ کی ترقی یافتہ شکل ہیں اگرچہ بینکوں میں ہونے والے لین دین کی بنیاد سود پر ہے جو کہ یقیناً ناجائز، غلط اور حرام ہے اس کے باوصف بینک بہت سی ایسی خدمات بھی سرانجام دیتا ہے جو انسانوں کے لئے مفید بھی ہیں اور ناگزیر بھی۔ مثلاً رقوم کا ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنا اور ادائیگی کا انتظام کرنا، بیرونی ممالک سے لین دین کی سہولت، قیمتی اشیاء کی حفاظت وغیرہ۔کیونکہ بینک بہت تھوڑا معاوضہ لے کر وقت اور سرمایہ کو بچاتا ہے۔تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ ان بینکوں کو یکسر ختم کرنے کی بجائے ان کے

نقائص کو دور کر کے اس نظام کی اصلاح کی جائے۔اس طرح بینکاری کا نظام پاکیزہ ہو کر کئی گناہ زیادہ منافع بخش بھی ہو جائے گا۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس وقت لوگ سود کی لالچ میں آکر اپنا سرمایہ بینکوں میں جمع کراتے ہیں اگر سود ملنے کی توقع نہ ہو تو کون اپنا سرمایہ بینکوں میں جمع کرائے گا؟ مگر حقیقت ہے کہ سود ختم کر دینے کے بعد لوگ منافع کی امید پر بھی اپنی رقوم بینکوں میں جمع کراتے رہیں گے بلکہ جس قدر رقم انہیں سود کی صورت میں ملتی ہے منافع کی صورت میں اس سے کہیں زیادہ انہیں ملنے لگے گی۔

پاکستان میں غیر سودی بینکاری کا آغاز

چونکہ سود قطعا حرام ہے اور بینکوں کا نظام بھی اصلاح کا محتاج ہے اسی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے پاکستان کے ماہرین معاشیات روز اول ہی سے سوچ بچار کرتے آرہے ہیں کہ کسی طرح سود سے گلو خلاصی ہو جائے اور بینکوں کا نظام بھی اسلامی صورت میں آجائے۔

چنانچہ یکم جنوری ۱۹۸۱ء سے بینکوں میں غیر سودی شعبہ بھی کھول دیا گیا اس کا اہل پاکستان نے پر جوش خیر مقدم کیا اور چند ہی مہینوں کے اندر ان کھاتوں میں جمع کرائی جانے والی رقم دو ارب روپے ہو گئی۔بینکوں کے نظام کی اصلاح عوامی امنگوں کے عین مطابق ہے۔کیونکہ پاکستان کے اسلامی معاشرہ میں سود ہمیشہ ناقابل قبول رہا ہے۔ عوام کی اکثریت بینکوں میں سودی نظام کے تحت اپنی رقوم جمع کراتی ہے مگر وہ دلی طور پر اسے قبول نہیں کرتے۔بینکوں میں بطور تجربہ جو کھاتے کھولے گئے ہیں ان میں سے ایک نفع نقصان میں شراکت بچت کھاتہ ہے اور دوسرا نفع نقصان میں شراکت کا میعادی کھاتہ اگرچہ ابھی اس نظام میں اصلاح کی مزید ضرورت ہے تاہم امید ہے کہ اگر ہماری حکومت اور ماہرین خلوص دل سے کوشش کریں تو اس لعنت سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔پاکستان میں غیر سودی بینکاری کا محدود تجربہ کرنے کے بعد یہ حقیقت آشکارا ہو گئی ہے کہ اس سے بینکوں کی رقوم میں بالکل کمی نہیں آئی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ رقوم جمع کرائی گئی ہیں اور عوام کو سود کی صورت میں جتنی رقم ملتی تھی نفع نقصان کے کھاتے میں اس سے بھی زیادہ رقوم ملنے لگی ہیں الحمد للہ۔

اسلامی ترقیاتی بینک

اسلامی ممالک کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اقتصادی ترقی کے لئے آپس مین تعاون کریں اور غیر سودی بینکاری کا نظام رائج کریں۔چنانچہ اللہ تعالی کی توفیق سے ”اسلامی ترقیاتی بینک“ وجود میں آچکا ہے اس کا صدر دفتر جدہ

میں ہے تمام اسلامی ممالک اس بینک کے رکن بن کر بلاسود قرضے حاصل کر سکتے ہیں۔اس کامیاب تجربہ کو دیگر بینکوں میں بھی روبہ عمل لایا جاسکتا ہے۔

وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

[1]ابوداؤد: کتاب المناسک، باب صفۃ حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر 1905

[2] سنن ابن ماجہ: کتاب التجارات، باب التغلیظ الربا، حدیث نمبر: 2274 یہ حدیث صحیح ہے

[3] صحیح مسلم: کتاب المساقاۃ، باب لعن آکل الربا

(4) اسلامی معیشت میں زارعت کی اہمیت اور اس سے متعلقہ احکام!

الشیخ عمران فیصل حفظہ اللہ

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور شریعت اسلامی انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں رُشد وہدایت حاصل کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے اور اسے معیشت وسیاست کیلئے دوسرے نظاموں سے کچھ بھی مستعار لینے کی ضرورت نہیں، دین کے بارے میں یہ غلط تصور مغربی تہذیب نے دیا ہے کہ یہ صرف اللہ اور بندے کے باہمی تعلق کا نام ہے اور دنیا کے دیگر معاملات ہمیں انسانی عقل اور تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر ہی بروئے کار لانے چاہئیں۔ تاریخ گواہ ہے جب جب انسان نے اس طرح کے نظام بنائے ہیں تو اس کے نتیجے میں اس نے انسان کو شخصی استبداد میں مبتلا کیا سرمایہ دارانہ نظام کی صورت میں، اور یا پھر کیمونزم کی صورت میں اسے اسکی ذاتی ملکیت سے ہی محروم کر دیا۔ جبکہ اسلام ہر معاملہ میں اعتدال کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا البقرۃ- 143

"اور ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا"۔

شریعت اسلامی اس معتدل امت کیلئے مکمل نظام زندگی ہے اور بلاشبہ مکمل نظام زندگی پر مشتمل شریعت کیلئے یہ کسی طرح موزوں نہیں تھا کہ وہ زندگی کے اس مخصوص شعبے [معاشی نظام] یا اس کی معاشی اساس "زراعت" کے بارے میں ہدایات جاری نہ کرے۔

انہی اہم وجوہ کی بناء پر اکثر سلف صالحین، ائمہ، محدثین، فقہاء نے اس موضوع کو اپنی کتب میں تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ ماہرین معاشیات بنیادی طور پر معاشیات Economy کے تین عامل ذکر کرتے ہیں۔

(1) زمین Land ، (2) محنت Worker ، (3) سرمایہ Capital ۔

زیر نظر مضمون میں راقم نے معاشی نظام کے انتہائی اہم رکن "زراعت" سے متعلق احکام بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور اس شعبہ کو مندرجہ ذیل تین فصول میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ قارئین زراعت اور اس کے متعلقہ احکام بآسانی سمجھ سکیں۔

1- زمین اور اسکی ملکیت

2- فضائل زراعت

3-مزارعت کے متعلق احکام

زمین اور اسکی ملکیت:

زمین سے مراد سطحِ زمین ہے اس میں وہ تمام قدرتی وسائل شامل ہیں جن پر انسان محنت کر کے اپنا گزر بسر کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ عمران-109

"جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے"۔

یعنی دنیا ومافیہا میں جو کچھ ہے وہ اصل میں اللہ ربّ العزت ہی کی ملکیت ہے اور دوسری جگہ فرمایا

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا البقرۃ-29

"وہی تو ہے جس نے زمین میں موجود ساری چیزیں تمہاری خاطر پیدا کیں" ۔

یعنی تمام اشیاء کی خلقت کا مقصد بنی نوع انسان کی معاشی حیات کیلئے سبب فراہم کرنا ہے اور کوئی شئی فی حد ذاتہ کسی کی مملوکِ خاص نہیں جب ان سب کو سب کیلئے مباح کر دیا تو ان سے فائدہ حاصل کرنے میں انسانوں کے درمیان مزاحمت اور مناقشت شروع ہوئی تو پھر اس آیتِ مبارکہ سے راہنمائی کی کہ:

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ الانعام-165

وہی تو ہے جس نے تمہیں زمین میں نائب بنایا اور ایک کے مقابلے میں دوسرے کے درجے بلند کئے تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں دے رکھا ہے اسی میں تمہاری آزمائش کرے"۔ایک جگہ فرمایا:

آمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَأَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ الحدید-7

"اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جن میں اس نے تمہیں نمائندہ بنایا ہے "۔

یعنی حقیقت میں مال وملکیت اور زمین اور اس میں موجود تمام نعمتیں اور معدنیات اللہ رب العزت کی ملکیت ہیں اور انسان کی حیثیت اسمیں ایک وکیل اور نمائندہ کی سی ہے اور پھر شریعتِ اسلامی نے یکسر شخصی ملکیت کا انکار

نہیں کیا بلکہ اجتماعی مفادات کے پیش نظر ایسے قواعد اور طریقے وضع کئے جو انفرادی ملکیت میں اعتدال بھی رکھ سکیں اور اجتماعی مفاد کو کوئی ٹھیس بھی نہ پہنچے اس طرح زمینی اراضی کی بنیادی طور پر دو ہی اقسام بنتی ہیں:

اوّل: ایسی اراضی جو حکومتی ملکیت ہوں۔

دوم: ایسی اراضی جو انفرادی یا شخصی ملکیت ہوں۔

عمومی طور اراضی مملکت مندرجہ ذیل اقسام پر مشتمل ہوتی ہے:

(1) اراضی موات: اراضی موات ایسی بنجر مردہ اور دور افتادہ زمین کو کہا جاتا ہے جسے کسی نے آباد نہ کیا ہو، کتب فقہیہ میں باب احیاء الموات میں اس کے متعلقہ احکام ذکر کئے جاتے ہیں، اِحیاء الموات سے مراد کسی ایسی زمین کو پانی لگانے، زراعت و کاشتکاری یا عمارت تعمیر کرنے کے ذریعے آباد کرنا جو پہلے کسی کی ملکیت نہ ہو؛ ایسی زمین کی آبادکاری کیلئے شریعتِ اسلامی نے سادہ سا اصول بتایا ہے کہ:

من أحيا أرضا ميتة فهي له

جس نے مردہ پڑی بے آباد زمین کو آباد کیا وہ اسی کی ہے۔" کوفہ میں پڑی بنجر اور بے آباد زمینوں کے بارے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی یہی رائے تھی"۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

'من أحيا أرضا ميتة فهي له" ويروى عن عمرو بن عوف عن النبي ﷺ وقال: "في غير حق مسلم، وليس لعرق ظالم فيه حق"

صحيح بخاري، باب من أحيا أرضاً..: 106/3

"جس نے مردہ پڑی بے آباد زمین کو آباد کیا وہ اسی کی ہے"۔ عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے اس اضافے کے ساتھ مروی ہے کہ:" جس نے مردہ پڑی بے آباد زمین کو آباد کیا وہ اسی کی ہے بشرطیکہ وہ پہلے سے کسی مسلمان کی ملکیت نہ ہو اور اس میں ظالم کے پسینہ بہانے کا کوئی حق نہیں۔

یعنی کسی اور کی ملکیت میں کاشت کاری کرنے والے کو اس کی محنت کا کوئی صلہ نہیں دیا جائے گا اور نہ ہی ملکیت تصور کی جائے گی۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کسی ایسی زمین کو بذریعہ تعمیر آباد کیا جو کسی کی نہ ہو وہ اسی کی ہے''، عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ ''اسی کے مطابق عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے دوران فیصلے دیئے''۔][1

سنن ابو داود میں جابر بن عبداللہ سے بھی مروی ہے کہ: **من أعمر أرضاً ليست لأحدٍ فهو أحق**

سنن أبو داود، كِتَاب الْخَرَاجِ....:130/3

''جس نے کسی ایسی زمین کو آباد کیا جو کسی کی نہ ہو وہ اسی کی ہے''۔

کیا بنجر زمین کو آباد کرنے کیلئے حکومت کی اجازت ضروری ہے؟

مولانا حنیف گنگوہی صاحب رقم طراز ہیں کہ: ''جو شخص مردہ زمین کو حاکم کی اجازت سے قابل زراعت بنالے تو امام صاحب کے نزدیک وہ اسکا مالک ہو جاوے گا، صاحبین کے نزدیک حکم حاکم کے بغیر ہی مالک ہو جاتا ہے، ائمہ ثلاثہ کا بھی یہی قول ہے وہ یہ فرماتے ہیں کہ حدیث

من أحيا أرضاً ميتةً فهي له

میں اذن و عدمِ اذن کی کوئی قید نہیں، امام صاحب کی دلیل حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

ليس للمرء الا ماطابت به نفس امامه

اس حدیث کی روایت منقطع ہے اور ایک راوی مکحول نے کسی مجہول راوی سے روایت کی ہے اس بناء پر روایت حجت کے لائق نہیں]..2[

لیکن دورِ حاضر میں حکومت تمام زمینوں کی مالک ہوتی ہے اس لئے حکومت سے اجازت لینا ہی قرین قیاس ہے اور حکومتوں کا بھی فرض بنتا ہے کہ وہ بھی مستحق لوگوں کیلئے بنجر اراضی کی آبادکاری کی ایسی اسکیمیں متعارف کرائے جو وطن عزیز کے کروڑوں نادار لوگوں کے پیٹ بھرنے کا سبب بھی ہوں اور ملک کی لاکھوں ایکڑ اراضی کے قابل کاشت بنانے کا باعث بھی۔ مزید تفصیل آگے آئے گی۔ ان شاء اللہ

(2) اراضی اقطاع

حکومتی اراضی سے کچھ حصہ [جاگیر، خواہ زمین ہو یا معدنیات] بعض مستحقین یا مخصوص افراد کو عطا کر دیا جائے تو ایسی زمینوں کو اراضی اقطاع کہا جاتا ہے بشرطیکہ یہ اراضی پہلے سے کسی کی ملکیت میں نہ ہو۔

اقطاعِ اراضی کی عہد نبوی علیہ افضل الصلاۃ والسلام میں کئی مثالیں ملتی ہیں:

(1)انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"نبی ﷺ نے بحرین میں جاگیریں دینے کا ارادہ کیا تو انصار نے عرض کیا کہ [ہم لوگ نہ لیں گے] جب تک کہ ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی آپ اتنی ہی جاگیر عطا فرمائیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد دیکھو گے کہ لوگوں کو تم پر ترجیح دی جائے گی، تو اس وقت تم صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے ملو"۔[3]

اس حدیث مبارکہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ نہ اراضی کا دورافتادہ و بنجر [موات] ہونا ضروری ہے اور نہ ہی اس کا حاجت مند ہونا ضروری ہے جسے زمین دی جارہی ہے۔ جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بنجر زمین کا قطعہ ہی کسی مستحق کو دیا جاسکتا ہے ان کی دلیل ہے۔

إن الله لايقدس أمة لايؤ خذ للضعيف فيهم حقه

الأم للشافعي: باب اقطاع الوالي: 51/4

معنی کے لحاظ سے حدیث اگرچہ صحیح ہے لیکن اس حدیث کے راوی یحیٰ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا تھا چنانچہ جیسے حربی اور ابی حاتم نے فرمایا ہے کہ اگر ایسا نہیں ہوتا تو روایت صحیح تھی۔[4]

علقمہ بن وائل اپنے والد سے روایت کرتے ہیں:

"نبی ﷺ نے حضر موت کے علاقے میں انہیں ایک قطعہ زمین عطا کیا"۔[5]

ابیض بن حمال سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے اور چاہا کہ نمک کی وہ کان جو مآرب میں تھی جاگیر کے طور پر ان کو دے دیں تو آپ نے ان کو عطا کر دی۔ جب وہ چلنے لگے تو مجلس میں سے ایک شخص بولا یا رسول اللہ ﷺ: "کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ نے اسے کیا دے دیا؟ آپ نے اس کو نہ ختم ہونے والا پانی دے دیا! چنانچہ یہ سن کر آپ نے اسے واپس لے لیا۔ اس کے بعد انہوں نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ پیلو کے درخت کی کو نسی زمین گھیری جائے؟ [جہاں لوگ اور ان کے جانور نہ آسکیں] آپ نے فرمایا جہاں اونٹوں کے قدم نہ پہنچ سکیں۔ (یعنی جو آبادی اور چراگاہ سے الگ ہو)۔[6]

یہ اقطاع اراضی کی عہد نبوی کی چند مثالیں ہیں ان کے علاوہ بھی کئی مثالیں موجود ہیں جو اس عمل کے جواز کی واضح دلیل ہیں اور اس کے بعد بھی امام المسلمین لوگوں کو ان کے جذبہء خدمت کو سراہتے ہوئے یا مستحقین کی مالی اعانت کے طور پر زمینیں عطا کیا کرتے تھے لیکن پس منظر میں اقطاع اراضی کا مقصد زمین کی آبادکاری اور

زراعت کی افزائش بھی ہوتا تھا۔ یہ بعد کے اقطاع اراضی کے نظام سے بالکل مختلف تھا جس میں اچھی اور آباد زمینیں اقرباء میں تقسیم ہوتیں یا لوگوں کی وفاداریاں خریدنے کیلئے دی جاتی تھیں، اس قسم کی اقطاع اراضی کے اموی دور سے لیکر ہندوستان میں مغل ادوار تک کے قصے زبال ۃ التاریخ میں بھرے پڑے ہیں۔

لیکن دور حاضر میں وطن عزیز کا کیا المیہ ہے؟ یہاں تو عوام کی حکومت عوام پر ہے اور معیشت زبوں حالی کا شکار ہے پھر بھی آج تک تمام فوجی و سول حکومتیں ان اراضی کی منصفانہ اصلاح و تقسیم میں ناکام نظر آئی ہیں اور دنیا میں جہاں کہیں بھی حکومتیں اراضی کی اصلاحات متعارف کرانے میں ناکام ہوئی ہیں وہاں بے روزگاری، شورش اور خانہ جنگی نے بار بار جنم لیا ہے۔ روس، ویت نام اور چین میں دیہی علاقوں کے عدم اطمئنان کی وجہ سے ہی کیمونسٹوں نے حکومتوں کا تختہ اُلٹا تھا۔ ماضی قریب میں سُوڈان، نیپال، زمبابوے، ایل سلواڈور اور پیرو کے تنازعات اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ کس طرح زمین کی مِلکیت اور استعمال کا عرصہ نسلی اور طبقاتی تشدد کو ہوا دینے کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔

پاکستان میں بھی بالکل ایسی ہی صورت حال ہے زمین کی ملکیت نہ ہونا پاکستان کے دیہی علاقوں میں غربت اور بھوک کی بلاشبہ سب سے بڑی وجہ ہے۔ تقریباً 70 فیصد دیہی آبادی کے پاس اپنی اراضی نہیں ہے اور پاکستان کی کل اراضی کی 71 فیصد Agricultural Irrigated Land زمین کو قابل کاشت Arable Land بنایا جا سکتا ہے۔ جو کہ 1975 میں تقریباً 6 کروڑ 84 لاکھ پاکستانیوں کیلئے 595.19 Million Hector تھی یعنی کل قابل کاشت اراضی کا صرف 21 فیصد اور آج تقریباً 19 کروڑ پاکستانیوں کیلئے 30.20 Million Hector یعنی کل قابل کاشت اراضی کا صرف 23 فیصد ہے۔ اس 23 فیصد رقبہ کا 47 فیصد خواص کے پاس ہے اور باقی اراضی اسوقت عوام کی ملکیت ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ برّصغیر ہند میں برطانوی قانون کے تحت نجی جائیداد رکھنے کے حقوق بنیادی طور پر جاگیرداروں کو دیئے گئے تھے جس کا مقصد ان کی حمایت حاصل کرنا تھا اور آزادی ملنے کے بعد بھی پاکستان کی حکومتوں نے جاگیرداروں کے طبقہ اشرافیہ کو نوازنے کے لئے ان قوانین کو برقرار رکھا ہے جن میں سے بہت سے جاگیردار معروف سیاست دان بن چکے ہیں اِسی لئے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ ملک میں اصلاحاتِ اراضی کی کوششیں غیر مُنظم اور غیر مؤثر ثابت ہوتی رہی ہیں۔][7]

کیاوجہ ہے کہ پاکستان میں دنیاکا بہترین نہری نظام Irrigation System ہےاور پاکستان کے 68 فیصد علاقوں میں سالانہ برسات 250 Annual Rain Fall ملی میٹر ہےاور 24 فیصد علاقوں میں سالانہ برسات 500 ملی میٹر تک ہوتی ہےاور صوبہ پنجاب و سندھ میں اعلی درجے کی زرعی جامعات اپنی نئی نئی تحقیقات اخبارات میں شائع کراتی رہتی ہیں اور بے زمین ہاریوں میں زمین کی تقسیم، کاشتکار کے حقوق اور سبز انقلاب جیسے موضوع ہمارے "منتخب کردہ" نمائندوں اور زرائع ابلاغ کے دل پسند نعرے رہے ہیں پھر آج تک اس مسئلہ کے حل میں کوئی پیش رفت کیوں نہ ہو سکی؟

کیونکہ دین اسلام کو مکمل نظامِ زندگی کے طور پر نہیں اپنایا گیا جبکہ ربّ تعالی نے ہمیں حکم دیا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً

البقرۃ– 208

یعنی اہل ایمان کو اللہ عزوجل نے حکم دیا کہ اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اس طرح نہ کرو جو باتیں تمہاری مصلحتوں اور خواہشات کے مطابق ہوں ان پر تو عمل کر لو دوسرے حکموں کو نظر انداز کر دو بلکہ صرف اسلام کو مکمل طور پر اپناؤ اور آج کل کے سیکولر ذہن کی تردید بھی کرو جو اسلام کو مکمل طور پر اپنانے کے لئے تیار نہیں بلکہ دین کو عبادت یعنی مساجد تک محدود کرنا اور معاشیات و سیاسیات اور ایوان حکومت سے دین کو نکال دینا چاہتے ہیں۔

ایسے سیکولر ذہنوں کیلئے چند گزارشات ہیں ان پر عمل کر کے شاید وطن عزیز کے 1100,0000 لوگوں کی بھوک کا کچھ مداوا ہو سکے:

حاکم و محکوم کو صحیح معنی میں دین اسلامی کو اپنانا ہو گا کیونکہ اسلام کا حل ہمیشہ معتدل اصلاحی اور تعمیری ہوتا ہے کیونکہ اگر موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کا حل عوام نے اشتراکیت کے ساز باز سے نکالا تو وہ انتقامی اور تخریبی جراثیم کا حامل ہو گا۔

ایک متقی اور متدین حکومت ایسے موقع پر وقتی قوانین نافذ کر سکتی ہے، اس موضوع میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت ہمارے لئے نمونہ عمل ہے۔ انہوں نے تمام مفتوحہ علاقوں کی اراضی کی پیمائش کرائی جن میں مصر عراق و شام شامل تھے اور صرف عراق کی اراضی Million Hector30.65 تھی اس میں سے غیر آباد

زمینوں کیلئے حکم دیا کہ جو انہیں آباد کرے گا وہی ان کا مالک ہو گا اور اگر تین سال آباد نہ کرے گا تو زمین اسکے قبضہ سے نکل جائے گی۔

غریب لوگوں میں ہی زمین کی مناسب تقسیم کو یقینی بنایا جائے تاکہ ان بے زمین کسانوں کا شمار بھی زکاۃ اور محصولاتِ زراعت ادا کرنے والوں میں سے ہو سکے نا کہ سرمایہ داروں اور سرمایہ دار ممالک کو بنجر زمینیں آباد کرنے کے نام پر لاکھوں ایکڑ لیز کئے جائیں۔

Real Estate Sector کو بھی حکومتی سطح پر مجبور کیا جائے کہ وہ شہروں کے نزدیک زرعی اراضی کو کنکریٹ کے جنگلات میں تبدیل نہ کریں بلکہ حکومت کے ساتھ مل کر نئے شہروں کی تعمیر کریں جس کی کئی مثالیں مسلمانوں کے عہد قدیم سے ملتی ہیں جیسے بصرہ، کوفہ، موصل اور فسطاط وغیرہ۔

اور جب Government & Real Estate Sector بے زمین کسانوں کی مدد کیلئے قدم بڑھائیں تو ہمارے عام مضاربین Financers کو بھی چاہئے کہ بینکوں کے ائیر کنڈیشنڈ ڈیسک کی مضاربت چھوڑ کر اس شعبے میں اپنے محنت کشوں کو ان کے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد دیں اور بابرکت منافع بھی حاصل کریں۔

(3) اراضیِ اوقاف و متروکہ وغیرہ

ان میں وہ تمام اراضی شامل ہیں جو رفاہِ عام کے لئے مختلف جوانب سے وقف کی گئی ہوں اور واقفین نے حکومت کو اس پر نگران مقرر کیا ہو۔

اراضی متروکہ مصالح عامۃ الناس جیسے قبرستان وغیرہ کے لئے چھوڑی گئی اراضی کو کہا جاتا ہے انہیں حکومت نے چھوڑا ہو یا کسی نے ذاتی ملکیت سے متروکہ قرار دیا ہو۔

ایسی صورت میں وہ اراضی حکومت ہی کی ملکیت تصور کی جائیں گی لیکن حاکم ان اراضی کو کسی کی جاگیر میں نہیں دے سکتا۔

انفرادی یا شخصی ملکیت میں موجود اراضی

شریعتِ اسلامی نے ہر اس شخصی ملکیت کا احترام کیا ہے جو اس نے جائز اور مشروع طریقہ سے حاصل کی ہو مثلاً مورّث کی میراث سے، یا باہمی خرید و فروخت اور تبادلہ سے، یا سبقت اور پہل کر کے کسی دور افتادہ قطعہ زمین کو آباد کر کے اپنی ملکیت میں لے لے، یا حاکم نے اسے قطعہ زمین عطا کیا ہو، یا اسے زمین ہبہ یا وصیّت وغیرہ

کے ذریعے اسکی ملکیت میں آئی ہو نیز اس طرح کے تمام مباح طریقہ تملیک کو تسلیم کیا ہے اور مالک کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنی ملکیت میں مناسب تصرف کرے اور اس کا یہ عمل دوسروں کی معاشی تنگی کا سبب نہ بن پائے۔ اور شخصی ملکیت میں قبضہ، ظلم و جبر اور غصب کے راستے بالکل بند کر دیئے ہیں۔

ان أباسلمة حدثه أنه كانت بينه وبين أناس خصومة فذكر لعائشة رضي الله عنها فقالت يا أباسلمة اجتنب الأرض فإن النبي ﷺ قال من ظلم قيد شبر من الأرض طوقه من سبع أرضين

صحيح بخاری، باب من ظلم شيئاً من الأرض: 130/3

"بو سلمہ روایت کرتے ہیں کہ ان کے اور چند لوگوں کے درمیان ایک جھگڑا تھا انہوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بیان کیا، تو سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ ابو سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ زمین سے بچو اس لئے کہ نبی ﷺ کا فرمان ہے: "جس نے ایک بالشت بھر زمین کسی سے ظلماً لے لی تو اسے سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا"۔

امام مسلم کی بھی اسی معنی میں سعید بن زید سے روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ:

أن أروى خاصمته في بعض داره، فقال: دعوها وإياها، فإني سمعت رسول الله ﷺ، يقول: "من أخذ شبرا من الأرض بغير حقه، طوقه في سبع أرضين يوم القيامة" اللهم إن كانت كاذبة فأعم بصرها، واجعل قبرها في دارها، قال: "فرأيتها عمياء تلتمس الجدر تقول: أصابتني دعوة سعيد بن زيد، فبينما هي تمشي في الدار مرت على بئر في الدار، فوقعت فيها، فكانت قبرها

صحيح مسلم، باب تحريم الظلم وغصب الأرض وغيرها: 1230/3

"اروی نے ان سے گھر کے بعض حصہ کے بارے میں جھگڑا کیا تو انہوں نے کہا کہ اسے چھوڑ دو اور زمین اسے دے دو کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: " جس نے اپنے حق کے بغیر ایک بالشت بھی زمین لی تو اللہ تعالی قیامت کے دن اسے سات زمینوں کا طوق ڈالیں گے اے اللہ! اگر یہ جھوٹی ہے اسے اندھا کر دے اور اس کی قبر اس کے گھر میں بنا" راوی کہتے ہیں کہ " میں نے اسے اندھا اور دیواروں کو ٹٹولتے دیکھا اور کہتی تھی مجھے سعید بن زید کی بد دعا پہنچی ہے اس دوران کہ وہ گھر میں چل رہی تھی گھر میں کنوئیں کے پاس سے گزری تو اس میں گر پڑی اور وہی اس کی قبر بن گئی"۔

ایک اور جگہ بیان فرمایا کہ:

من أخذ من الأرض شيئا بغير حقه خسف به يوم القيامة إلى سبع أرضين

صحيح بخاري، باب من ظلم شيئاً من الأرض: 130/3

"جس نے کسی زمین پر ناحق قبضہ کر لیا تو اسے قیامت کے دن سات زمینوں تک دھنسایا جائے گا"۔

مندرجہ بالا احادیث تمام قسم کے ناجائز قبضہ جات کا انکار کر رہی ہیں حتیٰ کہ حکومت بھی مالک کی مرضی کے بغیر اس کی زمین نہیں خرید سکتی، عہد فاروقی کا قصہ علامہ شبلی نعمانی نے الفاروق میں نقل کیا ہے کہ " عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کی توسیع کیلئے عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ سے ان کا مکان خریدنا چاہا جو مسجد کے ساتھ تھا اور توسیع میں رکاوٹ بن رہا تھا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جائز قیمت دے کر مکان دے دیں۔ لیکن عباس اس بات پر راضی نہ ہوئے اور تنازعہ کی شکل پیدا ہو گئی آخر فریقین "حکومتِ وقت اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ" نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو ثالث مقرر کیا تو انہوں نے فیصلہ حکومت کے خلاف دے دیا اور جب سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے مقدمہ جیت لیا تو انہوں نے وہ مکان بلا قیمت ہی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو مسجد کی توسیع کیلئے دے دیا"۔

ملاحظہ کیجئے مکان حاصل کرنے کیلئے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد کتنا پاکیزہ تھا اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ بھی اس معاملہ میں انتہائی فراخ دل ثابت ہوئے۔اس مقدمہ سے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عام لوگوں کو یہ علم ہو جائے کہ شریعتِ اسلامی میں شخصی ملکیت کا کس قدر تحفظ ہے کہ حکومت وقت بھی اس کی ملکیت اس سے بذریعہ قیمت نہیں خرید سکتی جب تک مالک خود راضی نہ ہو جائے"۔

فضائل زراعت

اسلام ایک ایسا کامل و مکمل مذہب ہے، جو اپنے پیروکاروں کو زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ انسانی زندگی کے اس اہم شعبے **Agriculture** زراعت کے بارے میں راہ نمائی نہ کرتا جس کا آغاز ہی سے بنی نوع انسان کا تعلق رہا ہے، فی الواقع زراعت کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر زراعت نہ کی جائے تو غلہ کی پیداوار نہ ہو سکے جو انسان کی شکم پری کا بڑا ذریعہ ہے اسی لیے قرآن وحدیث میں اس فن کا ذکر بھی آیا ہے:

أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ﴿٦٣﴾ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ

الواقعة۔ 64/63

"بھلا دیکھو! جو بیج تم بوتے ہو تو اس سے کھیتی تم اگاتے ہو یا اگانے والے ہم ہیں۔ اس سے زیادہ فضیلت اور کیا ہو گی کہ جو بیج ہم زمین میں لگائیں اسے اگانے کو اللہ تعالی اپنی طرف منسوب کیا ہے، یہ کام کسان کا اللہ پر توکل بھی ثابت کرتا ہے"۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ

الاعراف-10

" ہم نے تمہیں زمین میں اختیار دیا اور تمہارے لیے اس میں سامان معیشت بنایا۔ مگر تم لوگ کم ہی شکر ادا کرتے ہو"۔

زمین سے منسوب معیشت میں زراعت سب سے پہلا طریقہ معیشت ہے جو اللہ نے انسان کو عطا فرمایا ہے اور زمین ربّ الکریم کا انسان پر ایسا عطیہ ہے جس سے بنی نوع انسان کے دو بنیادی اغراض وابستہ ہیں ایک کاشتکاری یا زراعت اور دوسری رہائش یا سکونت اور رسول اللہ ﷺ سے بھی زراعت کی اہمیت و فضیلت سے روشناس کرانے کیلئے آثار وارد ہیں۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"کوئی بھی مسلمان جو ایک درخت کا پودا لگائے یا کھیتی میں بیج بوئے، پھر اس میں سے پرندہ یا انسان یا جانور جو بھی کھاتے ہیں وہ اس کی طرف سے صدقہ ہے"۔[8]

اس حدیث کو امام مسلم نے یوں بیان کیا ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے ام مبشر نامی انصاری صحابیہ کا لگایا ہوا کھجور کا درخت دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو مسلمان کوئی درخت لگائے پھر اس سے آدمی یا پرندے یا جانور کھائیں تو یہ سب کچھ اس کی طرف سے صدقہ میں لکھا جاتا ہے"۔[9]

امام بخاری کی روایت کردہ حدیث میں مزید وسعت کے ساتھ لفظ " او یزرع زرعا" بھی موجود ہے یعنی کچھ بھی زراعت کرے چاہے باغ لگائے یا کھیتی کرے۔ تو اس سے جو بھی آدمی، جانور، فائدہ اٹھائیں اس کے مالک کے ثواب میں بطور صدقہ لکھا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یعنی اس حدیث میں باغبانی اور زراعت اور زمین کو آباد کرنے کی فضیلت مذکور ہے۔

مگر جو کاروبار فرائض اسلام کی ادائیگی میں حائل ہو، وہ الٹا وبال بھی بن جاتا ہے۔ کھیتی کا بھی یہی حال ہے کہ بیشتر کھیتی باڑی کرنے والے یادِ الٰہی سے غافل اور فرائض اسلام میں سست ہو جاتے ہیں۔اس حالت میں کھیتی اور اس کے آلات کی مذمت بھی وارد ہے۔

ابوامامہ باہلی سے مروی ہے کہ انہوں نے ہل اور کچھ کھیتی کے آلات دیکھے، تو کہا کہ میں نے نبی ﷺ سے سنا آپ فرماتے تھے:

لایدخل هذا بیت قوم إلا أدخله الله الذل

صحیح بخاری: باب مایحذر من عواقب الاشتغال بآلة الزرع أو مجاوزة الحد الذي أمر به: 103/3

"جس قوم کے گھر میں یہ داخل ہو، اس گھر میں اللہ ذلت داخل فرماتا ہے"۔

بہر حال مسلمان کو دنیاوی کاروبار کے ساتھ ہر حال میں اللہ کو یاد رکھنا اور فرائض اسلام کو ادا کرنا ضروری ہے۔

مزارعت کے متعلق احکام

اسلام کے معاشی نظام کے مثبت معاشی مقاصد میں غربت کا انسداد اور تمام انسانوں کو معاشی جدوجہد کے مساوی مواقع فراہم کرنا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اسلام سب کو حصول رزق کے مواقع عطا کرنے اور مثبت طور پر ایسی حکمت عملیاں بنانے کی تاکید کرتا ہے، جس سے غربت وافلاس ختم ہوں اور انسانوں کو ان کی بنیادی ضروریات لازماً حاصل ہوں اور مزارعت و مساقاۃ Agricultural Tanacy ، Sharecropping سرمایہ کاری کے ایسے معاہدے ہیں جن سے معاشرے کی پیداواری صلاحیتوں میں خاطر خواہ اضافہ کیا جاسکتا ہے اس لئے مزراعت زراعت کا انتہائی اہم شعبہ ہے جس کے شرعی قوائد وضوابط جاننا بہت ضروری ہے۔

تعریف و مشروعیت مزارعت

مزارعت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ:

المزارعة، المعاملة على الارض ببعض مایخرج منها

فقه السنة: 162/3

یعنی مزارعت سے مراد وہ معاملہ یا معاہدہ ہے جو زمین کی پیداوار سے کچھ حصہ پر زمین کی زراعت کیلئے کیا جائے۔

اور المخابرۃ سے بھی یہی مراد ہے اور کہا جاتا ہے کہ مسلمان جب خیبر کے یہودیوں پر غالب آ گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے خیبر کی زمینوں پر مزارعت کا معاہدہ کیا تو اسی کی مناسبت سے اس کا نام مخابرۃ ہو گیا تھا ورنہ دونوں میں اصلاً کوئی فرق نہیں۔

اسی طرح المساقاۃ آبپاشی Watering ہے اس میں مکمل زراعت نہیں بلکہ پہلے سے موجود کھجور یا دوسرے پھل دار درختوں میں پانی لگا کر کاشتکار مالک زمین سے طے کردہ حصہ وصول کرنے کا معاہدہ کرتا ہے۔

مشروعیتِ مزارعت

مزارعت کے بارے فقہاء کی دو آراء مشہور ہیں:

(1) ابو یوسف، محمد بن حسن، عامۃ المالکیہ والشافعیہ اور حنابلہ مزارعت کے جواز کے قائل ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "مزارعت صرف نقود کے عوض درست ہے" جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کا فرمان ہے "مزارعت مساقاۃ کے ساتھ جائز ہے علیحدہ نہیں"۔[10] جمہور ائمہ مذاہب اربعہ اور ائمہ حدیث کے نزدیک مزارعت [بٹائی، مخابرہ] درست ہے، اختلاف بعض صورتوں میں ہے یا اولویت میں۔

اس رائے کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

(1) قیس بن مسلم نے ابو جعفر سے روایت کی ہے کہ:

ترجمہ: " مدینہ میں کوئی ایسا مہاجر نہ تھا جو تہائی یا چوتھائی پر کاشت نہ کرتا ہو، علی، سعد بن مالک، عبداللہ بن مسعود، عمر بن عبدالعزیز، القاسم، عروۃ، آل ابی بکر، آل عمر، آل علی اور ابن سیرین سب نے مزارعت کی اور عبدالرحمٰن بن اسود فرماتے ہیں کہ میں عبدالرحمٰن بن یزید کے ساتھ مل کر کاشت کاری کرتا تھا، اور عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے اس شرط پر مزارعت کرائی کہ اگر عمر بیج دیں تو پیداوار میں آدھا لیں گے اور اگر وہ [کاشتکار] بیج اپنا استعمال کریں تو وہ اتنا لیں گے۔][11]

اس اثر سے واضح ہوتا ہے صحابہ کرام کی کثیر تعداد مزارعت کی قائل تھی بلکہ ہجرت کی شروعات سے ہی باجازتِ رسول اللہ ﷺ انصار رضی اللہ عنہم کے ساتھ کاشتکاری کرتے تھے، قاضی شوکانی صحیح کی سابقہ عبارت کے بارے میں فرماتے ہیں: " امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ صحابہ اور اہل مدینہ سے کوئی بھی مزارعت کے مخالف نہ تھا"۔][12]

صحیح بخاری ہی میں مروی ہے کہ:

(2) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انصار نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ ہمارے باغات ہم میں اور ہمارے مہاجر بھائیوں میں تقسیم کر دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا:

" لا"، فقال: "تكفونا المئونة ونشرككم في الثمرة"، قالوا: "سمعنا وأطعنا"

نيل الأوطار: باب المزارعة بالشطر ونحوه: 13/6

"نہیں" پھر انصار نے مہاجرین کو مخاطب کر کے کہا آپ باغات میں محنت کریں ہم پیداوار میں آپ کو شریک کرتے ہیں تو مہاجرین صحابہ نے فرمایا کہ : "ہمیں منظور ہے"۔

اور یہ معاہدہ انصار اور مہاجرین کے درمیان رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں ہوا تھا اگر جائز نہ ہوتا تو رسول اللہ اسی مجلس میں انکار کر دیتے بلکہ اس کے بعد جب اسلام غالب آگیا اور خیبر فتح ہوا تو خیبر کی زمینیں اور باغات یہود کو مزارعت کیلئے دیئے گئے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ:

أن النبي ﷺ عامل خيبر بشطر ما يخرج منها من ثمر أو زرع

صحيح بخاری: باب الشروط في المعاملة: 190/3

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی زمینیں نصف پیداوار پر مزارعت کیلئے دیں۔ قائلین مزارعت کی سب سے بڑی دلیل یہی رسول اللہ کا فعل ہے اور چونکہ خود رسول اللہ ﷺ کی آخری عمر تک اور عہد ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما تک یہی معاملہ رہا تا آنکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہود کو جلاوطن کر دیا"۔

امام علاء الدین کاسانی الحنفی اس حدیث کے بارے میں تعلیقاً فرماتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ کا فعل کم از کم جواز پر دلالت کرتا ہے اور یہی سیدنا علی، ابن مسعود، ابن عباس، عمر بن عبدالعزیز، قاسم، عروۃ، زھری، ابن ابی لیلیٰ اور ابن المسیب وغیرہ کا موقف ہے"۔[13]

اس دلیل پر اعتراض میں مانعین کہتے ہیں کہ خیبر کا معاملہ مزارعت کا معاملہ تھا ہی نہیں کیونکہ خیبر کو رسول اللہ ﷺ نے بزور شمشیر فتح کیا تھا لہٰذا خیبر کے یہود مسلمانوں کے غلام تھے آپ ﷺ پیداوار کا جو حصہ وصول کرتے تھے وہ بھی آپکا ہی تھا اور جو یہود کو دیتے تھے وہ بھی آپکا ہی تھا۔[14] اور یہ بھی کہا جاتا کہ خیبر کی زمین خراجی تھی۔

یہ اعتراض درست نہیں کیونکہ خیبر کا کچھ حصہ تو بزورِ شمشیر فتح ہوا تھا اور کچھ حصہ بغیر جنگ کے ہی فتح ہو گیا تھا اور مسلمانوں اور یہود کے مابین مصالحت اس بات پر ہوئی تھی کہ تمام زمینیں مسلمانوں کی ملکیت ہوں گی اسی لئے عہد فاروقی میں جب انہیں نکالا گیا تو خیبر کی آدھی زمین تو بطور مالِ فیٔ اسلامی مملکت کی تحویل میں آ گئی اور باقی مجاہدین اور امہات المومنین وغیرہ میں تقسیم کر دیا گیا اسے کسی طور پر بھی خراجی زمین قرار نہیں دیا جا سکتا۔ باقی رہا مزارعت کا معاملہ تو وہ زمین خراجی تھی یا غیر خراجی سب کا معاملہ مزارعت پر ہی ہوا تھا۔ امہات المومنین رضوان اللہ علیہن اجمعین نے بھی اپنی زمینیں مزارعت پر ہی دیں۔ مانعین مزارعت کی طرف سے کچھ اور بھی اعتراض کر کے اسے مزارعت سے نکالنے کی کوشش کی گئیں ہیں مگر ایسے اعتراض محض برائے اعتراض کئے جاتے ہیں لہٰذا ان کا جواب ضروری نہیں۔

(2) امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے شاگرد رُفر نے مزارعت مساقاۃ (آبپاشی کیلئے) اور کراء الارض (ٹھیکے پر دینا) کو منع فرمایا ہے۔][15

ہدایہ میں امام صاحب کے اس قول کا استدلال کچھ اس طرح سے کیا گیا ہے کہ:

اور انکی دلیل یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مخابرت سے منع فرمایا ہے جو مزارعت ہی ہے" اور کیونکہ یہ ایسا کرایہ ہے جس میں اجیر کی اجرت اس کے عمل میں سے ادا کی جاتی ہے اس طرح یہ قفیز الطحان جیسا معاملہ ہو جائے گا اور کیونکہ اس میں کرائے کی اجرت مجہول یعنی غیر مقدر ہوتی ہے تو یہ ہر طرح سے فاسد ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے اہلِ خیبر سے مزارعت کا جو معاملہ کیا تھا وہ بٹائی کے ذریعہ خراج وصول کرنا تھا اور مصالحت اور احسان میں وہ جائز ہے۔][16

اس استدلال کو ہم تین نکات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

1 نہی پر وارد حدیث مبارکہ۔

2 مزارعت کا اجرت پر قیاس۔

3 اراضی خیبر کو خراجی قرار دینا۔

(1) اس حدیث مبارکہ کو امام مسلم نے عبداللہ بن جابر سے روایت کیا ہے، انکے علاوہ رافع بن خدیج، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اجمعین سے [المخابرۃ، المزارعۃ، المساقاۃ اور کراء الأرض وغیرہ] کی ممانعت کی احادیث مروی ہیں اور ان تمام صحابہ سے کوئی نہ کوئی توجیہ بھی وارد ہے۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم ہی میں اس نہی کی توجیہ وارد ہے فرماتے ہیں کہ:

أن النبي ﷺ قال: من كانت له أرض فليزرعها، أو ليزرعها أخاه، ولا يكرها

صحيح مسلم، باب كراء الأرض: 1177/3

"اگر کسی کے پاس زمین ہے تو وہ اسے خود کاشت کرے ورنہ کاشت کیلئے اپنے بھائی کو دے دے اور اسے [بٹائی] یا ٹھیکہ پر نہ دے"۔

یعنی اس زمین پر کسی قسم کا منافع حاصل کرنے کے بجائے ازراہ تعاون اپنے غریب بھائی کو دے دے اور اس تعاون کی مثال ہمیں ہجرت کے بعد کے زمانے سے ملتی ہے کہ جب انصار صحابہ نے مہاجرین صحابہ کو زمین دینا چاہی وہ مکمل واقعہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اس کے بعد سب سے زیادہ روایت انصاری صحابی سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ:

كنا أكثر أهل المدينة حقلا، وكان أحدنا يكري أرضه، فيقول: هذه القطعة لي وهذه لك، فربما أخرجت ذه ولم تخرج ذه، "فنهاهم النبي ﷺ

صحيح بخاری، باب ما يكره من الشروط في المزارعة: 105/3

" اہل مدینہ میں ہمارے کھیت بہت زیادہ تھے ہم زمین کرایہ پر دیا کرتے تھے، اس شرط پر کہ زمین کے ایک حصہ کی پیداوار زمین کے مالک کے لئے ہو گی، تو کبھی اس حصہ زمین پر آفت آجاتی اور باقی محفوظ رہتا، چنانچہ اس سبب سے کہ بعض حصہ پر آفت آجاتی اور باقی حصہ محفوظ رہتا، ہم لوگوں کو اس سے منع کیا گیا۔

یعنی ان فاسد شروط کی بنا پر مزارعت اور ٹھیکے سے منع کیا گیا اسی قسم کے الفاظ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں:

رسول اللہ نے فرمایا: "اگر تم بلا معاوضہ ہی اپنے بھائیوں کو زمین دے دیا کرو تو یہ اس سے اچھا ہے کہ تم اس پر [بٹائی یا کرایہ] وصول کیا کرو"۔

اس عدمِ جواز کی توجیہ میں علماء ایک اور روایت ذکر کرتے ہیں زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رافع بن خدیج کو معاف فرمائے واللہ میں اس حدیث کو ان سے بہتر جانتا ہوں، واقعہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس دو انصاری لڑتے ہوئے آئے تو آپ نے فرمایا کہ:

إن كان هذا شأنكم فلا تكروا المزارع

سنن أبی داود: باب في المزارعة: 257/3

اگر تمہارا یہی حال ہے تو زمین ٹھیکہ پر نہ دیا کرو۔

اس روایت میں کراء الارض سے ممانعت کا سبب مذکور ہے اور اسی طرح کی ممانعت توجیہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مزارعت سے منع نہیں فرمایا البتہ یہ کہا ہے کہ آپس میں نرمی کا برتاؤ کیا کرو۔][17]

مندرجہ بالا توجیہات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سرے سے ہی مزارعت کی ممانعت وارد نہیں ہوئی بلکہ کچھ غلط اسباب اور فاسد شروط کی بناء پر نبی الرحمہ علیہ الصلاۃ والسلام نے اس سے منع کیا ہے اگر وہ نہ ہوں تو مزارعت جیسے معاہدوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(2)مزارعت کا اجرت پر قیاس

اس کا جواب قائلین اس طرح دیتے ہیں کہ مزارعت کا اجرت پر قیاس نہیں بلکہ مزارعت کا مضاربت پر قیاس کیا جانا چاہئے جو اجماع امت سے جائز ہے مزید تفصیل امام ابن قیّم کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ :انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ معاہدے اجارہ کی جنس سے ہیں، کیونکہ اس میں [عوض] اجرت کے بدلے [معوض] عمل ہے اور اجارہ میں عامل کا عمل اور اسکا عوض یعنی اجرت معلوم ہونا ضروری ہے پھر جب انہوں نے اس معاہدے میں عمل اور منافع غیر معلوم پائے تو کہا یہ خلاف قیاس ہے، یہی انکی غلطی ہے، کیونکہ یہ معاہدے مشارکت کی جنس سے ہیں نہ کہ معاوضتِ محض پر مشتمل ہیں جن میں عمل اور اجرت کا معلوم ہونا ضروری ہوتا ہے اور مشارکت مواجرت سے الگ ایک قسم ہے۔ اسی طرح جنہوں نے مزارعت اور مساقاۃ کو منع کیا ہے انہوں نے یہی سمجھا ہے کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں اجیر [عامل] کی اجرت مجہول ہے اور اسکا انکار کر دیا مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے کیونکہ مزارعت میں عامل اور مالک زمین کے نفع اور نقصان میں شریک ہوتے ہیں اور یہ عین عدل ہے اور ظلم و غرر سے انتہائی دور..[18] امام ابو یوسف نے بھی اپنی "کتاب الخراج" میں اسی قسم کی توجیہ بیان کی ہے کہ مزارعت کا معاملہ مضاربت کے جیسا ہی ہے، اس طرح قفیز الطحان کا معاملہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ جب وہ اجیر ہی نہیں تو مزارع اپنے عمل سے اپنی اجرت نہیں بلکہ اپنا حصہ وصول کرتا ہے جس پر وہ متفق ہوئے ہیں۔

-(3)اراضی خیبر کا خراجی قرار دینا

اراضی خیبر کا خراجی قرار دینا درست نہیں جس کی تفصیل اوپر بیان کی جاچکی ہے۔اور کتبِ فقہ حنفیہ میں امام صاحب کی ممانعت کے باوجود مزارعت کے مفصل احکام مذکور ہیں سید انور شاہ مرحوم جو حنفی مسلک کے مایہ ناز عالم دین ہیں اور انہوں نے متعدد معرکۃ الآراء مسائل پر کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں، درسِ حدیث کی تقریر کی جامعیت کا اندازہ " فیض الباری" سے کیا جاسکتا ہے۔ جو صحیح بخاری کی تقریر ہے اور چار ضخیم جلدوں میں شائع ہے، دو مختلف و معارض اقوال میں اپنی قوت استنباط کے زور سے بلاتکلف ایک کو دوسرے پر ترجیح دیدیتے تھے، وہ فیض الباری میں فرماتے ہیں کہ: "میں صاحب ہدایۃ کی مزارعت کے متعلق روش کو مدت تک نہ سمجھ سکا کہ ایک طرف تو وہ مزارعت کو ابو حنیفہ کے نزدیک ممنوع فرماتے ہیں اور صاحبین اور امام صاحب کا اختلاف نقل کرتے ہیں، جب امام کے نزدیک مزارعت درست ہی نہیں اس اختلاف اور فروع کے ذکر کی کیا ضرورت ہے؟" اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ "پھر حاوی القدسی سے معلوم ہوا کہ امام صاحب نے مزارعت کو مکروہ سمجھا ہے سختی سے منع نہیں فرمایا اسی حوالہ سے مجھے اطمینان ہو گیا"۔[19]

مندرجہ بالا سطور سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے مزارعت سے منع کرنے کی بنیادی وجہ باہمی مفادات میں عدم توازن اور محنت کرنے والے کا استحصال ہے اگر کسی کی حق تلفی نہ ہو تو اس معاہدے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

دیگر مسائل معاہدۂ مزارعت

مزارعین کی مشارکت: اگر مزارعت میں عامل یعنی مزارع کسی وجہ سے اپنا کام مکمل کرنے سے عاجز ہو تو اپنے ساتھ دوسرے عامل کو شریک کر سکتا ہے اور اسے اپنے حصے سے بٹائی ادا کرے جس پر بھی انکا اتفاق ہو، بشرطیکہ زمین کے مالک نے یہ شرط نہ لگائی ہو کہ صرف اول الذکر عامل ہی کام کرے اگر اس قسم کی شرط ہو تو پھر زمین کے مالک کی اجازت لازمی ہو گی۔[20]

فسخ معاہدہ مزارعت

اگر فصل تیار ہونے سے پہلے مالک معاہدے کو ختم کرنا چاہے تو وہ مزارع کو مثل نصیب [پیداوار سے اس کے حصے کے برابر] ادا کرے گا، کیونکہ وہی عامل کو کام کرنے سے منع کر رہا ہے جس کے عوض مزارع نے اپنا حصہ وصول کرنا تھا یہی شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا موقف ہے اور جبکہ دیگر علماء کرام کا موقف ہے کہ مثل اجرت ادا کی جائے گی، لیکن اگر مزارع خود ہی معاہدے کو ختم کرنا چاہے تو اس کے لئے پھر پیداوار سے کچھ ادا نہیں کیا جائے گا کیونکہ

وہ خود ہی اپنے حق سے دستبردار ہوا ہے بالکل اسی طرح جیسے مضاربت کا عامل منافع ظاہر ہونے سے پہلے ہی الگ ہو جائے تو منافع میں حصہ دار نہیں ہو گا، اور فسخ اگر اس وقت ہو جب فصل پکنے کے قریب ہو تو مالک اور مزارع دونوں اپنا مکمل حصہ وصول کریں گے جس پر انکا اتفاق ہوا تھا اور مزارع اپنا کام مکمل کرے گا، اگر عامل اتنی لا پرواہی کرے کہ پیداوار تباہ ہو جائے تو نقصان کا ذمہ دار وہی ہو گا اور اسی پر ضمان ہو گی۔

مالک اپنی اراضی فروخت کرنا چاہے تو کیا مزارع کو بھی کچھ مبلغ ادا کرے گا: اگر کچھ مزارع عرصہ دراز سے زمین کاشت کر رہے ہوں اور مالک زمین کو فروخت کرنا چاہے تو مزارعین کو کوئی حق نہیں کہ وہ زمیندار یا نئے خریدار سے کچھ عوض طلب کریں تاکہ ان کا جو ذریعہ معاش ختم ہو گیا ہے اس کی جگہ کوئی اور ذریعہ اختیار کر سکیں کیونکہ زمین کے جانے سے اگر انہیں کوئی ضرر پہنچا ہے تو اس میں مالک کی کوئی ذمہ داری نہیں اور کیونکہ ان کی شراکت مزارعت میں تھی ملکیتِ زمین میں نہیں، اور نہ ہی مزارعین زمین خریدنے کیلئے اس فروخت کی منسوخی کا مطالبہ کر سکتے ہیں مگر تعاون باہمی اور اچھے اخلاق کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر صاحب زمین اپنی ملکیت فروخت کرنا چاہے تو اپنے مزارعین سے بھی مشورہ کرے وہ خریدنا چاہیں تو ان سے تعاون کرے اور اگر خریدنے کی طاقت نہیں رکھتے اور کوئی دوسرا روزگار بھی نہیں رکھتے تو مالی طور پر بھی ان کی معاونت کرے۔

معاہدۂ مزارعت کو عدل پر قائم رکھنے کیلئے علماء نے کچھ شرائط بیان کی ہیں، جن کے اشتراط سے نہ زمیندار کا استحصال ممکن ہو پائے گا اور نہ ہی مزارع کی کسی قسم کی حق تلفی ہو گی وہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

(1) مزارع اور زمیندار دونوں عاقل بالغ [مکلف] اور مکمل اہلیت کے حامل ہوں، زمیندار زمین کا مالک ہو اور مزارع زراعت کر سکتا ہو۔

(2) زمین قابل کاشت ہو تاکہ کاشت کار محنت کر کے پیداوار میں حصہ دار ہو سکے، مساقاۃ میں پھل دار درختوں کا ہونا ضروری ہے۔

(3) زراعت کی جانے والی فصل اور طریقہ زراعت معلوم ہوں، کیونکہ کچھ فصلیں اور طریقہ کاشت آمدن اور منافع پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جو بعد میں اختلاف کا سبب بنتے ہیں۔

(4) زراعت کیلئے بیج اور آلات پر دونوں جس طرح متفق ہوں وہی درست ہے، بس کسی قسم کا بھی ضرر و غرر نہ پایا جائے۔

(5)پیداوار کی تقسیم فیصدی یا چوتھائی، تہائی، نصف کے طور پر اور تقسیم کا طریقہ کار طے شدہ ہو، مکمل پیداوار سے دونوں کے حصوں کی تقسیم ہو نہ کہ زمین یا فصل کے اعتبار سے حصے الگ الگ کئے جائیں۔ مثلاً زمیندار یہ کہے کہ پانی کے قریب والی فصل میری ہو گی اور فلاں قطع زمین کی کاشتکار کے حصہ میں آئے گی یا گندم کی فصل کاشت کار لے اور چاول کی زمیندار لے، اس طرح تقسیم سے احادیث میں منع کیا گیا ہے، کیونکہ ممکن ہے جس قطع کی پیداوار زمیندار چاہ رہا ہو وہاں پیداوار اچھی ہوتی ہو اور کاشت کار زمیندار کی باری کی بنسبت اپنی باری زیادہ محنت کرے۔

(6)مدت مزارعت معلوم ہو، اگر فصل کی مدت مکمل ہونے سے قبل زمیندار کاشت کار کو الگ کرنا چاہے تو مثلِ محنت ادا کرے۔

(7)زمیندار اور کاشتکار دونوں اس معاہدے میں ایک دوسرے کے شریک ہیں نہ ہی زمیندار کاشت کار کو اپنا غلام تصور کرے اور نہ ہی کاشتکار غصب کے ذریعے زمین کا مالک بننے کی کوشش کرے۔

خاتمہ

گزشتہ اوراق میں ذکر کردہ آیات واحادیث مبارکہ اور علماء اسلام کی پیش کردہ توجیہات اور تشریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں بنیادی وسائلِ معیشت میں سے زراعت کو بہت اہمیت دی گئی ہے، اور اسلامی حکومت کا یہ امتیاز رہا ہے کہ اس میں سرکاری اراضی کی انتہائی منصافانہ تقسیم کا طریقہ کار رائج ہو اور ملکیتِ زمین کے حوالے سے خاطر خواہ تشریعی احکام جاری ہوئے جن میں شخصی ملکیت کا احترام بھی ہے اور مزارع یا حکومت وقت کو غصب وانتہاب کی کسی صورت اجازت نہیں دی گئی اس میں نہ قدیم وجدید جاگیردارانہ نظام جیسی نظیر ملتی ہے کہ جس میں بڑے بڑے زمیندار کاشت کاروں کے جان ومال پر متصرف نظر آئیں اور نہ ہی اشتراکیت کی یہ جھلک نظر آتی ہے کہ جس میں زمیندار کو اس کے حق ملکیت سے ہی محروم کر دیا جائے۔ علاوہ ازیں معاہدہ مزارعت کی بھی اسی صورت اجازت دی گئی کہ جس میں زمیندار اور کاشتکار کا معاہدہ مزارعت میں دو شریک کاروں کی حیثیت میں سامنے آئیں اگر اس میں بھی افراد امت کے درمیان بغض اور عداوت اور ایک دوسرے کی حق تلفی کی صورت میں اسے بھی ممنوع قرار دیا ہے، غرض کہ اسلامی اقتصادی نظام میں معاہدہ مزارعت کا مقصد انفرادی اور اجتماعی تعاون وترابط اور تراحم کو مضبوط کرتا ہے تاکہ مسلمانوں کے درمیان باہمی اخوت اور محبت کا رشتہ قائم رہے اور اسکے لئے اسلامی معاشی نظام کو دوسرے نظاموں کو مشرف بالاسلام کرنے یا

ان سے کچھ مستعار لینے کی ضرورت نہیں وہ ہر قسم کے زمان و مکان کے لئے صالح اور موزوں ہے بس ضرورت ہے تو اسے نافذ کرنے کی، کہا جاتا ہے ایک مرتبہ مولانا عبید اللہ سندھی لینن سے ملے اور انہیں اسلامی نظام معیشت کے بارے میں بتایا تو لینن نے اعتراف کیا یہ واقعی انصاف پر مبنی نظام ہے لیکن مجھے کہیں زمین پر دکھا دیجئے میں اسے قبول کرلوں گا۔

[1] صحیح بخاري، باب من أحیا أرضاً..:3/ 106

[2] صبح النوری شرح مختصر القدوری 2/383

[3] معرفۃ السنن والآثار:9/ 8 3 صحیح بخاری، باب القطائع:3/ 114

[4] سلسلۃ الأحادیث الضعیفۃ:14/ 356

[5] سنن أبو داود: باب فی إقطاع الأرضین:3/ 173

[6] صحیح ابن حبان: ذکر ما یستحب للأئمۃ استمالۃ قلوب رعیتھم بإقطاع الأرضین لھم 10/ 351

[7] The World Bank Indicators for Pakistan Land use and The Woodrow Wilson International Center for Scholars.

[8] صحیح بخاري: باب فضل الزرع والغرس إذا أکل منہ:3/ 103

[9] صحیح مسلم: باب فضل الغرس والزرع:3/ 1188

[10] المغني:5/581، الأم:7/187

[11] صحیح مسلم شرح النووي: باب المساقاۃ والمعاملۃ بجزء من الثمر والزرع 5/453

[12] صحیح بخاری: باب المزارعۃ بالشطر....3/ 104

[13] صحیح بخاری: باب المزارعۃ بالشطر و نحوہ، صحیح مسلم: فی المساقاۃ باب المساقاۃ والمعاملۃ بجزء من الثمر والزرع

[14] بدائع الصنائع:5/254، المغنی:5/59

[15] نیل الأوطار:6/14

[16] الھدایۃ فی شرح بدایۃ المبتدي: کتاب المزارعۃ 4/ 337، الأم:4/18

[17] سنن ترمذی: باب ماجاء فی المزارعۃ

[18]إعلام الموقعين:1/ 290

[19]فيض الباري:2/481

[20]الشرح الكبير وحاشية الدسوقي:3/ 543

(5) قرض نادھندگی کے مسائل اور ان کا شرعی حل

عصر حاضر میں بینکوں اور مالیاتی اداروں میں بالخصوص اور معاشرتی سطح پر قرض خواہوں کو بالعموم ایک پیچیدگی اور مشکل کا سامنا ہے کہ قرضدار پیسہ لیکر واپس نہیں کرتے۔ معاشرے میں بددیانتی، کرپشن اور بے دینی کی وجہ سے صورت حال یوں ہو چلی ہے کہ پیسہ دینے والا واپس ملنے کی امید سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ضرورت مندوں کو قرضوں کے حصول میں بھی انتہائی مشکلات کا سامنا ہے۔ قرض خواہوں نے تو تلاش بسیار کے بعد جب انہیں کوئی حل سجھائی نہیں دیا تو معاصر قوانین نے یہ حل تجویز کیا کہ جو مقررہ وقت پر ادا نہ کرے اس پر جرمانہ لگا دیا جائے۔ اور معاہدے کے وقت قرضدار اور قرض خواہ اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اگر وہ وقت پر ادا نہ کر سکا تو جتنا قرضہ لیا ہے اس سے زیادہ ادا کرے گا۔ کمرشل بینکوں میں اسے سود میں شمار کیا جاتا ہے جبکہ اسلامی بینک اور ادارے اسے صدقہ کہہ دیتے ہیں۔ الغرض قرض لینے والا تاخیر کی صورت میں بہر صورت اصل رقم سے زیادہ ادا کرتا ہے۔ موجودہ مالیاتی سسٹم میں اس طریقہ کار کو ریکوری کیلئے اور قرض نادہندگی سے بچنے کیلئے بڑا کامیاب طریقہ تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس طریقے کو اگر شرعی نوعیت سے ہٹ کر بھی دیکھا جائے تو یہ آسودہ حال اور تنگ دست کو ایک ہی چھڑی سے ہانکنے کا فلسفہ ہے۔ جو ظلم اور استحصال پر مبنی ہے۔

اس سے بھی افسوسناک امر یہ ہے کہ ہم حل وہاں سے تلاش کرتے ہیں جہاں سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ اور جہاں سے حل ملنا ہے اس سے پہلو تہی اختیار کرتے ہیں۔

حل کہاں سے ملے گا؟

فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾

النساء:59

اگر کسی چیز پر اختلاف کرو تو اسے لوٹاؤ، اللہ تعالیٰ کی طرف اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف، اگر تمہیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے یہ بہت بہتر ہے اور باعتبار انجام کے بہت اچھا ہے۔

ہم بحیثیت ایک مسلمان کے یہ بات دعوی سے کہہ سکتے ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ نے ہر مسئلے کا حل تجویز کیا ہے۔ ضرورت صرف اسے اپنانے کی ہے۔

قرض نادہندگی کے مسائل کے لئے بھی اسلام نے بہت بہترین حل پیش کئے ہیں اور حفاظتی تدابیر بتائی ہیں۔

قرض کے اسباب: لوگوں کے قرض لینے کی چند بڑی وجوہات درج ذیل ہیں:

(1) تجارتی قرضے

(2) جرمانے اور مالیاتی سزاؤں کی ادائیگی کیلئے لئے جانے والے قرضے

(3) بنیادی انسانی ضروریات پورا کرنے کیلئے قرضے

(4) پر تعیش زندگی گذارنے کیلئے قرضے

لوگ قرضے واپس کیوں نہیں کرتے؟

وہ اسباب جن کی وجہ سے قرض خواہ کا پیسہ پھنس جاتا ہے۔ ادائیگی میں دشواریاں پیش آتی ہیں اسلام نے ان اسباب پر نظر رکھنے اور ہر سبب سے ایک مخصوص طریقے سے نپٹنے کے طریقے بتلائے ہیں۔

قرض کی عدم ادائیگی کے اسباب

(1) دیوالیہ ہو جانا۔ تنگ دستی:

وہ شخص جس کے قرض ادا نہ کر سکنے کی وجہ دیوالیہ ہو جانا یا کسی بھی قدرتی آفت یا بے اختیار سبب کے باعث تنگ دست ہو جانا جس کے بعد اس کیلئے قرض ادا کرنا ممکن نہیں ہوتا کیونکہ اس کے پاس ادائیگی کے لئے رقم ہی نہیں ہوتی۔

(2) مقروض کی بدنیتی کے باعث جان بوجھ کر ٹال مٹول سے کام لینا:

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ

صحیح البخاري: کتاب الاستقراض، باب مطل الغني ظلم

ترجمہ: "مالدار کا ادائیگی قرض میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے"۔

(3) مقروض کی موت:

اگر کسی انسان کی موت واقع ہو جائے تو اس کا اپنے مال سے تعلق ختم ہو جاتا ہے اور وہ اس کے ورثہ کے قبضے میں چلا جاتا ہے اور ان پر واجب ہے کے مال کی تقسیم سے پہلے اس (میت) کے تمام واجبات ادا کر دیں۔

لیکن اگر میت نے کوئی مال نہ چھوڑا ہو تو ان پر اس (میت) کے واجبات ادا کرنا لازم نہیں ہے جس کے سبب قرض کی ادائیگی پھنس جاتی ہے۔

(4) مقروض کا قرض سے مکر جانا:

اگر کوئی قرض لے کر مکر جائے کہ میں نے تو کوئی قرض نہیں لیا تو یہ بھی ایک بڑا سبب ہے جس سے قرض کی واپسی میں مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔

(5) روپے کی قدر گر جانا یا روپے کی مندی یا کرنسی کا لعدم کر دیا جانا:

اگر کسی ملک کی کرنسی ماند پڑ جائے یا اس کی قدر میں کمی واقع ہو جائے تو اس سے بھی قرض کی واپسی میں دشواری ہو جاتی ہے۔ کہ آیا اب قرض کی ادائیگی کس صورت میں کی جائے؟

قرض کی ادائیگی کو کیسے محفوظ بنایا جا سکتا ہے؟

شریعت کی جانب سے ادائیگی قرض کو یقینی بنانے کیلئے اختیار کئے جانے والے وسائل:

اسلام نے قرض کی واپسی کو محفوظ اور ممکن بنانے کے لئے چند ایسے رہنما ضابطے متعین کئے ہیں جن سے نہ صرف دیا گیا قرض محفوظ ہو جاتا ہے بلکہ اس کی واپسی بھی بہت آسان ہو جاتی ہے۔ یہ وسائل قرض دینے سے پہلے اختیار کرنے ضروری ہیں۔

مقروض کے قرض لینے سے مکر جانے کا حل

جو لوگ قرض لیکر مکر جاتے ہیں شریعت نے اس حوالے سے چند رہنما ضابطے متعین کئے ہیں جن کے اختیار کرنے سے مقروض کبھی بھی مکر نہیں سکتا۔

(1) قرض کے معاہدہ کو تحریر کیا جائے:

قرض کے معاہدہ کو تحریر کرنا مشروع عمل ہے جس کا اللہ تعالی نے حکم بھی دیا ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾

البقرۃ: 282

ترجمہ: ”اے ایمان والو! جب تم کسی مقررہ مدت کے لیے ادھار کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔“

قرض کے معاہدہ کو لکھنے میں بہت سی حکمتیں اور فوائد پنہاں ہیں:

مال محفوظ ہو جاتا ہے اب کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ میں نے قرض نہیں لیا۔
تنازعات اور اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ بعض دفعہ مکرنے والا پورے قرض سے نہیں مکرتا بلکہ فریقین میں اختلاف ہو جاتا ہے کہ کتنی رقم دی گئی تھی۔ اور اس کی واپسی کا کیا طریقہ کار طے تھا۔ جس سے فریقین میں ناختم ہونے والے جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر قرض کا معاہدہ لکھا ہو گا تو ظاہر ہے اس میں قرض کی رقم، اس کی مدت، ادائیگی کا طریقہ کار، اور وقت ضرور تحریر ہو گا جس سے نزاع ختم ہو جائے گا۔
فاسد و باطل معاملہ سے بچاؤ ممکن ہو جائے گا۔
شکوک شبہات سے بچا جا سکتا ہے۔
کیا تھوڑے قرضے کو بھی لکھا جائے؟
ہمارے معاشرے میں ایک بہت بڑی خرابی در آئی ہے کہ لوگ کم قرض کو لکھتے ہی نہیں کہتے ہیں کہ بھائی چند سو ہی تو ہیں لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ یا پھر اس وجہ سے بھی نہیں لکھتے کہ جس کو قرض دے رہے ہیں وہ بڑا نیک یا قریبی رشتہ دار ہے دینے والے کو اس پر اندھا اعتماد ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی اعتماد بعد میں بداعتمادی میں بدل جاتا ہے۔ سیکڑوں لوگ اس وجہ سے رو رہے ہیں کہ انہوں نے کسی شخص کو محض اعتماد کی بنا پر قرض دیا اور کوئی لکھت پڑھت نہیں کی۔ مگر اگر شرعی اصولوں کو دیکھا جائے تو قرض کے لکھنے کے جو احکامات ہیں یہ سب سے پہلے صحابہ کرام پر نازل ہوئے اور قرآن کریم کے سب سے پہلے مخاطب وہی تھے۔ اور یہ لکھنے کا حکم سب سے پہلے انہی صحابہ کو دیا گیا تھا۔ تو کیا کوئی شخص صحابہ کے اعتماد اور امانت میں شک کر سکتا ہے؟ (حاشا و کلا) لیکن اس کے باوجود بھی لکھنے کا کہا گیا کیونکہ شیطان ابن آدم کے وجود میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔ ہم نے جب شرعی اصول کو چھوڑ کر اعتمادوں کی فضا میں بسیرا کیا تو وہاں سے ہمارے اعتمادوں کو ٹھیس پہنچنے لگی۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ خاندان بچھڑ گئے، رشتہ داریاں ختم ہو گئیں، دوستیاں دشمنیوں میں بدل گئیں، جس کا سبب یہی اندھا اعتماد تھا۔
اور یہ ضروری نہیں کہ لکھی صرف بڑی رقم جائے بلکہ قرآن مجید نے تو حکم دیا کہ:
﴿وَلَا تَسْأَمُوا أَن تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا﴾
البقرۃ:282

ترجمہ: " اور قرض کو جس کی مدت مقرر ہے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو لکھنے میں کاہلی نہ کرو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات بہت انصاف والی ہے اور گواہی کو بھی درست رکھنے والی ہے شک وشبہ سے بھی زیادہ بچانے والی ہے۔"

(2)قرض کے لین دین میں گواہ بنانا

شواہد اور گواہ بنانا بھی مستحب عمل ہے جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ﴾

البقرۃ:282

ترجمہ:"اور اپنے میں سے دو مرد گواہ رکھ لو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جنہیں تم گواہوں میں پسند کر لو تاکہ ایک کی بھول چوک کو دوسری یاد دلادے۔"

گواہ بنانے کی حکمت جیسا کہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے کہا:" اس لئے کہ یہ جھگڑے کے امکان کو دور کرتا ہے اور انکار سے بھی بچاتا ہے"۔

قرضوں کو دیوالیہ اور تنگ دستی کے مسائل سے محفوظ کرنے کا شرعی طریقہ

(1)رھن (گروی) رکھی جائے

اگر کسی قرض دینے والے کو خدشہ ہو کہ فلاں کو قرض دے رہا ہوں اس کا دیوالیہ ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟۔اس کے لئے شریعت نے حل بتایا کہ قرض دیتے وقت اس شخص سے کوئی چیز گروی رکھوالو۔

رھن سے بھی قرض دینے والے کو اطمینان ہوتا ہے کہ اگر اس کا مال واپس نہ ملا تو اس کا نقصان اس گروی سے پورا ہو جائے گا چنانچہ اللہ تعالی فرماتا ہے:

﴿وَإِن كُنتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَّقْبُوضَةٌ﴾

البقرۃ: 283

ترجمہ:"اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو رہن قبضہ میں رکھ لیا کرو۔"

اور حدیث میں آتا ہے کہ " نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے ایک مدت مقرر کر کے اناج خریدا اور لوہے کی ایک زرہ اس کے پاس گروی رکھی"۔[1]

(2)ضمانت (کفالت) لینا

گروی کے علاوہ ضمانت اور کفالت کا طریقہ بھی قرض کو محفوظ بناتا ہے۔ لہذا قرض دینے والا قرض دیتے وقت کسی کی ضمانت سے قرض دے۔

اللہ تعالی نے ضمانت کو بھی مشروع قرار دیا ہے فرمان باری تعالی ہے کہ:

﴿وَلِمَن جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ﴾

یوسف:72

جواب دیا کہ شاہی پیمانہ گم ہے جو اسے لے آئے اسے ایک اونٹ کے بوجھ کا غلہ ملے گا۔ اس وعدے کا میں ضامن ہوں۔

ضمانت میں یہ حکمت ہے کہ قرض دینے والے کے لئے امید ہے کہ اسے اس کا دیا ہوا مال واپس مل جائے گا۔

مقروض کی بدنیتی اور ٹال مٹول سے قرضوں کو کیسے محفوظ کیا جا سکتا ہے؟

اس حوالے سے پہلی اقسام میں ذکر کردہ ضابطوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ قرض کو لکھا جائے، اس پر گواہ بنائے جائیں اور ممکن ہو تو گروی اور ضمانت بھی لی جائے تاکہ ٹال مٹول کی صورت میں نقصان کی تلافی کی جا سکے، نیز اس کے علاوہ بھی شریعت نے چند سزائیں متعین فرمائی ہیں جن سے نقصان بآسانی پورا کیا جا سکتا ہے۔

ٹال مٹول کرنے والے مقروض سے قرض کی واپسی کیلئے کئے جانے والے قانونی اقدامات:

(1)اسے فاسق قرار دیا جانا اور گواہی مسترد کرنا

(2)عزت و وقار کو مجروح کرنا

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ”مال دار کا ٹال مٹول کرنا اس کی عزت اور سزا کو حلال کر دیتا ہے۔

اہل علم نے عزت کے حلال ہونے میں جو توجیہات بیان فرمائی ہیں وہ یہ ہیں:

اس سے سخت زبان استعمال کی جائے۔ لوگوں میں اس کے بارے میں بطور شکوہ ذکر کیا جانا کہ یہ شخص پیسہ لیکر استطاعت کے باوجود واپس نہیں کر رہا۔ اس کے ساتھ سخت کلامی کی جائے۔ اس کی ملامت اور مذمت کی جائے اور لوگوں میں اس کے ظلم کو بطور شکایت ذکر کیا جائے۔

نیز عصر حاضر میں ایسے نادہندہ افراد کے ناموں کو بلیک لسٹ اور پبلک کیا جانا چاہئے اور تمام اداروں کو جو قرض کے معاملات کرتے ہیں مطلع کیا جائے۔ اور ممکن ہو سکے تو اخبارات میں بھی ایسے افراد کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جو ہٹ دھرمی اور ناانصافی کی وجہ سے استطاعت ہوتے ہوئے بھی ادائیگی نہیں کر رہے۔

(3) قید میں ڈالنا اور سزا دینا

امام بیہقی نے امام سفیان سے نقل کیا ہے کہ دولت مند شخص کا قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا اس کی سزا حلال کر دیتا ہے اور سفیان نے فرمایا کہ اس کی سزا یہ ہے کہ اس کو قید میں بند کر دیا جائے۔]2[

امام عبداللہ ابن مبارک، امام علی الطنافشی، حافظ ابن حجر، امام شعبی، قاضی شریح رحمہم اللہ و دیگر نے بھی اس کی یہی سزا تجویز کی ہے۔

(4) سفر پر پابندی لگا دی جائے

اگر مقروض کے سفر کے باعث قرض خواہ کی حق تلفی کا اندیشہ ہو تو قرض خواہ اس کو سفر سے رکوانے کا حق رکھتا ہے۔

(5) رہن رکھی ہوئی چیز کو فروخت کر دیا جائے

(6) حاکم وقت ٹال مٹول کرنے والے مقروض کے مال سے جبراً وصولی کر سکتا ہے۔

(7) حاکم وقت قرض کی ادائیگی کیلئے مقروض کی پراپرٹی فروخت کر سکتا ہے۔

(8) اگر مقروض کے پاس ایسی پراپرٹی ہے جسے فروخت نہیں کیا جا سکتا تو حاکم وقت اسے کرائے پر دے کر اس کرایہ سے قرض خواہ کو ادائیگی کر سکتا ہے۔

(9) اگر قرضہ خرید و فروخت کی شکل میں ہے کہ مقروض نے قرض خواہ سے کوئی چیز ادھار خریدی اور اب ادائیگی نہیں کر رہا تو قرض خواہ معاہدہ منسوخ کر کے اپنی چیز واپس لے سکتا ہے۔

(10) اگر قرض نہ ادا کرنے کی وجہ سے معاملہ کورٹ میں چلا گیا تو بعض فقہاء نے یہ قرار دیا ہے کہ وہ تمام خرچہ جو کیس پر قرض خواہ کی جانب سے ہو گا (وکالت، و دیگر اخراجات) یہ سب مقروض شخص کو ادائیگی کا پابند کیا جائے گا۔

(11) ٹال مٹول کرنے والے کو اگر کوئی چیز قسطوں میں بیچی گئی ہے تو اس سے یہ شرط لگانا جائز ہے کہ اگر ٹال مٹول کیا تو تمام قسطیں یک مشت ادا کرنی پڑیں گی۔

(12)ٹال مٹول کرنے والے نادہندہ افراد کو کوئی ادارہ قرض فراہم نہ کرے۔

تنگ دستی کی وجہ سے جو ادائیگی نہ کر سکے اس کا کیا حل کیا جائے؟

اگر کوئی شخص مفلس ہو گیا ہے۔اور وہ چاہتے ہوئے بھی ادائیگی نہیں کر پا رہا تو شریعت ہمیں تعلیم دیتی ہے کہ:

(1)اس کے ساتھ نرمی کی جائے اور اسے کچھ مہلت دے دی جائے۔اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿وَإِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾

البقرۃ:280

ترجمہ:اور اگر مقروض تنگ دست ہے تو اسے اس کی آسودہ حالی تک مہلت دینا چاہیے۔

(2) نیکی اور خیر خواہی کے جذبہ کے تحت تمام قرض یا اس کا کچھ حصہ معاف کر دینا چاہئے۔فرمان باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَأَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

البقرۃ:280

ترجمہ:اور اگر (راس المال بھی) چھوڑ ہی دو تو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔اگر تم یہ بات سمجھ سکو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:ایک تاجر لوگوں کو قرض دیتا تھا جب کسی کو تنگ دست پاتا تو اپنے نوجوانوں سے کہتا کہ اس کو معاف کر دو شاید کہ اللہ تعالی ہم لوگوں کو بھی معاف کر دے چنانچہ اللہ تعالی نے اس کو بھی معاف کر دیا۔]3[

لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ مقروض کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے بلکہ اس کی مشکل کا حل بھی تلاش کرنا چاہئے تاکہ وہ بھی معاشرے کے استحکام میں کوئی کردار ادا کر سکے،اور اس کے ضعف کا سبب نہ بنے۔

تنگ دست مقروض کی مشکلات کا حل

(1)تنگ دست کی امداد کی جائے

مقروض اور محتاج کو غارمین کے حصہ کی زکوۃ میں سے بھی امداد کی جا سکتی ہے جیسا کہ فرمان باری تعالی ہے:

﴿إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ﴾

التوبة:60

ترجمہ:"صدقات تو دراصل فقیروں مسکینوں اوران کارندوں کے لئے ہیں جوان (کی وصولی) پر مقرر ہیں۔ نیز تالیف قلب غلام آزاد کرانے قرضداروں کے قرض اتارنے کے لئے۔"

(2)بیع یا معاہدہ کو ختم کیا جائے اور دی ہوئی چیز واپس لے لی جائے

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: جس شخص نے اپنا مال کسی آدمی کے پاس بعینہ پالیا، جو مفلس ہو گیا، تو وہ اس مال کا زیادہ مستحق ہے"۔]4[

(3)قاضی یا حاکم مقروض مفلس کو جبرا کمانے کا حکم دے

جیسا کہ اللہ تعالی کا حکم ہے:

﴿وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾

الجمعة:10

اور فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:" تم میں سے کوئی شخص رسی لے اور لکڑی کا گٹھا اپنی پیٹھ پر اٹھا کر اس کو بیچے اور اللہ تعالی اس کی عزت کو محفوظ رکھے، تو یہ اس کے لئے اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے مانگے اور وہ اسے دیں یا نہ دیں"۔]5[

(4)اپنے مال کے استعمال سے روک دیا جائے

جس شخص کے ذمہ واجب الادا قرضہ ہو اسلامی عدالت خود ہی یا قرض خواہوں کے مطالبے پر مقروض کو اپنے مال میں تصرف کرنے سے روک دیتی ہے۔

جسے فقہ اسلامی میں (الحجر) کہا جاتا ہے۔

امام حاکم اور امام دار قطنی نے سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ: بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو اپنے مال میں تصرف سے روک دیا تھا اور ان کے ذمے قرض کی (ادائیگی) کے لیے اس کو فروخت کر دیا تھا]" 6[

قرضوں کے مسائل حل کرنے اور ان کی وصولی ممکن بنانے کیلئے چند اہم سفارشات:

(1)صرف بنیادی ضروریات یا تجارت کیلئے قرض دیا جائے۔ پر تعیش اشیاء کی خریداری کیلئے قرضے نہ دئے جائیں۔

(2)قرض دینے سے پہلے قرض لینے والے شخص کی مالی پوزیشن کا جائزہ لے لینا چاہئے کہ یہ ادا کر بھی پائے گا یا نہیں۔

(3)قرضوں کی واپسی کیلئے قرآن وسنت کی روشنی میں قانون سازی کی جائے۔

(4)ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کیلئے بیت المال نظام کو فعال کیا جائے تاکہ ضرورت مندوں کی ضرورتیں وہاں سے پوری کی جائیں اور انہیں قرض لینے کی نوبت ہی نہ آئے۔

(5)قرض لینے والے قرضہ انتہائی مجبوری کی حالت میں لیں۔اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز میں قرض سے پناہ مانگا کرتے تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز میں دعا کیا کرتے تھے اور کہتے تھے:

اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ

"اے اللہ! یقیناً میں گناہ اور قرض سے آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔"

(6)قرض دینے سے پہلے تمام شرعی اور قانونی ضابطے پورے کر لئے جائیں۔ جن میں قرض کے معاہدہ کا لکھنا، قرض پر گواہ بنانا، بطور گروی کوئی چیز رکھنا، ضامن متعین کرنا، اور مقروض کی مالی پوزیشن کو مد نظر رکھتے ہوئے قرضہ دیا جانا چاہئے۔

(7)جان بوجھ کر ٹال مٹول کرنے والے قرض نادہندگان کو بلیک لسٹ کیا جانا چاہئے اور کوئی ادارہ بعد ازاں انہیں قرض فراہم نہ کرے۔

(8)عوام میں شعور وآگہی کیلئے قرض سے متعلق خوف وڈر کی شرعی آیات واحادیث کی تعلیم دی جانی چاہئے۔ کہ جس میں مقروض کی نماز جنازہ نہ پڑھانا، موت کے بعد انسان کی مغفرت کا ادائیگی قرض تک روک لیا جانا، وغیرہ شامل ہیں۔

(9)مالیاتی ادارے اور بینک جو ہاؤس فائنانسنگ اور لیزنگ پر گاڑیاں دینے کیلئے قرضے دیتے ہیں انہیں کم بلکہ ختم کیا جانا چاہئے اور صرف بغیر چھت کے رہنے والوں کو بقدر ضرورت قرض دیا جائے۔

(10) مقروض کو بطور قرض لی ہوئی رقم سے زیادہ کی ادائیگی کا پابند نہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ سود ہے اور سود کی حرمت قطعی اور اٹل ہے۔ محض نام بدلنے سے حقائق نہیں بدل جاتے۔

؎ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے ترا حسن کرشمہ ساز کرے

موجودہ مالیاتی ادارے اور بینک مقروض پر تعزیری طور پر نقد جرمانہ لگاتے ہیں جسے وہ فقراء و مساکین میں تقسیم کرنے کا کہتے ہیں۔ اور خود نہیں لیتے کہتے ہیں خود لے لیا تو یہ سود بن جائے گا۔ انہیں علم ہونا چاہئے کہ جہاں سود لینا حرام وہاں دینا بھی حرام ہے اور کسی فرد کو سود دینے کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔

(11) اسلامی شریعت نے قرض کی واپسی کے لیے جو متعدد اخلاقی اور قانونی اقدامات کئے ہیں ان پر عمل درآمد کیا جانا چاہئے جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) عدم ادائیگی اور تاخیر کا ظلم ہونا (2) ٹال مٹول کرنے والے مقروض کا فاسق قرار پانا اور اس کی گواہی مسترد ہونا (3) عزت کا مباح ہونا (4) قید میں ڈالنا (5) سفر پر پابندی عائد کرنا
اپنے مال کے استعمال سے محرومی (6) رہن شدہ چیز کی فروختگی (7) قرض خواہ کا مفلس کے ہاں اپنے موجود مال کا زیادہ حق دار ہونا (8) مقروض میت کی وصیت پر عمل قرض کی ادائیگی کے بعد ہونا (10) تقسیم وراثت کا ادائیگی قرض کے بعد ہونا (11) ضامن کا تقرر (12) حوالہ دین کی بنا پر ذمہ داری قبول کرنے والے کا ادائیگی کا پابند ہونا۔

(12) بینک یا مالیاتی ادارے نے اگر قسطوں پر چیز بیچی ہے تو وہ معاہدہ میں یہ شرط طے کر سکتے ہیں کہ اگر بلاوجہ مقروض نے قسطیں ادا نہ کیں، یا ٹال مٹول کیا تو اسے تمام اقساط یک مشت ادا کرنی پڑیں گیں۔

(13) قرض لینے والا اگر حقیقت میں مفلس اور تنگ دست ہو گیا ہو تو اسے مہلت دینی چاہئے۔ ہو سکے تو اسے کچھ یا تمام قرض معاف کر دینا چاہئے۔

(14) عوام الناس کی بالعموم اور قرض لینے والے کے رشتہ داروں کی بالخصوص یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ مقروض کی اعانت کریں اور یہ اعانت زکوٰۃ و صدقات میں سے بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی قرض ادائیگی میں مدد کریں۔

(15)نادار شخص کے قرض کی ادائیگی کے سلسلہ میں اسلامی ریاست کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ایسے افراد کی مدد کرے اور ان کا قرضہ اپنے ذمہ لے۔

امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، کہ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کسی ایسی میت کو لایا جاتا، جس پر قرض ہوتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: ''کیا اس نے اپنے قرض ادا کرنے کے لیے کچھ چھوڑا ہے؟'' پھر اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا جاتا، کہ اتنا مال چھوڑا ہے، کہ اس سے قرض ادا ہو سکتا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نماز (جنازہ) پڑھاتے، وگرنہ مسلمانوں سے فرماتے: ''اپنے ساتھی کی نماز (جنازہ) پڑھ لو''۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فتوحات کے دروازے کھول دیئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں ایمان والوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتا* ہوں۔ اس لیے (اب) جو بھی اہل ایمان میں سے وفات پا جائے اور اس کے ذمہ قرض ہو، تو اس کا ادا کرنا میرے ذمہ ہے۔ اور جو کوئی مال چھوڑے، تو وہ اس کے وارثوں کے لیے ہے''۔

عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے عراق میں عبد الحمید بن عبد الرحمٰن کو لکھا کہ '' تم دیکھو، کہ ہر وہ شخص جس نے بیوقوفی کے کاموں یا اسراف سے خرچ کرنے کے لیے قرض نہ لیا ہو، اس کی طرف سے قرض ادا کر دو۔''

(16)بیت المال سے مقروض کی اعانت کیلئے تین شرائط کا ملحوظ رکھا جانا ضروری ہے۔

(1) قرض لینے کا معقول اور جائز سبب کا ہونا۔

(2) ادائیگی قرض کے لیے مقروض کی تا حد استطاعت کوشش۔

(3) بیت المال میں مال کی موجودگی۔

یہ قرض نادہندگی کے چند اہم مسائل ان کا حل اور نظام قرض کی بہتری کیلئے چند اہم سفارشات تھیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نظام معیشت کو شرعی خطوط پر استوار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ انہ ولی التوفیق

وصلی اللّٰہ وسلم علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین

[1]صحیح البخاری: کتاب الرھن، باب الرھن فی الحضر

[2]فتح الباری: ج ص62

[3]صحیح البخاری: کتاب القراض

[4]صحیح البخاری:باب فی الإستقراض وأداء الدیون،باب إذا وجد مالہ عند مفلس

[5]صحیح البخاری: کتاب البیوع،باب کسب الرجل وعملہ بیدہ

[6]مستدرك علی الصحیحین: کتاب البیوع۔امام حاکم نے اس کو صحیحین کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے

(6) قرضوں کی اشاریہ بندی

کاغذی کرنسی سے پیدا شدہ مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ افراطِ زر (Inflation) کا بھی ہے۔ معاشی تکنیک کے حوالے سے افراطِ زر ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کی جملہ وجوہات کا احاطہ کرنا یہاں مقصود نہیں، البتہ کاغذی کرنسی اور افراطِ زر کے درمیان جو لازمی تعلق ہے، اسے آئندہ سطور کے حوالے سے پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

افراطِ زر کے مسئلے کی کوئی ایک جہت نہیں بلکہ معاشیات کی اصطلاح میں یہ ایک ہمہ جہت مسئلہ ہے۔ مثال کے طور پر کاروباری قرضوں، تنخواہوں، امانتوں اور بچتوں سمیت کئی معاملات میں افراطِ زر کے مسائل درپیش ہیں۔ ان مسائل پر قابو پانے کے لئے اقتصادی ماہرین جو حل تجویز کرتے ہیں ان میں عام طور پر سب سے مقبول اور سب سے زیادہ کامیاب تصور کئے جانے والے حل کو اشاریہ بندی (Indexation) کہتے ہیں یعنی اشاریہ بندی کے ذریعے افراطِ زر کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسئلے کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔

افراطِ زر کے نتائج اور اشاریہ بندی کی تکنیک کو سمجھنے کے لئے اس عام مثال پر غور کریں

زید نے بکر سے 10000 روپے 1990ء میں اس وعدہ پر قرض لئے کہ یہ رقم 1994ء میں واپس کر دی جائے گی۔ 1994ء میں جب یہ رقم واپس کی گئی تو قوتِ خرید میں کمی کے باعث 10000 روپے کی رقم حقیقتاً 8000 روپے کے برابر آ چکی تھی۔ بالفاظِ دیگر چار سال کے عرصے میں افراطِ زر نے جو صورت اختیار کی اس کی وجہ سے 10000 روپے رقم کی حقیقی قیمت میں کمی واقع ہوئی اور اس کے نتیجے میں بکر کو (قوتِ خرید میں کمی کے باعث) 2000 روپے کا خسارہ برداشت کرنا پڑا۔

معاشیات میں اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اشاریہ بندی کا طریقہ کار استعمال کیا جاتا ہے، یعنی "معاشی تخمینہ لگا کر ایسا توازن بروئے کار لانا جس کی وجہ سے قوتِ خرید میں جو کمی ایک مقررہ مدت کے درمیان واقع ہوئی ہے اس کو دور کیا جائے" یہ حل اشاریہ بندی کہلاتا ہے۔

مذکورہ بالا تکنیک اشاریہ بندی کی مکمل تعریف نہیں بلکہ اس کی تفہیم کے لئے ایک مثال ہے۔ اشاریہ بندی کی مخصوص تعریف کا ذکر آگے ہو گا جہاں اس کے لئے استعمال میں آنے والے طریقہ ہائے کار کی بھی وضاحت کی جائے گی۔

اشاریہ بندی (Indexation) کیا ہے؟

پال۔اے سموئل سن (Paul A.Samuelson) کے مطابق

"Indexation is(a mechanism by which wages, prices and contracts are partially or wholly adjusted to compensate for changes in the general price level'[1]

"اشاریہ بندی ایک ایسا طریقہ کار ہے جس کے ذریعے قیمتوں کی عام سطح میں تبدیلیوں کی تلافی کرنے کے لئے تنخواہوں، قیمتوں اور معاہدات میں جزوی یا کلی توازن پیدا کیا جاتا ہے"۔

جبکہ جے ایل ہانسن (J.L. Hansan) کے مطابق:

"A System of relating income especially from investment the retail price index in a time of inflation in order to offset the fall in the value of money".[2]

"ایک ایسا نظام جس میں بالخصوص سرمایہ کاری سے حاصل ہونیوالی آمدن کا افراطِ زر کے وقت قیمتوں کی پرچون سطح سے اس طرح تعلق قائم کرنا تاکہ روپے کی قدر میں کمی کا ازالہ کیا جاسکے"

مندرجہ بالا دونوں اور اسی نوعیت کی دیگر تعریفات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ افراطِ زر کی بنا پر تنخواہوں ، قیمتوں اور معاہدات کو جو خطرات لاحق ہوتے رہتے ہیں ان سے پیدا شدہ نقصانات کو دور کرنے کے لئے جو طریقہ کار استعمال کیا جاتا ہے اسے اشاریہ بندی کہتے ہیں۔

کرنسی کی قوتِ خرید میں کمی کے علاج کے لئے ہر حل "اشاریہ بندی" نہیں کہلاتا یہاں یہ امر خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ اشاریہ بندی کے لئے چند مخصوص طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ افراطِ زر سے قوتِ خرید میں جو کمی واقع ہوتی ہے اس کے علاج کے لئے تجویز کردہ ہر طریقے کو اشاریہ بندی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ وضاحت اس لئے بھی ضروری ہے کہ سپریم کورٹ میں حافظ عبدالرحمن مدنی کے بیان کے حوالے سے جو غلط فہمی انجینئر سلیم اللہ اور بعض دوسرے حضرات کو لاحق ہوئی ہے، وہ دراصل اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ افراطِ زر کا ہر ممکنہ حل اشاریہ بندی کی طرف جاتا ہے۔ اس بارے میں مضمون کے آخر میں چند گذارشات پیش کی جائیں گی، فی الوقت اس نکتہ کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

قرضوں کی اشاریہ بندی.....بنیادی مسئلہ

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اشاریہ بندی نے تنخواہوں، امانتوں اور قرضوں سمیت کئی معاملات کو اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے۔ جہاں تک تنخواہوں وغیرہ کا تعلق ہے، اس ضمن میں ہر سال افراطِ زر کا تخمینہ لگا کر تنخواہوں میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ شرعی نقطہ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ اسلامی نظامِ پیداوار میں مزدور کی اجرت اور سرمائے کو برتنے کے پیمانے مختلف ہیں۔ یعنی مزدور کو مقررہ تنخواہ دی جا سکتی ہے اور اس میں حسبِ حال مخصوص اضافہ بھی کیا جاتا ہے جبکہ سرمائے کے لئے متعین، لازمی منافع طے کرنا جائز نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اشاریہ بندی کا مسئلہ تجارتی قرضوں کے حوالے سے زیادہ اہم ہے اور عام طور پر بنکوں کے حوالے سے جب افراطِ زر اور اشاریہ بندی کی بات ہوتی ہے تو اس سے قرضوں کی اشاریہ بندی ہی مراد ہوتی ہے، آئندہ سطور میں اشاریہ بندی کے جواز اور عدمِ جواز کے بارے میں بحث کا اصل محور "قرضوں کی اشاریہ بندی" ہی ہے۔

کاغذی کرنسی..... شرعی حیثیت

چونکہ دورِ حاضر میں افراطِ زر کا بڑا مسئلہ براہِ راست کاغذی کرنسی کا پیدا کردہ ہے، اس لئے ضروری ہے کہ کاغذی کرنسی کی اصل حیثیت کا تعین کر لیا جائے۔ جب سے اشاریہ بندی کا معاملہ سامنے آیا ہے، کاغذی کرنسی کی اصل حیثیت کی بحث بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔ اس ضمن میں متعدد ملکوں کی فقہ اکیڈمیوں نے اپنے اپنے طور پر سیمینار منعقد کروائے اور مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں کسی تفصیل میں جائے بغیر سامنے آنے والی ان نمائندہ آراء کا خلاصہ درج ذیل ہے:

کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت کے بارے میں علمائے کرام میں مندرجہ ذیل آراء پائی جاتی ہیں۔ اس ضمن میں سب سے جامع بحث مکہ مکرمہ ہائیکورٹ کے جسٹس ڈاکٹر عبداللہ بن سلیمان المنیع نے عربی زبان میں کی ہے۔ تفصیل کے شائقین اصل کتاب کی طرف رجوع کریں[3]} جس کا اردو ترجمہ بھی پاکستان میں کاغذی کرنسی کی تاریخ ارتقاء اور شرعی حیثیت کے نام سے فضلی سنز لمیٹڈ اردو بازار، کراچی نے شائع کیا ہے۔

(1) کرنسی نوٹ بحیثیت دستاویز

اس نظریے کے مطابق کرنسی نوٹ جاری کنندہ کی طرف سے (ادھار کی) دستاویز ہے اور شرعی احکامات لگاتے وقت اس کے اس کردار کو مدِ نظر رکھا جائے گا۔

(2) نظریہ عروض

بعض ماہرین نے یہ رائے پیش کی ہے کہ کرنسی نوٹ عروضِ تجارت میں سے ایک عرض ہے یعنی اس کی حیثیت سامان کی سی ہے۔چنانچہ سامانِ تجارت کے شرعی احکام اس پر لاگو ہوں گے۔

(3)کرنسی نوٹ کا معدنی سکوں سے الحاق

اس نظریہ کے حاملین کے مطابق کرنسی نوٹ اسلامی قرونِ وسطی کے فلوس سے مشابہت رکھتے ہیں اور فلوس کی قیمتوں میں تغیر وتبدل کے حوالے سے فقہاء کرام کی آراء کرنسی نوٹوں پر بھی لاگو تصور کی جائیں گی۔

(4)نظریہ بدل

اس مؤقف کے حامی ماہرین کے مطابق کرنسی نوٹ اپنے اصل کا عوض یا بدل ہیں اور ان کا اصل سونا، چاندی یا کوئی قیمتی شے(Commodity)ہے۔یعنی کرنسی اصل کی نمائندہ ہے۔

(5) ثمنِ حقیقی

اس نظریے کے مطابق سابق تمام نظریات کے برعکس کرنسی نوٹوں کی ثمنیت کسی خارجی شے پر موقوف نہیں بلکہ اب یہ مستقل ثمن حقیقی کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور ان پر شرعی احکامات بھی اسی لحاظ سے وارد ہوں گے۔

کرنسی نوٹوں کے بارے میں یہ نمائندہ آراء عبداللہ بن سلمان المنیع نے پیش کی ہیں اور ہر رائے کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ مندرجہ بالا آراء میں سے کسی ایک کو بھی اختیار کرنے کے جو نتائج و عواقب یا شرعی اشکال وارد ہو سکتے ہیں، انہوں نے ان پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ نیز صاحبِ کتاب نے مؤخر الذکر رائے کو علمی غور وخوض کے بعد قبول کر لیا ہے۔اس ضمن میں اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ، اسلامی ترقیاتی بینک، بین الاقوامی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات اسلام آباد اور اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے منعقد کردہ سیمینارز اور قراردادیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں]4[-

پاکستان میں وفاقی شرعی عدالت نے سود کے خلاف جو فیصلہ دیا تھا اس میں اس پہلو پر بھی بحث کی گئی تھی کہ فقہاء نے قیمتوں میں ردوبدل کے حوالے سے لین دین کی جو شروط پیش کی ہیں، آیا ان سے اشاریہ بندی کے جواز کا کوئی پہلو برآمد ہوتا ہے کہ نہیں ؟چنانچہ علامہ ابن عابدین، ابن قدامہ اور فتاوی عالمگیری کے متعدد حوالہ جات سے اس تاثر کو زائل کیا گیا تھا کہ فقہاء کرام کی بعض تحریریں اشاریہ بندی کا جواز لئے ہوئے ہیں۔ [5]5یہ تفصیل کا موقع نہیں، اس پہلو کو پیشِ نظر رکھنے کے لئے صرف اشارہ مقصود تھا۔

قرضوں کی اشاریہ بندی کی شرعی حیثیت

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اشاریہ بندی کا اصل تعلق کاغذی کرنسی کی فقہی حیثیت کے تعین کے ساتھ ہے، چنانچہ اس سلسلے میں علماء اور ماہرین معیشت کو دو واضح گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

اول:

اس گروہ میں وہ علماء اور دانشور شامل ہیں جو اشاریہ بندی کے قائل ہیں، ان میں رفیق مصری، سلطان ابو علی، ایم اے منان، ضیاء الدین احمد، سلیم چشتی، عمر زبیر، گل محمد، مولانا محمد طاسین اور دیگر کئی علماء شامل ہیں۔[6]

دوم:

اس گروہ میں وہ علماء / دانشور شامل ہیں جو اشاریہ بندی کے مخالف ہیں اور متعدد وجوہ کی بنا پر اسے ناجائز بتلاتے ہیں ان میں محمد عمر چھابرا، حامد اللہ کاف، محمد نجات اللہ صدیقی، محمد حسن الزمان، مولانا تقی محمد عثمانی، علی احمد سالوس اور دیگر کئی علماء اور ماہرین معیشت شامل ہیں۔[7]{اسی نقطہء نظر کو مختلف ممالک کی اسلامی فقہ اکیڈمیوں نے بھی اختیار کیا ہے۔[8]}اسلامی معیشت کے عام ماہرین اور اساتذہ کی رائے میں یہی راجح ہے۔ ذیل میں ہم ہر دو فریقین کے دلائل کا مختصراً جائزہ لیں گے۔

مجوزین کے دلائل

قرضوں کی اشاریہ بندی کے حامی مندرجہ ذیل دلائل سے استفادہ کرتے ہیں:

کاغذی کرنسی کی شرعی حیثیت کے بارے میں مجوزین کا نقطہء نظر: وہ تمام حضرات جو کاغذی کرنسی کو ثمن حقیقی قرار نہیں دیتے بلکہ دیگر آراء میں سے کسی رائے کے حامی ہیں، وہ کسی حد تک اشاریہ بندی کے حامی ہو سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ سب ہی اشاریہ بندی کے حامی ہوں مگر عام طور پر یہ اشاریہ بندی کے حامی اور قائلین انہی آراء کے حامل نظر آتے ہیں۔ کیونکہ جب یہ موقف اختیار کیا جاتا ہے کہ کاغذی کرنسی ثمن حقیقی کی حیثیت اختیار کر گئی ہے تو اشاریہ بندی کا دروازہ خود بخود بند ہو جاتا ہے، اس ضمن میں وضاحت پہلے گذر چکی ہے۔

(1) چنانچہ قائلین اشاریہ بندی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جب کاغذی کرنسی کی ثمنیت کسی اور چیز پر موقوف ہے تو افراطِ زر کے نتیجے میں وہ دوسری شے بنیاد بن سکتی ہے اور اس کو بنیاد بنا کر قوتِ خرید میں جو کمی واقع ہوئی ہے، اس کے نقصان کی تلافی ممکن ہے۔

اگر بغور دیکھا جائے تو یہ رائے درست نہیں، کیونکہ کاغذی کرنسی کے ضمن میں راجح رائے یہی ہے کہ وہ

ثمن حقیقی ہے۔اس راجح رائے کو قبول کرنے کے سے یہ سارا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔بنابریں اگر اس راجح رائے کو نہ لیا جائے بلکہ کسی دوسری رائے مثلاً نظریہ بدل کو قبول کیا جائے (جیسا کہ مولانا مدنی نے اپنے بیان میں کہا ہے) تو بھی اشاریہ بندی ایک لازمی حل کے طور پر سامنے نہیں آتی، بلکہ کسی دوسرے قابل قبول اور منصفانہ حل کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔اس لئے کہ بقول مولانا مدنی اشاریہ بندی استحصالی ہتھکنڈوں میں سے ایک ہے اور اس ضمن میں جو طریقہ کار استعمال کیا جاتا ہے وہ نہ صرف غیر معقول بلکہ بہت حد تک ظالمانہ ہے۔

(2)اشاریہ بندی کے قائلین کے دیگر جملہ دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی اَحکامات عدل وانصاف کے بارے میں واضح ہیں۔افراطِ زر سے ناانصافی جنم لیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ظلم کا عنصر نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے، چنانچہ "لا ضرر ولا ضرار" کے قاعدے کے تحت اِشاریہ بندی کو قبول کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ یہ واضح ہے کہ افراطِ زر سے ناانصافی اور ظلم کا باب کھلتا ہے، مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ایک ظلم کو ختم کرنے کے لئے دوسرا ظلم شروع کر دیا جائے۔اشاریہ بندی کا نظام بذاتِ خود اس حد تک ظالمانہ اور غیر منصفانہ ہے کہ اس کو کسی مثبت حل کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔"لاضرر ولاضرار" کا قاعدہ بھی یہاں لاگو نہیں ہوتا کیونکہ افراطِ زر سے اگر دائن (قرض دینے والے) کو ضرر لاحق ہوتا ہے تو اشاریہ بندی سے یہ ضرر مدین (قرضدار) کی طرف منتقل ہونے کا خطرہ ہے۔

قائلین اشاریہ بندی کے جملہ دلائل کا خلاصہ یہی ہے اور عام فہم شخص بھی یہ محسوس کر سکتا ہے کہ افراطِ زر سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کی نشاندہی کی حد تک تو یہ نقطہء نظر بالکل درست ہے۔مگر جہاں تک علاج کا تعلق ہے وہاں سے ایک دوسری غلطی کا آغاز ہو جاتا ہے۔

مانِعین کے دلائل

اشاریہ بندی کے مخالفین کے دلائل کو نوعیت کے اعتبار سے دو اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے:

اول: اشاریہ بندی کے تکنیکی اور اقتصادی نقصانات

ڈاکٹر حسن الزمان نے اشاریہ بندی کی مخالفت میں وفاقی شرعی عدالت میں جو بیان دیا تھا، اس میں مندرجہ ذیل عقلی دلائل شامل تھے۔[9]

A کرنسی کی قیمت ایک اضافی اصطلاح ہے، اس سے کرنسی کی اصل یا اندرونی خصوصیات کا اظہار نہیں ہوتا اور نہ ہی کرنسی کی قیمت کا دارومدار ہمیشہ اس کی ذاتی خصوصیات پر ہوتا ہے۔مثال کے طور پر کئی مرتبہ یہ قیمت طلب ورسد

کے نظام میں کسی تبدیلی کی بنیاد پر کم یا زیادہ ہوتی ہے۔اس صورت میں اشاریہ بندی سے اس کا علاج..... جس کا براہِ راست تعلق کرنسی سے ہے..... کسی طور پر درست نہیں، کیونکہ اس صورت میں خرابی کے ذمہ دار عناصر خارجی ہیں۔

اور پھر یہ بھی کہ کرنسی کے نظام میں خرابی یا افراطِ زر کے ذمہ دار عناصر کا ٹھیک طور پر تعین ممکن نہیں۔اس لئے آنکھیں بند کر کے اشاریہ بندی کو بطورِ حل استعمال کرنا..... جبکہ اس کے استعمال کا محل ہی نہیں..... کسی طور پر مناسب نہیں۔

(3)اشاریہ بندی کے پس منظر میں یہ مقصد کارفرما ہے کہ قوتِ خرید میں کمی کے باعث دائن کو جو نقصان مستقبل میں لاحق ہو گا اس کی تلافی کی جائے۔یہ مستقبل قرض کی ادائیگی کے وقت سے نہیں بلکہ فوری طور پر شروع ہو جاتا ہے۔اشاریہ بندی کے لئے مستقبل میں قوتِ خرید میں ہونے والی کمی کو مدنظر رکھا جاتا ہے حالانکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ کرنسی کی متوقع قوتِ خرید کو بھی یقینی بنایا جائے۔یہ ایک ایسی شرط ہے کہ اس پر عمل تقریباً ناممکن ہے اور اس پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے یہ دعویٰ کہ اشاریہ بندی میں عدل وانصاف مضمر ہے خود ہی باطل ہو جاتا ہے۔

(4)اشاریہ بندی کے لئے جو طریقہ کار عام طور پر متداول ہے وہ بھی ظالمانہ اور غیر منصفانہ ہے۔اس کے لئے صارف کی ٹوکری کا (Consumer's Basket)طریقہ کار استعمال کیا جاتا ہے، صارف کی اس ٹوکری میں کئی ایسی اشیاء شامل ہیں جن کا عام صارف سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔اس طرح اشاریہ بندی کا نظام کئی لوگوں کے لئے غیر منصفانہ حمایت کا باعث بھی بن جاتا ہے۔

(5)بچتوں کے حوالے سے اشاریہ بندی کا طریقہ اور زیادہ مضحکہ خیز تصور پیش کرتا ہے۔تمام بچت کنندگان کی بچتوں(Consumer's Basket)کے حوالے سے برتا جاتا ہے اور اس طرح بزعم خویش نقصان کی تلافی کی جاتی ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کتنے بچت کنندگان ایسے ہیں جو (Consumer's Basket) خریدنے کے لئے بچت کرتے ہیں؟ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں!ایک ایسا شخص جو سونا خریدنے کے لئے بچت کر رہا ہے، اس کی بچت کردہ رقم کی قوتِ خرید میں ہونے والی کمی کو پورا کرنے کے لئے (Consumer's Basket)کو میعار بنانا مضحکہ خیز نہیں تو اور کیا ہے؟ایسے شخص کے لئے تو منصفانہ قدم یہ ہے کہ (Consumer's Basket) کے بجائے سونے کو معیار بنایا جائے۔علیٰ ہذاالقیاس ہر بچت

کنندہ کے اپنے مقاصد ہیں۔ ہر بچت کے پس منظر میں کارفرما مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے اشاریہ بنانا یقیناً ناممکن ہے۔ سو اشاریہ بندی کا یہ نظام فائدہ مند نہیں۔

(6) اس پر مستزاد یہ کہ قرض دینے کا عمل افراطِ زر کا باعث نہیں بنتا بلکہ عام طور پر بچتوں کا عمل افراطِ زر کے پس منظر میں کارفرما ہوتا ہے۔ چنانچہ قرض دار سے اشاریہ بندی کی بنا پر زائد رقم لینا بذات خود ایک غیر منصفانہ قدم ہے۔

F قیمتوں میں تغیر و تبدل ایک لازمی امر ہے۔ خاص کر ایک ایسے معاشرے میں جہاں معاشی تبدیلیاں زیادہ کارفرما ہوں وہاں قیمتوں میں یکسانیت اور وہ بھی ایک طویل مدت کے لئے ناممکن ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں ترقی کے ساتھ ساتھ قیمتوں میں تغیر و تبدل لازمی امر بن جائے وہاں اشاریہ بندی ناقابل عمل بن جاتی ہے۔

(7) اشاریہ بندی کے حامی معیشت کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ جہاں افراطِ زر کے عمل کو ہمیشگی اور دوام حاصل رہے۔ جب کہ عقل کا تقاضہ ہے کہ تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے رکھا جائے یعنی تفریطِ زر کے دوران اشاریہ بندی کا کردار کیا ہوگا؟ اس پر تاحال خاموشی ہے۔

(8) افراطِ زر کے باعث نقدی کی جملہ خصوصیات متاثر ہوتی ہیں مگر اشاریہ بندی ان میں سے صرف چند ایک کا علاج کرتی ہے اور باقی کو اسی طرح چھوڑ جاتی ہے مثلاً (Store of value) کا علاج تو اشاریہ بندی سے ممکن ہے مگر (Measure of value) کا مسئلہ جوں کا توں برقرار رہتا ہے۔

I جیسا کہ زیادہ تر بلاسودی قرضے غیر پیداواری ہوتے ہیں چنانچہ نقصان کی تلافی کے لئے مدین (دَین دار) سے رجوع کرنا غیر منصفانہ ہوگا۔

(9) اگر افراطِ زر کی شرح، منافع کی شرح سے زائد ہو جائے گی تو بینک اور دوسرے مالیاتی ادارے قرضوں کے کھاتے قبول کرنے سے احتراز کریں گے۔ نیز ایکویٹی Equity کی بنیاد پر رقوم کی فراہمی میں بھی تعطل پیدا ہو جائے گا۔

(10) اشاریہ بندی کے عمل کو اگر عام کر دیا گیا تو معاشرے میں ایک ہی کرنسی کی مختلف قیمتیں رائج ہو جائیں گی۔ یعنی کاروباری مقصد کے لئے مختلف قیمت، اشاریہ بندی کے لئے مختلف قیمت، افراطِ زر کے دوران ایک نئی قیمت، غرض یہ کہ بنیادی یونٹ ہونے کے ناطے کرنسی کی جو اہمیت ہے وہ ختم ہو کر رہ جائے گی۔

یہ تو اشاریہ بندی کے وہ نقصانات تھے جو اقتصادی اور عقلی نقطہء نظر سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ شرعی نقطہء نظر سے سب سے اہم اعتراض اس حوالے سے یہ ہے کہ اشاریہ بندی کا عمل سود سے مماثلت رکھتا ہے۔ یعنی اس میں ربا الفضل کا عنصر پایا جاتا ہے۔

دوم: اشاریہ بندی اور ربا الفضل

اشاریہ بندی پر سب سے زیادہ سنگین اعتراض شرعی نقطہء نظر سے یہ ہے کہ اس میں ربا الفضل کا پہلو پایا جاتا ہے ۔اس بنا پر علماء کرام کی اکثریت نے اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر طاہر منصوری اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"کیونکہ یہ شریعت کا غیر متنازع فیہ اصول ہے کہ قابل مبادلہ شے اس کی مثل کی صورت میں واپسی کی جائیگی، یہ مثلیت جنس کے ساتھ ساتھ وزن و مقدار میں برابری کی شکل میں ہو گی۔ کاغذی نوٹ بھی، جو تمام علماء کرام کے متفقہ فیصلہ کی رو سے درہم و دینار کے مشابہ ہیں، اس اصول کے تابع ہوں گے اور ان کا مبادلہ چاہے صرف کی صورت میں ہو یا قرض کی صورت میں، مقدار میں برابری کی بنیاد پر ہو گا، مقدار کی اس مثلیت سے ذرا بھی انحراف ربا الفضل کے زمرے میں آئے گا]" 10[

طرزِ استدلال بالکل واضح اور صحیح ہے۔ کیونکہ حدیث عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ اس باب میں اصل ہے اور اگر اشاریہ بندی پر اس کا انطباق کیا جائے تو نتیجہ ربا الفضل کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا۔ ربا الفضل اور اشاریہ بندی کے باہمی رشتے کے بارے میں محققین نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں جن کا احاطہ یہاں ممکن نہیں۔ دلچسپی رکھنے والے حضرات اصل مباحث کو دیکھ سکتے ہیں۔ اشاریہ بندی میں ربا الفضل سے مشابہت کا جو پہلو ہے اس کے پیش نظر اسلامی نظریاتی کونسل[11] اور وفاقی شرعی عدالت نے بھی قرضوں کی اشاریہ بندی کو خلافِ شرع قرار دیا ہے۔ نیز یہ سلسلہ اب کسی حد تک اجماعی شکل اختیا کرتا چلا جا رہا ہے۔ اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ آف اکنامکس اسلام آباد کے زیر اہتمام اشاریہ بندی کے موضوع پر منعقد سیمینار ۱۹۸۷ نے قرار دیا تھا کہ:

"ربا اور قرض کی احادیث میں مذکورہ یکسانیت اور مساوات سے وزن، پیمائش اور مقدار کی مساوات مراد ہیں، مالیت کی برابری مراد نہیں۔ یہ بات متعلقہ احادیث سے بھی ظاہر ہے جن میں اموالِ ربویہ کے لین دین میں ان کی قدر کو مد نظر رکھا جاتا۔ اس نکتہ پر امت کا اجماع ہے[12] اور اس پر اسی طرح عمل ہوتا چلا جا رہا ہے۔]" 13[

چنانچہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ربا الفضل کے پہلو کی بنا پر اشاریہ بندی ناجائز ہے۔

سوم: غرر اور جہالت

شرعی نقطہء نگاہ سے اشاریہ بندی پر دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ اس میں غرر اور جہالت کا عنصر نمایاں ہے اور معلوم ہے کہ ایسے تمام عقود باطل ہیں جن میں غرر اور جہالت کا عنصر موجود ہو۔ اشاریہ بندی میں ایک عوض کو مستقبل کے حوالے سے مجہول چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس بنا پر غرر اور جہالت لازم آتے ہیں۔

ممکنہ حل

اشاریہ بندی سے قطع نظر ماہرین نے افراطِ زر کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل طریقے وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔

(1) فہیم خان کا پیش کردہ حل

افراطِ زر کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے فہیم خان نے گولڈ اکاؤنٹ کا نظریہ متعارف کرایا ہے۔][14

اس سلسلے میں وہ بینکوں میں رقوم جمع کروانے اور بینکوں سے قرض لینے کے عمل میں تفریق کرتے ہیں۔ جہاں تک رقوم جمع کروانے کا تعلق ہے اس سلسلے میں فہیم خان کہتے ہیں کہ جب بینک رقم لے، اس وقت سونے کی مروجہ قیمت کے مطابق اسے تبدیل کرلے اور مودِع (Creditor) جب اپنی رقم نکلوائے تو اس سونے کی قیمت کے حساب سے رقم نکلوائے، مثلاً زید نے 1990ء میں بینک میں اتنی رقم جمع کروائی کہ اس سے 100 گرام سونا خریدا جاسکتا تھا۔ اب 1995ء میں زید جب یہ رقم نکلوانا چاہتا ہے تو اسے اتنی رقم واپس کی جائیگی کہ اس سے 100 گرام سونا خریدا جاسکے، قطع نظر اس حقیقت سے کہ ظاہری طور پر یہ رقم جمع شدہ رقم سے زیادہ ہے یا کم۔

جہاں تک بینکوں سے قرض لینے کا تعلق ہے، اس ضمن میں فہیم خان قرضوں کو دو گروپوں میں تقسیم کرتے ہیں ،یعنی:

(1) تجارتی قرضے (2) گھریلو قرضے

تجارتی قرضوں کے ضمن میں وہ یہ حل پیش کرتے ہیں کہ اس سارے نظام کو شراکت کی بنیاد پر حل کیا جائے۔ البتہ گھریلو قرضوں کے لئے بینکوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ ایسے قرضے قرضِ حسنہ کی صورت میں جاری کئے جائیں اور اگر بینک اس کے لئے آمادہ نہ ہوں تو اس ضمن میں گولڈ اکاؤنٹ والا طریقہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

جائزہ: فہیم خان کی یہ تجویز اپنی نوعیت کے اعتبار سے کوئی نئی تجویز نہیں۔ اشاریہ بندی کے وسیع تر مفہوم کے قائلین اسے بھی اشاریہ بندی قرار دیتے ہیں۔ البتہ اشاریہ بندی کو چند مخصوص طریقہ کار تک محدود سمجھنے والے

اسے اشاریہ بندی سے ہٹ کر ایک علیحدہ تصور قرار دیتے ہیں، اول الذکر صورت میں اس پر وہ تمام اعتراضات وارد ہوتے ہیں جو اشاریہ بندی پر ہوتے ہیں۔

مگر مؤخر الذکر نظریے کو اپنایا جائے تو اس ضمن میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ مودِع (Creditor) بینک میں نقد رقم جمع کراتا ہے اور واپسی کے وقت وہ سونے کو معیار بنا کر واپسی لیتا ہے۔یہاں گفتگو ایک مرتبہ پھر کاغذی کرنسی کی شرعی حیثیت کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔راجح رائے کے مطابق کاغذی کرنسی بذاتِ خود ثمن حقیقی ہے ۔چنانچہ اس کی قیمت کا تعین سونے یا کسی دوسری شے کے حوالے سے کرنا کسی طور پر درست نہیں۔

(2) شیخ محمود احمد کا پیش کردہ حل]15[

شیخ محمود احمد نے اس ضمن میں متبادل قرض کی رائے پیش کی کہ اگر ایک شخص بینک سے ۱۰/ ہزار روپے کی رقم قرض کے طور پر لیتا ہے تو بینک کو اس کے جواب میں ایک ہزار روپے قرض دے۔مدین)Debtor جو خود دائنCreditor بھی ہے(اور بینک) جو خودDebtor بھی ہے(دونوں مقررہ مدت تک اپنی اپنی رقوم سے کاروبار کریں اور پھر ایک دوسرے کو اصل زر واپس کر دیں۔اس دوران جو منافع کمائیں وہ دونوں کی ملکیت ہو گا۔اس بارے میں شیخ محمود احمد نے ایک خاکہ اسلامی نظریاتی کونسل کو بھی پیش کیا تھا جو(سود سے مشابہت کی بنا پر)مشکوک قرار دے کر مسترد کر دیا گیا تھا۔

اِسی حل کی بنیادی سکیم ہی متعدد شرعی اصولوں سے متصادم ہے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرض کی رقم سے منفعت اٹھانے کی جو ممانعت آئی ہے وہ اور قاعدہ کلیہ بمعنی

کل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا

کے تحت اس پر جو اعتراضات لازم آتے ہیں وہ بہت واضح ہیں اور شیخ محمود احمد ان کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکے۔

(3) اسلامی نظریاتی کونسل کا پیش کردہ حل

اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنی مجموعی سفارشات میں برائے اسلامی نظامِ معیشت میں قرار دیا کہ: "لہٰذا اگر ڈالر کو معیار قرار دینے میں کوئی عملی سہولت ہے تو اس کا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ جن صنعت کاروں کو بیرونی مشینری درآمد کرنے لے لئے قرض دیا جا رہا ہے، انہیں پاکستانی روپے کی بجائے ڈالر قرض دے۔۔۔۔ بلکہ اگر ڈالر قرض

دینے کے بعد انہی سے اس وقت کی شرح سے پاکستانی روپے کے عوض میں وہ ڈالر خرید لئے جائیں تب بھی ادائیگی ڈالر کے حساب ہی سے واجب ہو گی]"16[

خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمائیں۔ حیلہ ساز ذہنوں کی حیلہ سازی یہاں بھی بالکل واضح ہے اور یہ حل کسی بھی تبصرے سے مبرا ہے۔ کاغذی نوٹ کو ثمن حقیقی تسلیم کرتے ہوئے بھی ڈالر کو معیار مان لینا غلط نہیں۔ لیکن اگر یہی حل سونے کے حوالے سے پیش کیا جائے تو اشاریہ بندی کے حامی ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے۔ شیخ محمود احمد نے بجا لکھا تھا کہ:

"شرعی حیلے تو کئے جاتے ہیں، پہلے بھی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں اور (اسلامی نظریاتی کونسل کی) رپورٹ میں بھی متعدد نئے حیلے بیان کر دیئے گئے ہیں، ان کی مدد سے تو اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا]".....17[

اس کے علاوہ بھی افراطِ زر کے مسئلے سے نپٹنے کے لئے کئی حل پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً منور اقبال کا فکسڈ ویلیو یونٹس (Fixed Value Units) پر مشتمل مجوزہ حل جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے فہیم خان کے گولڈ اکاؤنٹس سے مختلف نہیں۔]18 FR [نیز اس مضمون میں ان تمام تفصیلات کا احاطہ مقصود نہیں۔

سپریم کورٹ میں حافظ عبدالرحمن مدنی صاحب کا بیان اور اس سے پیدا شدہ غلط فہمی

سپریم کورٹ (شریعت اپلیٹ بنچ) میں حافظ عبدالرحمن مدنی صاحب نے بطور معاون جو بیان دیا تھا، اس کے متعلق بعض اخبارات کے رپوٹروں نے بے احتیاطی کی بنا پر غلط سلط رپورٹنگ کی جس کی بنا پر بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ حافظ صاحب چونکہ افراطِ زر کی واقعاتی صورت تسلیم کر رہے ہیں، اس لئے ان کا موقف اشاریہ بندی (indexation) کی حمایت میں ہے۔ جہاں تک اس تاثر کا تعلق ہے اسی کی تردید "محدث" (اگست 99ء) میں واضح طور پر کر دی گئی۔ علاوہ ازیں مدنی صاحب کے داخل کردہ تحریری بیان کا مطالعہ بھی اسی سلسلے کی صورتِ حال کو واضح کرتا ہے۔ میں یہاں صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اخبارات کے رپوٹرز کی غلط فہمی سے قطع نظر کہ ان کا مبلغ علم معروف ہے، بعض اہل علم کو جو غلط فہمی ہوئی ہے، اس کا حقیقی سبب کیا ہے؟

اس حوالے سے سب سے اہم بات یہ ہے کہ حافظ عبدالرحمن مدنی صاحب نے کاغذی کرنسی کی شرعی حیثیت کے ضمن میں جو موقف اختیار کیا ہے کہ کاغذی کرنسی ثمن حقیقی نہیں بلکہ کاغذی کرنسی کی (Commodity) کا قائم مقام / بدل ہے اور یہ واضح ہے کہ یہ رائے اس رائے سے مختلف ہے جو مولانا گوہر الرحمن، انجینئر سلیم اللہ یا دیگر حضرات نے اختیار کی ہے یا جسے راقم الحروف نے گزشتہ سطور میں راجح رائے قرار دیا ہے۔ بہر کیف حافظ

صاحب نے مقام / بدل مقام کے موقف کو راجح تر قرار دے کر گفتگو کا آغاز کیا تھا۔اب ہمارے ہاں ماحول یہ بن گیا ہے کہ ان تمام حضرات کو جو کاغذی کرنسی کو ثمن حقیقی قرار نہیں دیتے بلکہ دیگر آراء میں سے کسی رائے کے حامل ہیں، انہیں اشاریہ بندی کا حمایتی سمجھ لیا جاتا ہے۔

اس بات کو اگر دوسرے زاویہ سے لیا جائے تو صورتحال یوں بنتی ہے کہ کاغذی کرنسی کو ثمن حقیقی قرار دینے والے حضرات... کم از کم پاکستان کی حد تک...افراطِ زر کے مسئلے کو بطورِ مسئلہ حل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ان کے نزدیک یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو کاغذی کرنسی کے ساتھ ناگزیر ہے اور اس کا ہر ممکنہ حل اشاریہ بندی کی طرف لے جاتا ہے۔چنانچہ اس غلط فہمی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی فکر نے حافظ صاحب کو بھی اشاریہ بندی کا حامی قرار دیا ہے۔حالانکہ کاغذی کرنسی کو ثمن حقیقی تسلیم نہ کرنے اور اشاریہ بندی کے درمیان کوئی لازمی تعلق نہیں کہ ایک کا انکار دوسرے کے اقرار کو لازم کر دے۔

یہاں اسی حقیقت کا اظہار بھی مقصود ہے کہ اشاریہ بندی کے غلط مفہوم کی وجہ سے یہ لازمی تعلق قائم کرنے والا ذہن پیدا ہوا ہے۔افراطِ زر کرنسی کو لاحق ہونے والی بیماری ہے اور اس کا ہر علاج اشاریہ بندی کے زمرے میں نہیں آتا۔اگر ایسا ہوتا تو کم از کم فہیم خان اور منور اقبال جیسے ماہرین معیشت یہ غلطی نہ کرتے کہ دونوں حضرات نے اشاریہ بندی کے عمل کو مسترد کر کے جو متبادل حل پیش کئے ہیں وہ اگر کلی طور پر نہیں تو اصولی طور پر ضرور مدنی صاحب کے پیش کردہ حل سے مماثلت رکھتے ہیں۔یہ حضرات خوب سمجھتے ہیں کہ اشاریہ بندی کا دائرہ کار کہاں تک وسیع ہے اور اس کی حدود کہاں ختم ہو جاتی ہے۔

اس ساری بحث کا مقصد یہ نہیں کہ حافظ عبدالرحمن مدنی صاحب نے جو موقف اختیار کیا ہے اس کی صحت کو ثابت کیا جائے۔حافظ صاحب کے موقف سے اختلاف ممکن ہے مگر ان کے موقف کی صحیح روح کو سمجھنے کے بعد ہی یہ اختلاف فائدہ مند ہے بصورتِ دیگر خلطِ مبحث ہو جائے گا۔

خلاصہ

اس ساری بحث کو سمیٹا جائے تو مندرجہ ذیل امور ہمارے سامنے آتے ہیں۔

1۔افراطِ زر کا مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس کا قباحتوں سے پاک شرعی حل تلاش کرنا ہو گا۔

2۔اس مسئلے سے نپٹنے کے لئے اب تک جو طریقے سامنے آئے ہیں وہ ناقابلِ عمل ہیں، کیونکہ:

(الف)وہ حضرات جو کاغذی کرنسی کو ثمن حقیقی قرار دیتے ہیں،ان کی طرف سے تو اس مسئلے کا کوئی حل پیش ہی نہیں کیا گیا۔

(ب)وہ حضرات جو نظریہ بدل کے قائل ہیں اس کا حل تھیوری سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے اور موجودہ نظام میں اس کا آگے بڑھنا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔

(ج)باقی رہ گیا اشاریہ بندی کے ذریعہ اس کا حل،اس میں جو مفاسد ہیں وہ بالکل واضح ہیں۔

چنانچہ تمام تر سنگینی کے باوجود یہ مسئلہ بدستور اپنی جگہ قائم ہے۔راقم کی ناقص رائے یہ ہے کہ اسلامائزیشن کے عمل(خواہ معیشت کے حوالے سے ہو یا سیاست کے حوالے سے)کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے جب تک ہم بحیثیتِ امہ مثبت قدم نہیں اٹھاتے،مسائل کا حل ممکن نہیں۔اس وقت ہمارا طریقہ کار پیوند کاری(Grafting) کا رجحان لئے ہوئے ہے۔سرمایہ دارانہ معیشت کے شجر خبیثہ میں کیسی ہی پاک اور مبارک قلم کی پیوند کاری کیوں نہ کی جائے،مثبت نتائج کی توقع رکھنا عبث ہے۔کیونکہ اس نظام کا بنیادی استعارہ..... استحصال ہے اور رہے گا!!

وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

[1] پال اے سموئل سن،اکنامکس،1992ء سنگاپور،ص738

[2] جے ایل ہانسن،ڈکشنری آف اکنامکس اینڈ کامرس،پانچویں اشاعت،لندن ص255

[3]ڈاکٹر عبداللہ المنیع نے کرنسی کے بارے میں مستقل ثمن ہونے کا کوئی پانچواں نظریہ قائم نہیں کیا ہے بلکہ چوتھے نظریہ بدل/قائم مقام کو ہی صحیح تر قرار دیا ہے(ملاحظہ ہو:صفحہ 61)۔کیونکہ اگر کرنسی کو کسی کیونکہ اگر(

بقیہ اگلے صفحہ پر)

[4]مجموعہ سفارشات سیمنار بابت اشاریہ بندی اور اسلامی معیشیت پر اس کے اثرات۔اپریل 1987

[5] محمود الرحمن فیصل بنام سیکرٹری منسٹری آف لاء،پی ایل ڈی1992ء،ص152 سے آگے

[6] محمد طاہر منصوری،فکر ونظر،ج33شمارہ25،اکتوبر/دسمبر1995ء،ص67،68،استادِ محترم منصوری صاحب نے تفصیلی حوالہ جات نقل کئے ہیں۔

[7] محولہ بالا

[8] مثال کے طور پر دیکھئے: مجموعہ سفارشات سیمینار برائے اشاریہ بندی 1998ء، اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کی قراردادیں (1994ء/1995ء) اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کی رپورٹ 1980ء، اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے مذکورہ موضوع پر خصوصی سیمینار کی روداد۔

[9] پی ایل ڈی 1994ء، ص 130 نیز حسن الزماں، اشاریہ بندی، ایک اسلامی نقطہ نظر، جریدہ برائے اسلامی معیشت، ج 2، شمارہ 2، ص 49۔

[10] محمد طاہر منصوری، فکر و نظر، ج 33، شمارہ 2، اکتوبر/دسمبر 1995ء، ص 68۔

[11] اسلامی نظریاتی کونسل نے، افراطِ زر کی وجہ سے جو اقتصادی مشکلات پیدا ہوتی ہیں، ان کا ایک حل مزدور کی تنخواہ کم از کم ایک تولہ سونا کے برابر کرنے کی سفارش کی ہے، اسی طرح عام لین دین میں بھی کرنسی کے اتار چڑھاؤ کا علاج اسے سونے سے وابستہ کر دینا تجویز کیا ہے۔ ملاحظہ ہو انگریزی رپورٹ اسلامی نظریاتی کونسل 54 مطبوعہ 1996 (محدث)

[12] مجمع فقہ اسلامی جدہ کے جس اجتماع کی قرارداد کی بنیاد پر اشاریہ بندی کے خلاف اجماع کی بات کی جا رہی ہے۔ اس اجتماع کے بارے میں اس حد تک تو بات درست ہے کہ اس اجتماع میں اشاریہ بندی کے حل کو مسترد کر دیا گیا تھا تاہم اس اجتماع کی قرارداد صرف اکثریتی تھی اتفاقی نہیں تھی کیونکہ اسی اجتماع کے شرکاء میں سے ہی ڈاکٹر سلیمان الاشقر، ڈاکٹر عجیل نشمی وغیرہ اس قرارداد کے حق میں نہ تھے، لہذا قرارداد کو اکثریتی کہنا ہی زیادہ مناسب ہے، اجماع کا دعویٰ کرنا درست نہیں۔ ملاحظہ ہو مجلہ الفقہ الاسلامی..... (محدث)

[13] مجموعہ سفارشات سیمینار بابت اشاریہ بندی، اور اسلامی معیشت پر اس کے اثرات، اپریل 1987ء۔

[14] محمد فہیم خان، قرضوں کی اشاریہ بندی، اسلامی نقطہء نظر سے چند نظری مباحث (انگریزی) پیش کردہ برائے سیمینار بابت اشاریہ بندی (1987ء) ص 25۔

[15] محمود احمد شیخ، سود کی متبادل اَساس، ادارہ ثقافتِ اسلامی، لاہور، 1991ء، ص 83

[16] پی ایل ڈی۔ 1992ء ص 131۔

[17] محمود احمد شیخ، سود کی متبادل اَساس، لاہور 1991ء، ص 27۔

[18] منور اقبال، مقالہ پیش کردہ برائے سیمینار بابت اشاریہ بندی اور اسلامی معیشت (1987ء) ص 32

(7) اسلام کا عادلانہ نظامِ وراثت اور اس کی خصوصیات!

الشیخ حافظ محمد یونس اثری حفظہ اللہ

اسلام دین عدل ہے۔ جس میں عدل کی ترغیب دیتے ہوئے حکم دیا گیا کہ:

اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ

المائدۃ-9

عدل کرو یہ تقوی کے زیادہ قریب ہے۔

اسلام عقائد واحکام سے لے کر معاشرت کے ہر پہلو کے حوالے سے عدل کا درس دیتا ہے۔اس کے عالمگیر اور عدل پر مبنی قوانین کی نظیر کسی اور مذہب میں نہیں ملتی، معاشرتی معاملات میں سے ایک بنیادی معاملہ وراثت کا بھی ہے۔اسلام نے جو وراثت کا نظام پیش کیا ہے یہ مکمل طور پر ایسے عدل پر مبنی ہے جس سے تمام مذاہب محروم ہیں۔

اسلام کے نظام وراثت کی عادلانہ خصوصیات کو بیان کرنے سے قبل بعض دیگر مذاہب کے ظلم پر مبنی نظام وراثت کا طائرانہ ذکر کرنا ضروری ہے تاکہ اسلامی نظام وراثت کی خصوصیات مزید ابھر کر سامنے آجائیں۔

وراثت اور دیگر مذاھب

وراثت کے حوالے سے ہم یہاں مشت از خروارے کے طور پر یہ ذکر کریں گے کہ اسلام کے علاوہ تمام مذاہب عادلانہ خصوصیات سے محروم ہیں۔ جن میں سے چند ایک کی تفصیل درج ذیل ہے۔

دور جاھلیت میں وراثت

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں بیمار تھا، محمد ﷺ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میری بیمار پرسی کے لئے بنو سلمہ کے محلے میں پیادہ پا تشریف لائے میں اس وقت بے ہوش تھا۔آپ ﷺ نے پانی منگوا کر وضو کیا، پھر وضو کے پانی کا چھینٹا مجھے دیا جس سے مجھے ہوش آیا، تو میں نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ میں اپنے مال کی تقسیم کس طرح کروں؟اس پر آیتِ مواریث نازل ہوئی۔]2[

سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی بیوی رضی اللہ عنہا، رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور کہا:اے اللہ کے رسول ﷺ یہ دونوں سعد رضی اللہ عنہ کی لڑکیاں ہیں، ان کے والد آپ کے ساتھ جنگ اُحد میں شریک تھے

اور وہیں شہید ہوئے۔ان کے چچانے ان کا کل مال لے لیا ہے ان کے لئے کچھ نہیں چھوڑا اور یہ ظاہر ہے کہ ان کا نکاح مال کے بغیر نہیں ہو سکتا، آپ ﷺ نے فرمایا: اس کا فیصلہ خود اللہ کرے گا، چنانچہ آیتِ میراث نازل ہوئی، آپ ﷺ نے ان کے چچا کے پاس بذریعہ ایک شخص کے حکم بھیجا کہ دو تہائیاں تو ان دونوں لڑکیوں کو دو اور آٹھواں حصہ ان کی ماں کو دو اور باقی مال تمہارا ہے۔] 3[

سورۂ نساء کی آیت نمبر 11 کے بارے میں امام ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں:

"یہ بات ذکر کی جاتی ہے کہ یہ آیت، میت جو مال اور ورثہ چھوڑ کر فوت ہو اس کے بارے میں ایک واجب حکم کی تبیین کے لئے نازل ہوئی، اس لئے کہ اہل جاہلیت میت کی وراثت کو اس کے ورثاء میں سے ان افراد کو نہیں دیتے تھے جو دشمن سے جنگ وغیرہ میں قتال نہ کر سکتے ہوں۔ جیسا کہ چھوٹے بچے اور عورتیں۔ ذریت کو چھوڑ کر مقاتلین میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ (گویا کہ کمزور طبقہ محروم ہو جاتا تھا) اللہ تعالیٰ نے اس آیت اور اس سورت کے آخر میں میت جو ورثاء چھوڑ کر جائے ان کے نام لے کر ان کے حصوں کو فرض کر دیا۔ میت کے چھوٹے، بڑے بچوں اور بچیوں کے لئے بھی ان کے والد کی وراثت سے حصہ مقرر کیا، جب ان کے علاوہ کوئی اور وارث نہ ہو، تو مذکر کو مؤنث کی بہ نسبت دگنا ملے گا۔"

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " اہل جاہلیت تمام مال لڑکوں کو دیتے تھے اور لڑکیاں خالی ہاتھ رہ جاتی تھیں، تو اللہ تعالیٰ نے ان کا حصہ بھی مقرر کر دیا البتہ دونوں کے حصوں میں فرق رکھا، اس لئے کہ مردوں کے ذمہ جو ضروریات ہیں وہ عورتوں کے ذمہ نہیں، مثلاً: اپنے متعلقین کے کھانے پینے، اخراجات کی کفالت، تجارت اور کسب اور اسی طرح کی دیگر مشقتیں۔ تو انہیں ان کی حاجت کے مطابق عورتوں سے دوگنا دلوایا۔]"4[

بہر حال ان حوالوں سے معلوم ہوا کہ اہل جاہلیت میں تقسیم وراثت کا نظام سراسر ظلم پر مبنی تھا، جسے اسلام نے ختم کیا اور مکمل طور پر ایک عادلانہ نظام وضع کیا، جو کمزور سے کمزور طبقے کو اس کا وہ حق دیتا ہے، جس کا وہ مستحق ہے۔

یہودیت اور وراثت

یہودیت جو کہ وہ دین ہے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا، چونکہ یہ عالمگیر اور دائمی دین نہیں تھا، لہذا اس مذہب میں موجود ضوابط کا تعلق بھی ایک خاص وقت سے تھا، اور مزید یہ کہ آج وہ اپنی اصل حالت میں موجود

بھی نہیں کیونکہ اس میں بہت زیادہ تحریفات ہو چکی ہیں۔ بہر حال عہد نامہ قدیم کے مطابق یہودیت جو نظام دے رہی ہے وہ غیر عادلانہ اور نامکمل ہے، جیسا کہ گنتی: باب 27 فقرہ نمبر 1 تا 11 میں یہ بیان ہوا ہے:

1" ۔تب یُوسف کے بیٹے منسّی کی اَولاد کے گھرانوں میں سے صلافحاد بِن حِفر بِن جِلعاد بِن مکِیر بِن منسّی کی بیٹیاں جِن کے نام مَحلاہ اور نُوعاہ اور حُجلاہ اور مِلکاہ اور ترضاہ ہیں پاس آکر۔2۔ خیمۂ اِجتماع کے دروازہ پر موسیٰ اور الِیعزر کاہِن اور امیروں اور سب جماعت کے سامنے کھڑی ہوئیں اور کہنے لگیں کہ۔3۔ ہمارا باپ بیابان میں مرا پر وہ اُن لوگوں میں شامل نہ تھا جنہوں نے قورَح کے فریق سے مل کر خُداوند کے خِلاف سر اُٹھایا تھا بلکہ وہ اپنے گناہ میں مرا اور اُس کے کوئی بیٹا نہ تھا۔4۔ سو بیٹا نہ ہونے کے سبب سے ہمارے باپ کا نام اُس کے گھرانے سے کیوں مِٹنے پائے؟ اِس لئے ہم کو بھی ہمارے باپ کے بھائیوں کے ساتھ حِصّہ دو۔

5 ۔ موسیٰ اُن کے مُعاملہ کو خُداوند کے حضُور لے گیا۔6۔ خُداوند نے موسیٰ سے کہا۔7۔ صلافحاد کی بیٹیاں ٹھیک کہتی ہیں۔ تُو اُن کو اُن کے باپ کے بھائیوں کے ساتھ ضرُور ہی میراث کا حِصّہ دینا یعنی اُن کو اُن کے باپ کی میراث ملے۔8۔ اور بنی اِسرائیل سے کہہ کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اُس کا کوئی بیٹا نہ ہو تو اُس کی میراث اُس کی بیٹی کو دینا۔9۔ اگر اُس کی کوئی بیٹی بھی نہ ہو تو اُس کے بھائیوں کو اُس کی میراث دینا* اگر اُس کے بھائی بھی نہ ہوں تو تُم اُس کی میراث اُس کے باپ کے بھائیوں کو دینا+ اگر اُس کے باپ کا بھی کوئی بھائی نہ ہو تو جو شخص اُس کے گھرانے میں اُس کا سب سے قریبی رِشتہ دار ہو اُسے اُس کی میراث دینا۔ وہ اُس کا وارِث ہو گا اور یہ حکم بنی اِسرائیل کے لئے جَیسا خُداوند نے موسیٰ کو فرمایا واجِبی فرض ہو گا۔] ' '5[

ان فقرات میں جو معاملہ واضح ہے، وہ یہ ہے کہ صلافحاد کی بیٹیوں نے اپنا حصہ طلب کرتے وقت فقرہ نمبر ۵ میں یہ کہا کہ " سو بیٹا نہ ہونے کے سبب سے ہمارے باپ کا نام اُس کے گھرانے سے کیوں مِٹنے پائے؟" جس سے مفہوم واضح ہے کہ اگر بیٹا ہو تو ان بیٹیوں کو کچھ نہیں ملے گا!! فافھم وتدبر گویا کہ عورت کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، اور پھر یہودیت کی کتاب تالمود کے مطابق یہودی اللہ کا جزء ہیں (نعوذ باللہ) اور اللہ کے یہاں فرشتوں سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ تالمود یہ بھی کہتی ہے کہ کسی یہودی کو تکلیف دینا اللہ کی عزت کو تکلیف دینا ہے۔ اور یہودی تمام لوگوں اور ان کے اموال پر غاصب ہو سکتے ہیں، اور جو اس طرح کسی کے مال پر مسلط ہو جائے اسے ملامت نہیں کیا جائے گا۔ (اعاذنا اللہ منھم)

جس مذہب کی تعلیمات اس قدر ظلم واستحصال پر مشتمل ہو، وہ بھلا کیسے عالمگیر طور پر عادلانہ نظام وراثت پیش کر سکتا ہے!!

مولانا صلاح الدین حیدر لکھوی صاحب بھی اپنی کتاب " اسلام کا قانون وراثت "میں یہودیت کے غیر عادلانہ نظام وراثت کا ذکر کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودیت کے مطابق صرف بیٹا وارث بن سکتا ہے اور اس میں بھی ناانصافی یہ ہے کہ بڑے بیٹے کو دگنا ملے گا۔ یہودیت ولد الزنیٰ کو تو وارث بناتی ہے، لیکن ماں، بیوی یا بیٹی کو وارث نہیں بناتی[6]۔

عیسائیت اور وراثت

عیسائیت شریعت موسوی ہی پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ بائبل میں عیسیٰ علیہ السلام کا قول موجود ہے۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے۔]" 7[

یہاں واضح طور پر بائبل کا بیان ہے کہ عیسی علیہ السلام توریت کو منسوخ کرنے نہیں آئے۔ لہذا بائبل کے گزشتہ حوالے[8] کا اطلاق عیسائیت کے لئے بھی ہو گا۔ ورنہ عہد نامہ جدید میں وراثت کے حوالے سے کوئی تفصیل موجود نہیں۔ لہذا عہد نامہ عتیق کی رو سے یہودیت کی طرح یہ بھی عادلانہ نظام وراثت سے محروم ہے۔ ساتھ ہی ان دونوں مذاہب میں یہ بھی نقص موجود ہے کہ ان میں مفصل نظام وراثت موجود نہیں۔

ھندومت اور وراثت

جس مذہب میں انسانیت کو چار طبقاتی تقسیم میں منقسم کر دیا گیا ہو۔

۱۔ برہمن: یہ طبقہ مذہبی پنڈت یا روحانی پیشوا پر مشتمل ہے۔

۲۔ کشتری: یہ طبقہ اشراف وامراء پر مشتمل ہے۔

۳۔ ویش: یہ طبقہ کاروباری طبقہ پر مشتمل ہے۔

۴۔ شودر: یہ طبقہ خدمت گزاری اور نوکر قسم کے افراد پر مشتمل ہے۔

ان تقسیمات میں انسان کو بانٹ دیا گیا ہو تو وہ مذہب کیسے عادلانہ نظام وراثت دے سکتا ہے!!

مزید یہ کہ جو اس طبقے سے بھی خارج ہیں، انہیں تو معاشرے سے خارج ہی سمجھا جاتا ہے۔ ان کی وراثت کو ظاہر سی بات ہے غصب ہی کیا جائے گا۔

بہر حال ان تمام مذاہب کے مقابلے میں اسلام نے جو نظام دیا وہ پیش خدمت ہے۔

اسلام کے عادلانہ نظام وراثت کی خصوصیات

مختصر طور پر مختلف ادیان کے غیر عادلانہ نظام وراثت کو بیان کیا گیا ہے، اب ہم آئندہ سطور میں اسلام کے عدل پر مبنی نظام کے چند نکات کو بیان کئے دیتے ہیں تاکہ دیگر ادیان اور اسلام کے دیئے گئے نظام میں تقابل آسان ہو جائے۔

سب سے پہلے یہ بات جان لی جائے کہ کسی وراثت کی تقسیم کو بنیادی طور پر دو اقسام کی طرف لوٹایا جا سکتا ہے۔

زندگی میں کسی کو اپنے مال کا وارث بنانا (جسے ہبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے) اور موت کے بعد وارث بننا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے ان دونوں طریقوں سے وارث بنا جا سکتا ہے، لیکن دونوں طریقوں کی صورتیں مختلف ہیں۔ مگر عدل کا طریق بہر حال دونوں صورتوں میں قائم ہے۔

(1) ھبہ (Gift) کرنا

اسلامی نظام وراثت کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر کوئی کسی کو اپنی زندگی میں وارث بنانا چاہے تو کیا شریعت اس کی اجازت دیتی ہے تو جواب یہ ہے کہ شریعت اس کی اجازت دیتی ہے لیکن اس کے کچھ ضابطے ہیں۔ اور مکمل ضابطہ شریعت نے بیان کیا ہے کہ اگر کوئی اپنی زندگی میں وراثت تقسیم کرے تو اس کو کتب فقہ میں فرائض یا میراث کے تحت نہیں لایا جاتا اور نہ ہی اس کی تقسیم وراثت کی سی ہو گی بلکہ وہ ایک ہبہ اور عطیہ ہے کتب فقہ میں اسی باب کے تحت اس حوالے سے بحث ملے گی۔ اور اس کے احکام و ضوابط بھی مختلف ہیں۔

ھبہ کے حوالے سے ضروری ضوابط

اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں وراثت تقسیم کر رہا ہے تو وہ ایک ہدیہ ہے اور اس میں اولاد کے درمیان برابری ضروری ہے، خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں سب کو برابر برابر دیا جائے گا۔

ورثاء میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے باقیوں کو محروم نہیں کیا جا سکتا۔

سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کے باپ (بشیر) نے ان کی ماں کے کہنے پر انہیں کچھ مال ہبہ کر دیا، تو ان کی ماں نے کہا کہ اس پر نبی کریم ﷺ کو گواہ بنالو۔ سیدنا بشیر رضی اللہ عنہ نے جب نبی کریم ﷺ

سے اس کی درخواست کی تو نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ کیا تمہاری کوئی اور اولاد بھی ہے ؟انہوں نے جواب دیا: جی ہاں! نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کیا تم نے سب کو اتنا ہی مال ہبہ کیا ہے ؟انہوں نے عرض کیا کہ نہیں!تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں ظلم پر گواہ نہیں بن سکتا۔]9[

بعض روایات میں ہے کہ "اللہ سے ڈر جاؤاور اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔]10["

عاق کرنا: کسی کو عاق نہیں کیا جاسکتا کیونکہ کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی زندگی میں شرعی ورثاء میں سے کسی کو محروم کردے۔

ورثاء کو چھوڑ کر کل مال کسی اور کو نہیں دیا جاسکتا۔

منہ بولا بیٹا شرعی طور پر وارث نہیں بن سکتا۔

دور جاہلیت میں ہبہ کی ایک قسم عمریٰ اور رقبیٰ بھی تھی،اسلام نے دور جاہلیت والی صورت کو ختم کیا ہے۔

عمری

یہ ہبہ کی ایک صورت ہے اس میں عمر کی قید لگائی جاتی ہے کہ دینے والا کہتا ہے کہ یہ چیز میں نے تیری زندگی تک تجھے دی۔اور اس کے بعد یہ واپس میری ہو جائے گی۔ جیسا کہ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "دور جاہلیت میں ایک شخص دوسرے کو گھر دیتا اور اسے کہتا کہ میں نے یہ خاص تیرے لئے تیری زندگی تک تجھے دیا۔"]11[اس طرح کی شرط کو بھی شریعت نے ختم کیا ہے۔

لہذا ایسا کوئی عطیہ کیا گیا ہے تو وہ واپس نہیں لوٹے گا بلکہ معمّر (جس کے لئے ہبہ کیا گیا ہے) اسی کے ورثاء میں تقسیم ہو گا۔]12[الا یہ کہ عمر کی قید کے علاوہ وقت مقرر کیا جائے چند سال وغیرہ کا تو یہ صحیح ہے۔

رقبیٰ

یہ بھی تحفہ اور عطیہ کی ایک صورت ہے،دور جاہلیت میں ایسا ہوتا تھا کہ ایک شخص دوسرے کو کوئی چیز بطور تحفہ دیتا اور کہتا:اگر میں تجھ سے پہلے مر گیا تو یہ تحفہ تیرے پاس ہی رہے گا اور اگر تو مجھ سے پہلے مر گیا تو یہ تحفہ واپس آجائے گا،مثلاً گھر وغیرہ۔اسے رقبیٰ کہتے ہیں کیونکہ دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کی موت کا انتظار کرتا ہے۔ اور رقبیٰ بھی انتظار کو کہتے ہیں۔چونکہ یہ طریقہ صحیح نہیں اس لئے اسلام نے اسے باطل قرار دیا۔اب جو شخص کسی کو عطیہ کرے گا اور وہ عطیہ اس کے آخری سانس تک اس کے پاس رہے تو وہ مرنے کے بعد بھی واپس نہیں آئے گا

بلکہ اس کا ترکہ شمار ہو گا اور اس کے ورثاء کو ملے گا، ہاں جو چیز کسی کو کچھ عرصے کے لئے دی جائے، مثلاً چند سال کے لئے مقرر کر کے دے دی گئی، وہ مقرر کردہ وقت کے بعد واپس آ جائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ زندگی میں ہبہ کے ذریعے کسی کو وارث بنانا شرعاً جائز، لیکن اس میں بھی عادلانہ قوانین اسلام ہی کا امتیاز ہیں۔

(2)وفات کے بعد کسی کا وارث بننا

زندگی میں کوئی شخص کسی کو اپنا مال ہبہ کر سکتا ہے اس کی تفصیل کے بعد اب ہم میت کی وفات کے بعد تقسیم وراثت میں اسلام کے نظام عدل کو بیان کرتے ہیں جو کہ ہر پہلو سے جھلکتا نظر آتا ہے۔

تقسیم وراثت سے قبل کے عادلانہ پہلو

تقسیم وراثت سے قبل تین شروط کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ جن کی موجودگی میں تقسیم وراثت صحیح ہو گی ورنہ نہیں۔(1) مورّث (جس کا وارث بنا جا رہا ہے) کی موت کا ثابت ہونا، یا ایسا مفقود کہ جس کے بارے میں قاضی میت سمجھ لینے کا فیصلہ دے دے۔(2)وارث کی زندگی کا ثابت ہونا(3) جس بنیاد پر وارث بنا جا رہا ہے اس کا اثبات۔

ان تینوں شروط کے تعین سے عدل کا معاملہ واضح طور پر جھلک رہا ہے کیونکہ ان شروط کے تعین کا مقصود یہی ہے کہ کسی قسم کی زیادتی اور ظلم نہ ہو۔ مثلاً

پہلی شرط: میت کے موت کے یقینی یا حکماً اثبات کی شرط میں میت کے ساتھ عدل کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ کہیں کوئی دھوکہ دیتے ہوئے کسی کی عدم موجودگی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کی وراثت کو تقسیم نہ کر دے۔

دوسری شرط: وارث کی زندگی کا ثابت ہونا، اس میں تمام ورثاء کے ساتھ عدل کو ملحوظ رکھا گیا ہے کیونکہ مورث کی زندگی میں جو فوت ہو جائے وہ شرعاً وارث نہیں بن سکتا، تو اس میں تمام زندہ ورثاء کے ساتھ عدل ہے۔

تیسری شرط: جس سبب سے وہ وارث بن رہا ہے اس کا ثابت ہونا جو کہ تین ہیں، مثلاً وراثت کے تین اسباب ہیں، نکاح، ولاء، قرابت۔ تو اس شرط میں بھی ورثاء کے استحقاق کی حفاظت کی گئی ہے جو عین عادلانہ ہے، اس شرط کی رو سے کوئی غیر وارث، حقیقی وارث کے حصے کو غصب یا ہتھیا نہیں سکتا۔

مزید عدل کا عالم یہ ہے کہ اب شخص ان تین شروط پر پورا اترتے ہوئے میت کا وارث بننے کا اہل ہے لیکن اگر شرعی موانع میں کوئی ایک مانع بھی آ گیا تو وارث نہیں بن سکتا۔ موانع بھی تین ہیں۔

غلام ہونا: غلام نہ خود وارث بن سکتا ہے اور نہ ہی اس کا وارث بنا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی ساری کمائی مالک کی ملکیت ہوتی ہے۔

اس میں عدل کا پہلو یہ ہے کہ عام طور پر جنگوں کے دوران غیر مسلم قیدی لوگ غلام بن جاتے ہیں۔ لہذا ایسے غیر مسلم جنہیں غلام بنایا گیا ہے کہیں وراثت کے طریق سے ان کے لئے کوئی مدد کا سلسلہ نہ بن جائے اور وہ اپنے مالک کے حقوق ادا نہ کرے۔ دوسرے نمبر پر یہ حکمت بھی نظر آتی ہے کہ اس غلام کی وجہ سے آزاد وارثوں کو نقصان نہ پہنچے۔ ظاہر سی بات ہے اس غلام کو وراثت ملنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے مالک کی ملکیت ہو جانا کیونکہ غلام کا سب کچھ اس کے مالک کا ہے۔ اس طرح وہ مال نہ غلام کا رہا اور نہ ہی آزاد وارث کا۔ شریعت نے اس ضابطے کے ذریعے ظلم و جبر کے بہت بڑے راستے کو بند کیا ہے، یوں سمجھ لیں کہ اس ضابطے کی وجہ سے بس ایک شخص غلام ہوا اور اگر یہ اصول ختم ہو جائے صرف وہ شخص ہی غلام نہیں رہے گا بلکہ اس غلامی کی لپیٹ میں اس کے تمام قریبی رشتے دار آ جائیں گے۔

قتل: قاتل اپنے مورث کو کر دے، جس پر قصاص یا دیت لازم ہو، اس قتل کی وجہ سے یہ قاتل وراثت سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس میں حکمت یہی نظر آتی ہے کہ مال و دولت کا حرص اور حصول مال کی جلدی کی بناء پر وہ اس طرح کا گناہ نہ کرے۔ گویا کہ کسی مال ہتھیانا جہاں کسی دوسرے کے لئے ناممکن وہیں شرعی وارث بھی ناجائز طریقے سے ہتھیا نہیں سکتا۔

دین کا مختلف ہونا: مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے۔ اور وجہ اس میں بھی یہی ہے کہ ایک کافر کی وجہ سے مسلمان ورثاء کے حصوں میں نقص واقع ہو جائے گا۔ اور دینی غیرت و حمیت کے منافی بھی ہے۔ بہر حال ان موانع کے ذریعے سے بھی عدل کو قائم کیا گیا ہے اور ظلم کے دروازوں کو بند کر دیا گیا ہے تاکہ کسی اعتبار سے غیر مستحق شخص وارث نہ بن سکے۔

عدل کا اگلا مرحلہ

اب تک تو تقسیم وراثت کے حوالے سے ضروری امور کا ذکر ہوا جو کہ عین عادلانہ ہیں۔ لیکن تقسیم وراثت سے قبل شریعت میت کے حوالے سے حسن سلوک کا حکم دیتی ہے جو کہ میت کا حق ہے اور اس میں میت کے ساتھ عدل کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

میت کی تدفین کاانتظام

میت کی تدفین کاانتظام کیاجائے گا،اور ورثاء میں سے کوئی اس کے خرچ کاذمہ لے لے تو یہ اس کے لئے باعث اجر ہے لیکن واجب نہیں۔ورنہ میت کے مال سے ہی اس کا سارا خرچ ہو گا۔البتہ اگر میت نے مال نہیں چھوڑا تو اب ورثاء پر اپنی آمدنی سے تدفین کے انتظام کو سنبھالنا واجب ہے۔شریعت کے اس حکم میں میت اور اخلاف دونوں کے ساتھ ہی عدل کا پہلو موجود ہے۔اس لئے کہ انتظام وانصرام کو نہ ہی اخلاف کے ساتھ وجوبی طور پر مخصوص کیا گیا ہے کہ بہر صورت وہی تدفین کا خرچ برداشت کریں اور میت کے مال سے کچھ خرچ نہ کیا جائے ایسا ہر گز نہیں۔اور نہ ہی انہیں بہر صورت بری کر دیا گیا ہے کہ اگر میت کے ترکہ میں کچھ بھی نہیں تو بھی یہ بری ہیں ایسا بھی نہیں ہے۔

یہ تفصیل مکمل طور پر تمام اعتبارات سے عدل پر مبنی ہے کیونکہ کسی ایک کے ساتھ بہر صورت خرچ کاذمہ لازم کر دیا جائے تو یہ ناانصافی ہو گی، بہر حال میت کی تدفین وتکفین کے انتظام سے پہلے وراثت کی تقسیم نہیں کی جاسکتی۔

میت کے قرض کی ادائیگی

میت کی تقسیم سے قبل دوسرا اہم ترین مرحلہ یہ ہے کہ میت کے ذمے جو قرض ہے اسے ادا کیا جائے یہ میت کے مال سے ادا کیا جائے گا اور اگر میت کوئی مال نہ چھوڑے یا قرض سے کم چھوڑے تو باقی ماندہ قرضہ کی ادائیگی ورثاء پر ہے۔

میت کی وصیت کالاگو کرنا

تقسیم وراثت سے قبل ایک اہم معاملہ میت کی وصیت کا بھی ہے کہ اسے بھی لاگو کیا جائے۔اور اس کے لاگو کرنے کے حوالے سے بھی شریعت کے بیان کردہ ضوابط اپنے اندر عدل والی امتیازیت سموئے ہوئے ہیں۔

وصیت کے احکام

ابتدائی دور میں وصیت فرض تھی،وراثت کے تفصیلی احکام آجانے کے بعد اب اس کا حکم استحبابی ہے۔ایک تہائی سے زائد میں وصیت جائز نہیں۔جیسا کہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے،وہ فرماتے ہیں کہ میں اس قدر بیمار ہو گیا کہ موت کو جھانکنے لگا رسول اللہ ﷺ میری عیادت کرنے آئے میں نے عرض کیا:اے اللہ کے رسول ﷺ ! میرے پاس بہت زیادہ مال ہے اور میری بیٹی کے سوا میرا کوئی وارث نہیں تو کیا میں اپنا دو

تہائی مال صدقہ کر دوں ؟آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ میں نے کہا: نصف ؟فرمایا: نہیں۔ میں نے کہا: ایک تہائی ؟فرمایا: ہاں ایک تہائی، ایک تہائی بھی بہت زیادہ ہی ہے۔ تو اپنے ورثاء کو مالدار چھوڑ کر جائے یہ بہتر ہے اس سے کہ تو انہیں فقیر چھوڑ کر جائے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔[13] اگر ایک تہائی سے زائد پر وصیت ہو گی تو ورثاء زائد کے بارے میں حق رکھتے ہیں کہ اسے نافذ نہ کریں۔

وصیت وارث کے بارے میں کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے۔ پس وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں۔[14] اگر ایسی وصیت کی گئی تو وہ نافذ نہیں ہو گی۔ پہلے قرض کو ادا کیا جائے گا پھر وصیت کا نفاذ ہو گا۔

ورثاء کی طرف سے وصیت کو رد و بدل کرنا حرام ہے۔

وصیت میں کسی کو نقصان پہنچانا جائز نہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک انسان مرد یا عورت ساٹھ سال تک اللہ کی اطاعت کے عمل کرتے رہتے ہیں، پھر جب ان کی موت کا وقت آتا ہے تو وصیت میں (وارثوں کو) نقصان دے جاتے ہیں تو ان کے لئے آگ واجب ہو جاتی ہے۔[15]

کمزور طبقوں تک وراثت کی رسائی

اسلامی نظام وراثت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کمزور سے کمزور طبقوں تک بھی ان کا حق پہنچاتا ہے جس کے وہ مستحق ہیں جبکہ اس خصوصیت سے دیگر مذاہب محروم ہیں۔ ہم ذیل میں ان کی قدرے وضاحت کرتے ہیں:

یتیم بچہ (Orphan)

یتیم بچہ معاشرے کا ایک کمزور طبقہ ہے، اسلام سے قبل یتیموں کا مال غصب کر لئے جاتے تھے۔ اسلام نے آکر یتیموں کے حوالے سے احکامات نافذ کئے، اور ان کے ساتھ ناروا سلوک کرنے والوں کی مذمت کی اور ڈرایا گیا کہ اگر ان کی اولاد ان یتیموں کی جگہ ہوتی تب بھی وہ یہی چاہتے کہ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک جو وہ یتیموں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اسلام نے جو احکامات یتیم کے حوالے سے دیئے ان میں چند ایک درج کئے جاتے ہیں۔

یتیم کے مال کی دیکھ بھال

یتیم کی کفالت کی ترغیب دلائی گئی اور اس کی فضیلت بھی بیان کی گئی۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے سبابہ اور درمیان والی انگلی کو تھوڑے فاصلے کے ساتھ ملاتے ہوئے فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہونگے۔[16]

یتیم کا کفیل اگر مالدار ہے تو حد درجہ اس کے مال کو خرچ کرنے میں احتیاط برتے۔
اگر خود غریب ہے تو اس کے مال کو خرچ کر سکتا ہے، لیکن فضول خرچی اور اسراف نہ ہو، اور نہ ہی مال ضائع کیا جائے اور نہ ہی یتیم کے مال سے اپنی جمع پونجی بنائی جائے۔][17
یتیم کا مال کھانا کبیرہ گناہ ہے۔] 18[

بہر حال عام معاملات میں بھی اس کے ساتھ حسن سلوک اور وراثت کے حوالے سے بھی وہ جس حصے کا وارث ہے اسے دیا جائے گا نیز اس کی کفالت کی بھی ترغیب دلائی گئی اور بڑے ہو جانے پر اس کا مال اس کے حوالے کرنے کا بھی حکم دیا گیا۔

حمل (Unborn Child)

اسلامی نظام وراثت میں انتہا درجے کے عدل کی ایک عمدہ مثال یہ بھی ہے کہ اس نظام میں ماں کے پیٹ میں موجود حمل (اگر وہ پیدائش کے بعد شرعی طور پر وارث بنتا ہو) کے لئے بھی حصہ رکھ لیا جائے گا اور اسے کالعدم نہیں سمجھا جا سکتا، کیونکہ یہ اس کے ساتھ ناانصافی اور ظلم ہو گا۔ البتہ اس کی تقسیم کے حوالے سے مشکل یہ ہے کہ حمل کے بارے میں بہت سی باتوں کا علم نہیں ہوتا مثلاً وہ زندہ بھی ہو گا یا نہیں، مذکر ہو گا یا مؤنث، پھر وہ ایک ہے یا ایک سے زائد ہیں۔ وغیرہ

بہر حال اس کا حل یہ ہے کہ اولاً کوشش یہی ہونی چاہئے کہ تمام ورثاء وضع حمل کا انتظار کریں، ورنہ حمل کے لئے اکثر حصہ روک کر باقی ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے گا یعنی اگر بچہ کی صورت میں حصہ زیادہ بنتا ہے تو وہ روک لیں گے اور اگر بچی کی صورت میں زیادہ بنتا ہے تو وہ روک لیں گے اور حمل کے لئے جس حیثیت (بچہ /بچی) سے حصہ روکا گیا ہے اگر وضع حمل کے بعد وہ وہی (بچہ یا بچی) ہے، پھر تو ٹھیک۔ ورنہ اس کا حصہ کم کر کے وہ مال ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ مزید تفصیل اس حوالے سے کتب میراث میں دیکھی جا سکتی ہے، ہم یہاں جس حوالے سے بات کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ حمل کے لئے اس کا حصہ روک کر رکھنا اسلامی نظام وراثت کا امتیازی حکم ہے۔ جو اس بچے کے ساتھ عین عدل ہے۔ اور ظاہر سی بات ایک زندہ بچہ اس کی کم عمری کا ناجائز فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے تو حمل کو نظر انداز کرنا بالاولیٰ ممکن ہے لیکن اسلامی شریعت کی پیروی میں ایسا ممکن نہیں۔

خنثیٰ (Transgender)

خنثیٰ (ہیجڑا) بھی معاشرے کا کمزور طبقہ ہے، شریعت کے مطابق وارثت کا حقدار ہے۔ اور جس حصے کا یہ مستحق ہے وہی اسے دیا جائے، خنثیٰ کی تین صورتیں ہیں 1 جس کی ہیئت عورتوں جیسی ہو تو اسے عورت کے اعتبار سے ہی حصہ ملے گا، 2 جس کی ہیئت مرد جیسی ہو اسے مرد کے اعتبار سے ہی حصہ ملے گا اور 3 تیسرے معاملہ کو بھی حل کیا گیا ہے جسے خنثیٰ مشکل کے نام سے جانا جاتا ہے، یعنی جس میں مرد و عورت والی دونوں ہیئتیں؛ للھوں یا دونوں ہی نہ ہوں، (بچپن میں نہ ہوں، عام طور پر بڑے ہو کر تعین ہو جاتا ہے۔) اہل علم نے اس پر بھی بحث کی اور حل کیا، جس کی تفصیل کتب میراث میں دیکھی جا سکتی ہے۔ بس یہاں اس قابل غور پہلو کی طرف صرف اس قدر نشاندہی مقصود ہے کہ ایک ایسا طبقہ جو معاشرے کا انتہائی کمزور طبقہ ہے اس میں بھی اگر حسب استحقاق حصہ پہنچ رہا ہے، اس سے بڑھ کر عدل کی کیا حد ہو سکتی ہے؟؟

عورت (Woman)

اسلام عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں فرمان باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَن يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا

النساء-19

ترجمہ: ”اے ایمان والو! تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو۔ اور نہ ہی انہیں اس لیے روکے رکھو کہ جو مال (حق مہر وغیرہ) تم انہیں دے چکے ہو اس کا کچھ حصہ اڑا لو۔ اِلّا یہ کہ وہ صریح بدچلنی کا ارتکاب کریں۔ اور ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں ناگوار ہو مگر اللہ نے اس میں بہت بھلائی رکھ دی ہو۔“

جیسا کہ گزشتہ سطور میں گزر چکا کہ یہودیت اور دیگر مذاہب میں عورت کا وارث بن جانا بہت مشکل ہے، لیکن اسلام نے عورت کی مختلف حیثیتوں کو سامنے رکھا اور ان حالتوں کی حیثیت کے بقدر اس کا حصہ مقرر کیا۔ جیسا کہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

عورت ماں کی حیثیت سے

اولاد یا ایک سے زائد بہن بھائی کی موجودگی میں چھٹے حصے کی مستحق ٹھہرتی ہے۔(دیکھئے سورۃ النساء کی آیت نمبر 11)ورنہ کل مال سے ایک تہائی ملے گا۔اور ایک صورت میں ماں کو باقی ماندہ کا ایک تہائی مال ملے گا۔ اور وہ یہ ہے کہ ورثاء میں خاوند،ماں اور باپ یا بیوی ماں اور باپ ہوں۔جسے مسئلہ عمریتین کے نام سے جانا جاتا ہے۔

عورت بیٹی کی حیثیت سے

بیٹی کی حیثیت سے اگر اولاد میں اکیلی بیٹی ہی ہے تو اسے نصف مال ملے گا۔

ایک سے زائد بیٹیاں ہوں تو انہیں دو تہائی مال ملے گا۔

اور اگر بیٹے و بیٹیاں دونوں ہوں تو مرد کو دو حصے اور عورت کو ایک حصہ کے اصول کے تحت مال تقسیم ہو گا۔(دیکھئے سورۃ النساء:11)

عورت بہن کی حیثیت سے

بہنوں کی کئی صورتیں ہیں،مثلاً سگی بہن،علاتی بہن(باپ کی طرف سے بہن)،اخیافی بہن(ماں کی طرف سے بہن)۔ان تینوں حیثیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے حصے میں بھی تبدیلی آئے گی جیسا کہ درج ذیل ہے۔

سگی بہن

اگر سگی بہن اکیلی ہے اور میت کی کوئی اولاد نہیں تو اس صورت میں بہن کو آدھا مال ملے گا۔

اگر ایک سے زائد ہوں تو ان کو دو تہائی ملے گا۔جو ان کے مابین تقسیم ہو گا۔

اگر بہن کا بھائی موجود ہے تو یہ عصبہ بالغیر ہونے کی حیثیت سے وارث بنے گی۔بھائی کو دو حصے اور بہن کو ایک حصہ مل جائے گا۔

اگر صرف بیٹی موجود ہے یا پوتی موجود ہے تو اس صورت عصبہ میں مع الغیر ہونے کی حیثیت سے باقی ماندہ مال کی وارث بنے گی اور بیٹی یا پوتی کو نصف مال ملے گا۔

اگر میت کا بیٹا یا پوتا،باپ یا دادا موجود ہے تو ایسی صورت میں سگی بہن محروم ہو جائے گی۔

علاتی بہن(باپ کی طرف سے بہن)

اگر میت کے باپ،دادا اور اولاد موجود نہیں اور نہ ہی سگے بہن بھائی ہیں اور نہ ہی علاتی بھائی(باپ کی طرف سے بھائی)ہے اور علاتی بہن اکیلی ہے تو اس صورت میں اسے نصف مال ملے گا۔اور اگر ایک سے زائد ہیں تو دو تہائی

ملے گا جو کہ ان کے مابین تقسیم ہو گا۔اور اگر سگی بہن موجود ہے تو چھٹا حصہ تکملۃ للثلثین ملے گا۔اور علاتی بہن یا علاتی بھائی کی موجودگی میں یہ عصبہ بالغیر ہونے کی حیثیت سے وارث بنے گی۔

اخیافی بہن (ماں کی طرف سے بہن)

اخیافی بہن اگر اکیلی ہے اور میت کی اولاد اور باپ دادا موجود نہیں تو اسے چھٹا حصہ ملے گا۔اور اگر ایک سے زائد ہیں تو انہیں ایک تہائی حصہ ملے گا۔اور اگر میت کی اولاد یا باپ دادا موجود ہے تو یہ وراثت سے محروم ہو جائیں گی۔

عورت بیوی کی حیثیت سے

اگر اولاد موجود نہ ہو تو اسے کل مال سے چوتھا حصہ ملتا ہے۔اور اگر اولاد موجود ہو تو اسے آٹھواں حصہ ملتا ہے۔(دیکھئے سورۃ النساء:آیت نمبر:12)

عورت دادی اور نانی کی حیثیت سے

اگر میت کی ماں موجود نہیں اور نانی، دادی ہے تو یہ چھٹے حصے کی حق دار ہیں۔ماں کی موجودگی میں دونوں کو کچھ نہیں ملے گا اور باپ کی موجودگی میں دادی کو کچھ نہیں ملے گا۔

عورت پوتی / پڑپوتی (الی مانزل) کی حیثیت سے

اگر وہ اکیلی ہے اور میت کا بیٹا، بیٹی اور پوتے کی عدم موجودگی میں اگر پوتی اکیلی ہے تو نصف مال کی حق دار اور ایک سے زائد ہیں تو دو تہائی مال کی حق دار ہیں۔اور اگر بیٹی بھی ہے اور پوتی بھی تو بیٹی کو نصف اور پوتی کو تکملۃ للثلثین (یعنی بیٹیوں کے حصے دو تہائی کو پورا کرنے کے لئے) چھٹا حصہ ملے گا۔اور اگر پوتا موجود ہے تو عصبہ بن جائے گی، اصحاب الفرائض سے بچا ہوا باقی ماندہ پوتا، پوتی میں للذکر مثل حذالانثیین (مرد کے دو، عورت کا ایک حصہ) کے اصول کے تحت تقسیم ہو گا۔اور اگر میت کا بیٹا موجود ہے چونکہ باقی ماندہ مال وہی لے لے گا ایسی صورت میں پوتی یا پوتے کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔

خلاصہ

اس ساری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ ان تمام مختلف صورتوں میں عورت کی حیثیت کے بقدر اس کا حصہ بھی تبدیل ہو رہا ہے۔لہذا اسلامی نظام وراثت میں تفصیلی طور پر عورت کی تمام حیثیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اسے مناسب حصہ دیا گیا ہے۔جبکہ دیگر مذاہب اسے سرے سے محروم کر رہے ہیں۔

باطل شبہ کاازالہ

عام طور پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے نظر آتے ہیں کہ اسلام عورت کو کم حصہ دیتا ہے اور مرد کو زیادہ حصہ دیتا ہے۔

یہ شبہ بالکل باطل ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہر وارث کو اس کی حیثیت، میت سے قرابت اور ذمہ داریوں کو سامنے رکھتے ہوئے حصہ دیتا ہے، جس میں ورثاء کے حصے میں باہم تفاوت لازمی امر ہے، جہاں تک عورت کے حصے کا تعلق ہے اس کا معاملہ بھی یہی ہے، جہاں اس کا حصہ زیادہ ہے وہاں اس کی قرابت اور ذمہ داری کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کبھی مردوں کا باہم ایک دوسرے سے حصہ کم زیادہ ہو سکتا ہے اور کبھی دو عورتوں کا حصہ آپس میں ایک دوسرے سے کم زیادہ ہو سکتا ہے، اسی طرح مرد و عورت کا حصہ بھی ایک دوسرے سے کم اور زیادہ ہو سکتا ہے۔ اور وجہ ان کی حیثیتوں کا فرق ہے۔

دوسری بات جو بڑی اہم ہے ہمیشہ عورت کا مرد سے حصہ کم نہیں ہوتا، بلکہ اس میں خاصی تبدیلیاں آتی ہیں۔ جیسا کہ درج ذیل ہیں۔

کبھی عورت کا حصہ مرد کی بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص فوت ہوا اور اس کے ورثاء میں اس کی بیٹی اور والدین ہیں۔ اب اس صورت میں بیٹی کو آدھا مال مل جائے گا اور ماں کو کل مال سے چھٹا حصہ ملے گا اور بقیہ باپ کو ملے گا، یوں سمجھ لیں گے 100 روپے میں سے پچاس روپے بیٹی کو ملے اور 6.16 روپے ماں کو ملے اور باقی 4.33 روپے باپ کو ملیں گے۔

اب اس صورت میں بیٹی (جو کہ ایک عورت ہے) میت کے باپ (جو کہ ایک مرد ہے) سے زیادہ حصہ لے رہی ہے۔

اس سے بھی زیادہ واضح مثال پر غور کریں

ایک عورت مال وراثت چھوڑ کر فوت ہوئی، ورثاء میں بیٹی، شوہر اور باپ ہیں۔

بیٹی کو آدھا حصہ ملے گا، شوہر کو چوتھا حصہ ملے گا اور باپ کو باقی ماندہ مال ملے گا، یوں سمجھ لیں گے 100 روپے میں سے پچاس روپے بیٹی کو ملے اور 25 روپے شوہر کو ملے اور باقی 25 روپے باپ کو ملیں گے۔

اب اس مثال میں غور کریں ایک عورت کو اتنا مال ملا جو کہ دو مردوں کو مل رہا ہے۔

کبھی مرد کی بہ نسبت کم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر پانچ حالتوں میں مرد کو عورت کی بہ نسبت دگنا مال ملتا ہے، دو حالتوں کا تعلق باپ اور ماں سے ہے، (1) جب میت کے ورثاء میں صرف والدین ہی ہیں اور کوئی اولاد بھی نہیں تو باپ کا حصہ ماں سے دگنا ہو جاتا ہے، کہ ماں کو ایک تہائی اور باقی دو تہائی باپ کو مل جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ میت کے باپ کے ذمے میت کی ماں کی (جو کہ اس کی بیوی ہے) کفالت ہے۔ (2) ورثاء میں میت کی صرف بیٹی اور والدین ہیں۔ ایسی صورت میں بیٹی کو نصف اور ماں کو چھٹا حصہ، باقی ماندہ باپ کو مل جائے گا جو کہ ثلث بچے گا۔ اور یہاں دگنا دینے میں بھی یہی مصلحت ہے کہ میت کی ماں کا واحد کفیل باپ ہے جو کہ اس کا شوہر ہے شرعاً بیٹی میت کی ماں یعنی اپنی دادی کی کفیل نہیں۔

واضح رہے کہ ایک صورت میں ماں باپ کا حصہ برابر ہو جاتا ہے، جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

باقی تین صورتیں یہ ہیں۔

(1) شوہر کی بیوی کی بہ نسبت دگنا، اور وجہ بھی واضح ہے کہ شوہر کے ذمہ بیوی اور بچوں کی کفالت بھی ہے۔

(2) میت کی اولاد میں مذکر کو مؤنث کی بہ نسبت دگنا ملے گا۔ وجہ بھی واضح ہے کہ ان بیٹوں پر میت کی بیٹیوں (جو کہ ان کی بہنیں ہیں) کی کفالت کا ذمہ ہے اور ان کی تربیت سے لے کر شادی تک کے معاملات انہیں کے ذمے ہیں۔ (3) میت کے بہن بھائیوں میں بھی باہم تقسیم اسی طرح ہو گی کہ مذکر کو مؤنث کی بہ نسبت دگنا ملے گا، وجہ وہی ہے جو ابھی مذکور ہوئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان پانچ صورتوں میں مذکر کا حصہ مؤنث سے دگنا ہے اور اس کی وجہ بھی واضح ہے۔ تو لہٰذا اس میں عورت میں کسی قسم کی زیادتی نہیں، بلکہ اس کے لئے مرد کی بہ نسبت آسانی ہی ہے، کیونکہ وہ اپنے حصے کو چاہے بچائے یا خرچ کرے لیکن مرد پر تو اس کی کفالت لازم ہے اس لئے اس کے لئے بچا کر رکھنا تو مشکل ہے۔

کبھی مرد کے برابر بھی ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر

میت کے اخیافی (ماں کی طرف سے بہن بھائی) کا حصہ ان کے درمیان مذکر و مؤنث میں برابر برابر تقسیم کیا جائے گا۔

اسی طرح اگر میت کی اولاد میں بیٹے موجود ہیں، ایسی صورت میں ماں باپ کا حصہ برابر ہو جاتا ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورت کو حصہ مل جاتا ہے اور مرد محروم ہو جاتا ہے۔
مثال کے طور پر کوئی شخص فوت ہوا، اور ورثاء میں بیٹی / بیٹیاں اور سگی بہن / بہنیں ہیں، اور چچا / علاتی بھائی / اخیافی بھائی ہیں۔
اس صورت میں بیٹی / بیٹیاں اور سگی بہن / بہنوں میں ہی کل مال تقسیم ہو جاتا ہے، اور چچا / علاتی بھائی / اخیافی بھائی محروم ہو جاتے ہیں۔
اور پھر میت کے ورثاء میں سے تین قسم کے مردوں (شوہر، بیٹا اور باپ) کی طرح تین قسم کی عورتیں بھی ایسی ہیں جو کلی طور پر میت کی وراثت سے محجوب (محروم) نہیں ہو سکتیں اور وہ بیوی، بیٹی اور ماں ہیں۔

خلاصہ کلام

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلامی نظام وراثت ایک ایسا عادلانہ نظام ہے کہ جس میں میت کے لئے وصیت کا حق رکھا گیا لیکن اس کی حدود کو بیان کر دیا گیا۔ تاکہ کسی بھی طبقے کے ساتھ ظلم وزیادتی نہ ہو۔

غیر مستحقین کے قبضے اور غصب کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اور اس میں ذرا برابر بھی قبضہ مافیا کی کوئی گنجائش نہیں۔

میراث میں عورت کا حصہ مقرر کیا اور اس حوالے سے ظلم کی تمام صورتوں کو ختم کیا۔ بلکہ معاشرے کے کمزور سے کمزور طبقے تک وراثت کی تقسیم کو پہنچایا گیا ہے۔

عمر کے حوالے سے صغر و کبر کے فرق کا ایسا خاتمہ کر دیا گیا کہ کوئی بدنیت کسی کی صغر سنی کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

ورثاء کے حصے کو ان کی حیثیت، درجہ اور ذمہ داری کو ملحوظ رکھتے ہوئے حصہ مقرر کیا گیا۔
واللہ ولی التوفیق، وما علینا الا البلغ المبین

(8) بازار شرعی نصوص کی روشنی میں

الشیخ ذوالفقار علی طاہر رحمہ اللہ

سیدنا امام مسلم رحمہ اللہ اپنی صحیح میں اللہ کے نبی ﷺ کی یہ حدیث لائے ہیں کہ :

"احب البلاد الی اللہ مساجدھا وابغض البلاد الی اللہ اسواقھا"

یعنی: اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین مقام، مسجدیں ہیں اور مبغوض ترین مقام، بازار ہیں۔

حدیث مبارک کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ بازار جانا حرام ہے بلکہ خرید و فروخت کیلئے جایا جا سکتا ہے۔ ہاں! انسان کا دل بازار ہی سے معلق ہو، بغیر کسی مقصد کے محض بازار کی رونق سے لطف اندوز ہونے کیلئے ہر وقت بازار جانے کیلئے مستعد رہتا ہو، ایسا رویہ عند اللہ مبغوض ہے۔ مزید تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

بازار کی اہمیت:

اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے:

وَقَالُوا مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ

الفرقان – 7

یعنی: اور انہوں نے کہا یہ کیسا رسول ہے؟ کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ اپنی تفسیر تیسیر القرآن ج3 صفحہ 303 میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: " اور کسب معاش یا خرید و فروخت کی خاطر وہ بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے، کھانا پینا یا بازاروں میں چلنا پھرنا، بزرگی یا نبوت کے منافی نہیں۔"

اسی طرح حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ اسی آیت کی وضاحت کرتے ہوئے تفسیر احسن البیان صفحہ 1043 میں رقمطراز ہیں۔

" یعنی رزق حلال کی فراہمی کیلئے کسب تجارت بھی کرتے تھے، مطلب اس سے یہ ہے کہ یہ چیزیں منصب نبوت کے منافی نہیں جس طرح کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ احادیث مبارکہ میں وارد بازار میں داخل ہونے کی دعا بھی بازار کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے اور خرید فروخت کے غرض سے بازار جانے کا جواز فراہم کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"لا اله الا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد يحيي ويميت وهو حي لا يموت بيده الخير وهو على كل شئ قدير"

بازار کی اہمیت صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے اس عمل سے بھی عیاں ہوتی ہے کہ وہ خرید وفروخت کے مقصد کے بغیر محض امورِ دینیہ کی انجام دہی یا امور دینیہ کی جانب عوام کی توجہ مبذول کرانے کیلئے بازار کا رخ کرتے تھے چناچہ دو مثالیں پیش خدمت ہیں:

(1) سیدنا امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ اپنی صحیح کی "کتاب العیدین فضل العمل فی ایام التشریق" میں لائے ہیں کہ:

"وكان ابن عمر، وأبو هريرة: «يخرجان إلى السوق في أيام العشر يكبران، ويكبر الناس بتكبيرهما"

یعنی عبداللہ بن عمر واور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما عشرۃ ذی الحج میں بازار کی جانب نکل کر تکبیرات کہتے اور لوگ بھی ان کی آواز سن کر تکبیرات کہنے لگ جاتے۔][3

اسی طرح مؤطا سیدنا امام مالک بن انس رحمہ اللہ میں یہ واقعہ موجود ہے کہ:

أن الطفيل بن أبي بن كعب أخبره أنه كان يأتي عبد الله بن عمر, فيغدو معه إلى السوق, قال: فإذا غدونا إلى السوق, لم يمر عبد الله بن عمر على سقاط, ولا صاحب بيعة, ولا مسكين, ولا أحد إلا سلم عليه, قال الطفيل: فجئت عبد الله بن عمر يوما, فاستتبعني إلى السوق, فقلت له: وما تصنع في السوق؟ وأنت لا تقف على البيع, ولا تسأل عن السلع, ولا تسوم بها, ولا تجلس في مجالس السوق؟ قال: وأقول: اجلس بنا هاهنا نتحدث, قال: فقال عبد الله بن عمر: يا أبا بطن, وكان الطفيل ذا بطن, إنما نغدو من أجل السلام, نسلم على من لقينا.

ترجمہ: تابعی طفیل بن ابی بن کعب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنھما کے پاس جاتا، وہ مجھے بازار لیکر جاتے اور وہ جس کے پاس سے بھی گزرتے، اُسے سلام کرتے، ایک دن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو حسبِ عادت انہوں نے مجھے بازار چلنے کو کہا، میں نے عرض کی کہ بازار جاکر کیا کرنا ہے؟ آپ نہ کوئی چیز خریدتے ہیں نہ بھاؤ معلوم کرتے ہیں تو بازار جانے کا کیا فائدہ؟ ہم گھر بیٹھ کر ہی گفتگو کر لیتے ہیں، تو انہوں نے فرمایا: "ہمارا بازار جانا صرف اس لئے ہے کہ ہمیں بازار میں جو بھی ملے ہم اسے سلام کریں گے۔][4"

معلوم ہوا خرید وفروخت یا امور دینیہ / امور خیر کی انجام دہی کیلئے بازار جانا معیوب نہیں ہے۔

عہد رسالت کے بازار

اگر کتبِ احادیث کی ورق گردانی کی جائے اور عہد رسالت کے بازار کے متعلق وارد احادیث کا جائزہ لیا جائے تو بازار میں احکام شرعیہ کے نفاذ کے حیرت انگیز واقعات سے واقفیت ہو جاتی ہے اور آدمی دنگ رہ جاتا ہے کہ اس دور میں بھی نفاذ شریعت کا کس قدر اہتمام تھا۔ چند واقعات ملاحظہ ہوں:

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

كنا في زمان رسول الله ﷺ نبتاع الطعام فيبعث علينا من يأمرنا بانتقاله من المكان الذي ابتعناه الى مكان سواه قبل ان نبيعه

یعنی ایک (خاص قسم کی) بیع کو حکم نبوی کے مطابق بنانے کیلئے اللہ کے رسول ﷺ ایک شخص کو (بازار) بھیجتے اور وہ لوگوں کو اس چیز کا حکم دیتا رہتا۔][5]

جبکہ صحیح مسلم ہی میں یہ حدیث بھی موجود ہے، صحابی فرماتے ہیں کہ:

قد رأيت الناس في عهد رسول الله ﷺ اذا ابتاعوا طعاما جزافا يضربون

یعنی عہد رسالت ﷺ میں خلافِ حکم نبوی بیع کرنے پر لوگوں کو سزا دی جاتی تھی۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وفي قوله: "يضربون" دليل على ان مشروعية تاديب من يتعاطى العقود الفاسدة واقامة الامام على الناس من يراعي احوالهم في ذٰلك

یعنی اس حدیث میں موجود یہ لفظ "یضربون" اس بات پر دلیل ہے کہ جو شخص کسی بیع فاسدہ کا ارتکاب کرے اس کے خلاف تادیبی کاروائی ہونی چاہئے اور امام کو چاہئے کہ وہ ایسے اشخاص کی تقرری کرے جو اس حوالے سے عوام الناس کی نگرانی کریں۔][6]

عہد رسالت میں تو بعض اوقات خود اللہ کے نبی ﷺ بازار نکل جاتے اور تجار کو خصوصی نصائح فرماتے کہ تم سے دوران تجارت کوتاہیاں سرزد ہو جاتی ہیں لہٰذا تم صدقہ کیا کرو تاکہ یہ صدقہ تمہاری ان کوتاہیوں کا کفارہ بن جائے جبکہ سنن اربعہ میں یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ ایک مرتبہ اللہ کے نبی ﷺ بازار تشریف لے گئے اور ایک جگہ ایک شخص کے پاس رک گئے، وہ کوئی چیز ڈھیر کی صورت میں فروخت کر رہا تھا، اللہ کے نبی ﷺ نے ڈھیر میں اپنا مبارک ہاتھ ڈالا اور باہر کھینچا تو آپ ﷺ کے مبارک ہاتھ پر تری لگ گئی یعنی وہ شخص اس

چیز کو اندر سے گیلا اور باہر سے خشک کر کے فروخت کر رہا تھا، اللہ کے پیغمبر ﷺ نے اسی موقع پر اس شخص کی سخت سرزنش کی۔

عہد رسالت میں بازار کی اس قدر نگرانی، یہی وجہ تھی کہ اس دور میں بازار کا ماحول انتہائی ایماندارانہ بنتا چلا گیا، ایک مثال ملاحظہ ہو:

حبان بن منقذ بن عمرو نامی ایک تاجر کسی غزوہ میں اللہ کے نبی ﷺ کے ہمراہ شریک ہوا، دوران قتال اسے سر میں چوٹ آئی جس سے اس کے دماغ اور زبان پر بڑا اثر پڑا، واپسی پر اللہ کے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی کیفیت بتائی اور تجارت میں خدع کے خدشہ کا اظہار کیا صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے اسے ایک اصول سمجھایا کہ تم جب بھی خرید و فروخت کرو تو یہ جملہ کہہ دیا کرو کہ "ولا خلابۃ" یعنی میرے ساتھ دھوکہ نہیں ہونا چاہئے (اس لئے کہ میں معذور ہوں)

یعنی یہ لفظ بازار میں اس کیلئے دھوکہ و فریب سے حفاظت کی علامت بن گیا۔

سبحان اللہ! عہد رسالت کے بازار کا ماحول کس قدر صافی و پاکیزہ تھا۔

یہ پیارے پیغمبر ﷺ کی تربیت کا اثر تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بازار جا کر باقاعدہ خرید و فروخت کے متعلق وارد احادیث پر بازار ہی میں عمل کرتے تھے اور ان احادیث کا تعارف کراتے تھے۔ دو واقعات پیش خدمت ہیں۔

صحیح مسلم میں وارد رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث میں کوئی چیز خرید کر کے وہیں پڑے پڑے اس چیز کو آگے فروخت کرنے سے منع اور اس چیز کو اٹھا کر اس کی جگہ منتقل کرنے کا حکم وارد ہے، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس حدیث پر کس طرح عمل پیرا ہوتے؟ ان کے شاگرد راوی کہتے ہیں:

کان یشتری الطعام جزافا فیحملہ الی اھلہ

یعنی: وہ چیز خریدتے اور خود اس چیز کو اٹھا کر اپنے اہل کی طرف منتقل کرتے۔][7]

شیخ صفی الرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اس طرزِ عمل پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں:

اما ما کان یفعلہ ابن عمر من نقل الطعام الی اھلہ فکان من غایۃ التزامہ و تمسکہ بلفظ الحدیث

یعنی رہا عبداللہ بن عمر کا بذاتِ خود طعام (سامان) کو بازار سے اہل کی طرف منتقل کرنا تو یہ ان کی طرف سے الفاظِ حدیث کے ساتھ غایت درجہ کا التزام و تمسک تھا۔]8[

اسی طرح صحیح مسلم ہی میں ایک اور حدیثِ مبارک ہے جس میں بیع کو پختہ کرنے کیلئے خریدار اور فروخت کرنے والے کو ایک دوسرے سے جدا ہو جانے کی شرط کا ذکر ہے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ بازار میں اس حدیث پر کس طرح عمل کرتے؟ ملاحظہ ہو:

فکان اذا بایع رجلا فاراد ان لا یقیلہ قام فمشیٰ ھنیئۃ ثم رجع الیہ

یعنی: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب کسی سے بیع کر لیتے اور اس بیع کو پختہ کرنے کا ارادہ کرتے اور چاہتے کہ وہ شخص بیع فسخ نہ کرے تو وہاں سے اٹھتے تھوڑا آگے چلے جاتے پھر واپس اس شخص کی طرف لوٹ آتے۔]9[

قارئین کرام! یہ تھی قرونِ اولیٰ کے بازار کی ایک جھلک کہ وہاں کس قدر احکامِ دینیہ نافذ تھے اور اس دور کے لوگ کس ذوق و شوق سے بازار ہی میں ان احکام پر عمل کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ وہاں نہ دھوکہ، فریب کا ڈر تھا نہ لوٹ مار کا خوف۔ اب آئیے ذرا عصر حاضر کے بازار کی چند جھلکیاں ملاحظہ کیجئے۔

عہد حاضر کے بازار

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ نے من ۃ المنعم ج 1 ص 422 میں عصر حاضر کے بازار کی بڑی درست و بجا منظر کشی کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

لانھا محل الغش و الخداع و الدس و الغرر و الربا و الایمان الکاذبۃ و اخلاف الوعد و الجفاء و الشر و الاعراض عن ذکر اللہ'

یعنی: بیشک بازار ملاوٹ، دھوکے، مغالطے، فریب، سود، جھوٹی قسموں، وعدہ کی خلاف ورزی، سختی و ظلم، برائی اور اللہ کے ذکر سے اعراض کی جگہ ہے۔

جی ہاں! عصر حاضر کے بازار میں یہی کچھ بلکہ اس سے بھی زیادہ نافرمانیوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے ذرا تفصیل ملاحظہ ہو:

بے پردگی و فحاشی:

عصر حاضر کے بازار کا طرۂ امتیاز ہے کہ بے پردہ خواتین بازار کا رخ کرتی ہیں اور وہاں غیر محرم دوکانداروں سے بڑی نرم ولچھے دار گفتگو کرتی ہیں، حالانکہ بے پردہ گھر سے نکلنا اور غیر محرم سے نرم لہجہ میں گفتگو، دونوں شرعاً ممنوع ہیں، ایک حدیث اور ایک آیت ملاحظہ ہو: اللہ کے نبی ﷺ کا فرمان ہے:

وَنِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مُمِيلَاتٌ مَائِلَاتٌ، رُءُوسُهُنَّ كَأَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ، لَا يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ، وَلَا يَجِدْنَ رِيحَهَا، وَإِنَّ رِيحَهَا لَيُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ كَذَا وَكَذَا

یعنی (اہل جہنم کی دو قسموں میں سے دوسری قسم) ان عورتوں کی ہے جو لباس پہننے کے باوجود برہنہ ہوں گی، وہ (اجنبی مردوں کو اپنی طرف) مائل کرنے والی اور خود (ان کی طرف) مائل ہونے والی ہوں گی، ان عورتوں کے سر (کے بال) بختی اونٹوں کی کوہان کی طرح ایک طرف جھکے ہوں گے، وہ عورتیں جنت میں داخل نہیں ہوں گی اور نہ ہی جنت کی خوشبو پاسکیں گی، حالانکہ جنت کی خوشبو اتنی اتنی مسافت سے محسوس کی جاسکتی ہے۔[10]

عصر حاضر کے بازار کی رونق ایسی ہی عورتوں سے بحال ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک

اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے:

فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ

الاحزاب-32

یعنی: پس نرم لہجہ میں بات مت کرو پس طمع بٹھالے گا وہ شخص جس کے دل میں مرض ہے۔

یہاں اللہ تبارک تعالیٰ امہات المؤمنین جو کہ پاک اور پاکیزہ ہیں، کو حکم دے رہا ہے کہ وہ اجنبی مردوں سے نرم لہجہ میں گفتگو نہ کریں جبکہ عصر حاضر کے بازار میں بے پردہ نکلنے والی عورتوں کا شیوہ ہی یہی ہے کہ وہ دوکانداروں سے بڑے ہی نرم وملائم لہجے میں گفتگو کرتی ہیں تاکہ اشیاء کم قیمت میں خرید سکیں۔ ایک عالم دین خواتین کو خطاب کررہے تھے، خطاب میں فرمانے لگے جس طرح تم بازار میں دوکانداروں سے نرم وملائم لہجہ میں گفتگو کرتی ہو اگر اسی لہجہ میں گھر میں اپنے خاوند سے گفتگو کرلیا کرو تو کافی حد تک گھر کا ماحول خوشگوار ہو جائے۔

گانا بجانا، مزمار و موسیقی یا شرکیہ قوالی، نعیہیں و نظمیں

عصر حاضر کے بازار کی ایک خرابی یہ بھی ہے، تقریباً ہر دوکان سے فحش و بے ہودہ مکالموں پر مبنی گانوں کی آواز آرہی ہوتی ہے یا شرکیہ اور بدعقیدگی پر مبنی نعتوں و نظموں کی آواز۔ دونوں ہی آوازیں معاشرے کے بگاڑ کا اولین سبب ہیں۔ یہی موسیقی ہے جو دل میں اس طرح نفاق اگاتی ہے جس طرح پانی فصل اگاتا ہے، اسی موسیقی کی وجہ

سے روز محشر موسیقی سننے والوں کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جائے گا۔اور شرکیہ قوالی و نعتیں و نظمیں عقیدہ کے بگاڑ کا باعث ہیں۔

فحاشی کے اڈے اور عاملوں (جادوگروں) کے آستانے:

ہمارے ملک میں ایسے بازاروں کا وجود بھی ہے جہاں فحاشی کے اڈے اور جادوگروں کے آستانے موجود ہیں حالانکہ شرعاً یہ ایسے جرائم ہیں جن پر کوڑوں، رجم اور قتل کی سزائیں مقرر ہیں اور احادیث میں ایسی کمائی سے قطعی طور پر منع کیا گیا ہے اور اسے حرام قرار دیا گیا ہے۔ صحیح مسلم میں اللہ کے نبی ﷺ کی حدیث ہے:

ان رسول اللہ ﷺ نھی عن ثمن الکلب و مھر البغی و حلوان الکاھن

یعنی: "رسول ﷺ نے کتے کی قیمت، زانیہ کی کمائی اور کاہن (عامل) کی مٹھائی (نذرانہ) سے منع فرمایا۔"

صحیح مسلم میں ایک اور حدیث موجود ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

شر الکسب مھر البغی

زانیہ کی خرچی بدترین (حرام) کمائی ہے۔

شراب خانے:

ہمارے ملک میں بازاروں میں شراب خانے بھی قائم ہیں، جہاں باقاعدہ شراب کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور غیر مسلموں کے ساتھ ساتھ مسلم نوجوان بھی شراب کے خریدار بن کر اس کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتے ہیں، حالانکہ شرعاً جہاں شراب پینا حرام ہے وہاں شراب کی بیع بھی حرام ہے۔جب سورۃ مائدۃ کی آیات

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ

المائدۃ-91/90

نازل ہوئیں، جس میں شراب کو نجس، عمل شیطان۔ دشمنی و بغض کا بیج، ذکر اللہ و نماز سے روکنے والا قرار دیکر اس سے اجتناب کرنے اور رک جانے کا حکم دیا گیا ہے، تو اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان اللہ تعالیٰ حرم الخمر فمن ادرکتہ ھذہ الآیۃ و عندہ منھا شیٔ فلا یشرب و لا یبع

یعنی: بے شک اللہ تعالیٰ نے شراب کو حرام قرار دے دیا ہے لہذا جسے یہ آیت معلوم ہو جائے اور اس کے پاس شراب میں سے کچھ موجود ہو تو وہ نہ تو پیئے اور نہ ہی فروخت کرے۔][11

اسی طرح صحیح مسلم کی ایک اور حدیث ہے، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

ان رجلا اهدى لرسول الله ﷺ راوية خمر فقال له رسول الله ﷺ: هل علمت ان الله تعالى قد حرمها، قال: لا، فسار انسانا فقال له رسول الله ﷺ بم سارر ته، فقال امرته ببيعها، فقال: ان الذى حرم شربها، حرم بيعها'

یعنی: ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مشکیزہ شراب تحفتاً لایا، آپ ﷺ نے اسے فرمایا: کیا تیرے علم میں نہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے حرام قرار دے دیا ہے، وہ کہنے لگا: جی نہیں میرے علم میں تو نہیں، پھر اس شخص نے ایک آدمی کے کان میں کوئی سرگوشی کی، رسول اللہ ﷺ کے استفسار پر اس نے بتایا کہ میں نے اس کے کان میں، شراب کو فروخت دینے کا کہا ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ ذات جس نے شراب پینا حرام قرار دیا ہے اسی نے شراب فروخت کرنا بھی حرام قرار دیا ہے۔"

کفار کی مذہبی اشیاء کی خرید وفروخت:

ہمارے ملک کے بازاروں کے مسلم دوکاندار اپنی دوکان میں فروخت کیلئے یہود ونصاریٰ اور ہندو کے مذہبی تہواروں یا اہل بدعت کے ایام خوشی وغمی میں استعمال ہونے والی ایسی اشیاء بھی رکھتے ہیں جن کی پوجا پاٹ ہوتی ہے یا جن اشیاء کے ذریعے اس غیر شرعی خوشی وغمی کا اظہار ہوتا ہے، حالانکہ ان تمام اشیاء کی خرید وفروخت ممنوع وحرام ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں اللہ کے نبی ﷺ کا فرمان موجود ہے کہ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

انه سمع رسول الله ﷺ يقول عام الفتح وهو بمكه ان الله ورسوله حرم بيع الخمر والميتته والخنزير والاصنام

یعنی: " انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فتح مکہ والے سال مکہ میں فرمارہے تھے کہ بیشک اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی خرید وفروخت حرام قرار دے دی ہے۔"

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فاشتمل الحدیث علی تحریم ثلاثۃ اجناس: مشارب تفسد العقول و مطاعم تفسد الطباع، و تغذی غذا خبیثا و أعیان تفسد الأدیان و تدعو الی الفتنۃ و الشرک

کہ یہ حدیث تین قسموں کی اشیاء کی تحریم پر مشتمل ہے: پینے کی اشیاء جو عقل کو فاسد کر دیتی ہیں اور کھانے کی اشیاء جو طبیعتوں کو فاسد کر دیتی ہیں اور جسم کو غذاء خبیث (حرام و ناپاک) فراہم کرتی ہیں اور ایسی چیزیں جو دین کو فاسد کر دیتی ہیں اور فتنہ و شرک کی دعوت دیتی ہیں۔]12[

معلوم ہوا ایسی چیزیں جو دین میں بگاڑ کا باعث بن سکتی ہوں یا فتنہ و شرک کی طرف دعوت دینے کا باعث ہوں اور کفار کے مختلف تہواروں کے تعارف کا سبب بنتی ہوں، فروخت کی غرض سے دوکان پر رکھنا حرام ہے، لیکن اس چیز کا ارتکاب عصر حاضر کے بازار میں خوب ہوتا ہے۔ تجار کی نگاہ سیزن سے بھرپور فائدہ اٹھانے پر ہوتی ہے ، مفاسد پر نہیں۔

سودی لین دین

عصر حاضر کے بازار میں خوب ہوتا ہے، یہ لین دین کرنے والے نتائج کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ ہم اس سودی لین دین کی وجہ سے ملعون ٹھہریں گے اور ہماری دنیا و آخرت دونوں برباد ہو جائیں گی، نہیں، ان کی نظر محض ظاہری سہولت و آسانی پر ہوتی ہے جو اس سودی لین دین سے مل رہی ہوتی ہے۔ حالانکہ اللہ کے نبی ﷺ نے کتنے اشخاص پر اس سود کی وجہ سے لعنت کی ہے، صحیح مسلم کی حدیث ملاحظہ ہو:

لعن رسول اللہ ﷺ آکل الربا و موکلہ و کاتبہ و شاھدیہ و قال ھم سواء

یعنی: رسول اللہ ﷺ نے سود لینے، دینے والے، کاتب اور دونوں گواہوں پر لعنت کی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ (سب حرام کا ارتکاب کرنے میں) برابر ہیں۔

جھوٹ یا جھوٹی قسموں کے ذریعہ کاروبار

عصر حاضر کے بازار میں یہ رویہ بھی معمول کی چیز ہے فروخت کنندہ ہو یا خریدار، دونوں اس عادتِ بد میں خوب مبتلا ہیں، حالانکہ یہ عادت نفع تو درکنار، خسارہ اور خوب بے برکتی کا باعث بنتی ہے۔

جیسا کہ اللہ کے نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

فان صدقا و بیّنا بورک لھما فی بیعھما و ان کذبا و کتما محقت برکۃ بیعھما

اگر خریدنے والااور فروخت کرنے والادونوں سچ بولیں اور اپنی قیمت اور اشیاء کے عیب کو بیان کر دیں تو یہ چیزان کیلئے باعثِ برکت ہے اور اگر کذب بیانی اور کتمان سے کام لیں گے تو یہ چیزان کی بیع کی برکت کو مٹادے گی ۔]13[

اسی طرح بیع میں قسمیں اٹھانے کے بارے میں اللہ کے نبی ﷺ کی ایک حدیث ہے:

الحلف منفعة للسلعة ممحقة للربح

یعنی: قسم اٹھانے سے سامان تو فروخت ہو جاتا ہے البتہ نفع (برکت) ختم ہو جاتی ہے۔]14[

اسی حوالہ سے ایک اور حدیث ہے:

ایاکم و کثرة الحلف فی البیع فیانه ینفق ثم یمحق

یعنی:۔بیع میں زیادہ قسمیں اٹھانے سے بچو اس لئے کہ یہ عادت سامان تو فروخت کرادیتی ہے لیکن برکت کو ختم کر دیتی ہے۔]15[

ناپ تول میں کمی

عصرِ حاضر کے بازار میں اس کبیرہ گناہ کا بھی خوب ارتکاب کیا جاتا ہے۔اس حوالہ سے چند نصوص ملاحظہ:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ

الرحمٰن-9

یعنی انصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول میں کم نہ دو۔

ایک اور مقام پر یوں فرمایا:

أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ﴿۱۸۲﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ

الشعراء-183/181

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ﴿۱﴾ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ﴿۲﴾ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ

المطففین-3/1

یعنی ہلاکت ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ "جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے تو اس پر قحط سالی، سخت محنت اور حکمرانوں کا ظلم مسلط کر دیا جاتا ہے۔]" 16[

قارئین کرام! یہ اور ان جیسی کئی اور بیوع، جن میں دھوکہ ہے، فریب ہے، بے ایمانی ہے، حرام کا ارتکاب ہے۔ عصر حاضر کے بازار میں، ان کا چلن عام ہے اور بازار بھی وہ جہاں بے پردگی ہے، فحاشی و بے ہودگی ہے۔ گانے نغمے اور موسیقی ہے، دین و شریعت کے ساتھ استہزاء کو فروغ دینے والے مقامات ہیں، ایسی اشیاء کی خرید و فروخت ہے جو یہود و نصاریٰ، ہندو اور دیگر کفار کے تہواروں اور ان کے باطل عقائد و نظریات کے تعارف و پہچان اور شہرت کا باعث ہیں۔

اگر ہم اپنی دولت، عزت، شہرت، تجارت، دنیا و آخرت پُر امن اور باحفاظت بنانا چاہتے ہیں تو اپنے بازاروں کو شرعی خطوط کے تحت چلانا ہو گا اور قرونِ اولیٰ کے بازاروں کا سا نظام، اپنے بازاروں میں رائج کرنا ہو گا۔ ورنہ ہر قسم کے نقصان، خسارہ اور گھاٹہ سے بچنا دشوار ہو گا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

[2] جامع الترمذی 5/291، حاکم 538۔ امام البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

[3] بخاری، کتاب العیدین، باب فضل العمل فی ایام التشریق

[4] مؤطا امام مالک، باب جامع السلام، ج2، ص 961، تحقیق فواد عبد الباقی

[5] صحیح مسلم

[6] منۃ المنعم ج3 ص14

[7] مسلم، کتاب البیوع

[8] منۃ المنعم ج3 ص14'

[9] صحیح مسلم: کتاب البیوع

[10] صحیح مسلم: کتاب اللباس والزینۃ، باب النساء الکاسیات العاریات المائلات الممیلات
[11] صحیح مسلم، کتاب البیوع
[12] منۃ المنعم ج3 ص53
[13] صحیح مسلم۔ کتاب البیوع
[14] صحیح مسلم۔ کتاب البیوع
[15] صحیح مسلم۔ کتاب البیوع
[16] ابن ماجہ ح4019 ذکرہ الالبانی فی الصحیحۃ

(9) مروجہ اسلامی بینکوں کے ذرائع تمویل(مروجہ مرابحہ ، اجارہ اور مشارکہ متناقصہ) کی شرعی حیثیت

الشیخ عثمان صفدر حفظہ اللہ

اسلامی بینکوں میں کیا جانے والا مرابحہ ،اجارہ اور مشارکہ متناقصہ وہ معاملات ہیں جو ان بینکوں کے دیگر معاملات پر حاوی ہیں۔سب سے زیادہ معاہدے اور ٹرانزیکشن انہی معاملات کے تحت ہوتی ہیں۔بلکہ اگر یوں بھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جس طرح سودی بینکوں کا اصل کاروبار سود پر قرض دینا ہے،اسی طرح اسلامی بینکوں کا اصل کاروبار "مرابحہ ،اجارہ اور مشارکہ متناقصہ" ہیں۔مروجہ ذرائع تمویل (Financing) کی شرعی حیثیت کے تعین کے لئے اس کا شرعی مرابحہ ،اجارہ اور مشارکہ متناقصہ کی شرائط وضوابط سے تقابل ضروری ہے۔

"مرابحہ": مرابحہ کا اصل ماخذ "ربح" یعنی منافع ہے۔مرابحہ کا لغوی طور پر مطلب یہ ہوگا کہ ایسا معاملہ کرنا جس میں ربح یعنی منافع طے ہو۔

فقہاء کے نزدیک مرابحہ کی اصطلاحی تعریف:

"کسی چیز کی خرید وفروخت اس کی اصل قیمت اور معلوم منافع کے ساتھ"۔

یعنی ایک شخص کسی چیز کی فروخت کرتے وقت خریدنے والے کو چیز کی اصل قیمت اور اپنا منافع بیان کر کے فروخت کرے۔

یہی وہ تعریف ہے جو فقہاء اسلام نے کتب فقہ مثلاً ہدایہ[1] بدائع الصنائع[2]،المغنی[3] روضۃ الطالبین 4 میں بیان کی ہے اگرچہ ان کی عبارات میں کچھ فرق ہے۔

بیع مرابحہ کے جواز کی دلیل:

(1) اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾

البقرۃ: 275

(2) علماء نے یہ قاعدہ ذکر کیا ہے کہ:

الأصل فی المعاملات الحل

کہ تجارتی و عوضی معاملات میں اصل یہ ہے کہ وہ حلال ہیں سوائے ان معاملات کے جنہیں شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ اور چونکہ بیع مرابحہ بھی معاملات سے متعلق ہے اور قرآن و حدیث میں کوئی ایسی نص نہیں ملتی جس میں اس کی حرمت کا تذکرہ ہو لہٰذا یہ بیع حلال ہے۔

بیع مرابحہ اور عام بیع میں فرق اور مرابحہ کی ضرورت

عام بیع (خرید و فروخت کا معاملہ) میں بھی اگرچہ بیچنے والا اپنا منافع رکھ کر بیچتا ہے لیکن اس میں اور بیع مرابحہ میں فرق اس منافع کو بیان کرنے کا ہے۔ بیع مرابحہ میں دوکاندار چیز کی اصل قیمت اور اپنا منافع دونوں بیان کرتا ہے۔ بیع مرابحہ کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ خریدار کو ہمیشہ یہ خدشہ رہا ہے کہ بیچنے والا جائز منافع سے زیادہ وصول نہ کرلے، اسی لئے جب بیچنے والا چیز کی صحیح قیمت اور اپنا منافع بیان کر دیتا ہے تو خریدار مطمئن ہو جاتا ہے۔ اسی لئے "بیع مرابحہ" کو علماء نے بیوع الامانہ کی ایک قسم قرار دیا ہے کہ یہ عام بیع کی نسبت زیادہ امانتداری کی متقاضی ہے۔

اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ

مروجہ مرابحہ، شرعی مرابحہ سے کافی مختلف ہے۔ مروجہ مرابحہ دراصل مرابحۃ للآمر بالشراء کہلاتا ہے۔ اس کی بنیادی صورت یوں ہوتی ہے کہ صارف بینک سے مخصوص چیز خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے جسے وہ خود خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ بینک مطلوبہ سامان صارف کے کہنے پر خرید کر مرابحہ کی صورت میں اسے فروخت کر دیتا ہے، اور صارف اس کی قیمت اقساط میں ادا کرتا ہے۔

مروجہ مرابحہ اور شرعی مرابحہ میں فرق

مروجہ مرابحہ اور شرعی مرابحہ میں کافی حوالوں سے فرق پایا جاتا ہے جس میں سے تین بنیادی فرق یہ ہیں:

(1) شرعی مرابحہ میں بیچنے والے کے پاس سامان پہلے سے موجود ہوتا ہے جسے وہ معلوم منافع پر فروخت کرتا ہے۔ مروجہ مرابحہ میں بینک کے پاس سامان موجود نہیں ہوتا بلکہ وہ صارف کے کہنے پر مطلوبہ سامان خرید کر اسے فروخت کرتا ہے۔

(2) شرعی مرابحہ میں ادائیگی عموماً نقد ہوتی ہے، جبکہ مروجہ مرابحہ میں نقد ادائیگی کا کوئی تصور نہیں۔

(3) شرعی مرابحہ دراصل ایک بیع یعنی خرید و فروخت کا معاملہ ہے، جبکہ مروجہ مرابحہ اسلامی بینکوں میں طریقہ ہائے تمویل (mode of financing) کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اسلامی بینکوں کے حامی

مفتی تقی عثمانی صاحب خود یہ اقرار کرتے ہیں کہ:" بنیادی طور پر مرابحہ طریقہ تمویل نہیں بلکہ بیع کی ایک خاص قسم ہے"۔] 4[

مروجہ مرابحہ کی تفصیل

مروجہ مرابحہ کی تفصیل تصویر نمبر(ا) اوراس کی وضاحت میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

picture

وضاحت:

(1)سب سے پہلے صارف بینک سے ایک معاہدہ کرتا ہے جسے (Master Murabaha Facility Agreement) کہا جاتا ہے۔اس معاہدہ میں:

صارف بینک سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ مطلوبہ سامان بینک سے خریدے گا۔

اس وعدہ کو مزید پختہ کرنے کیلئے بینک صارف سے ایک مخصوص رقم بطور سیکیورٹی جمع کرانے کا تقاضا کرتا ہے،تاکہ صارف کے وعدہ سے مکر جانے کی صورت میں اگر بینک وہ سامان خرید چکا ہو تو اسے واپس کرنے یا کسی اور کو بیچنے کی صورت میں ہونے والے نقصان کو اس سیکیورٹی سے پورا کرے۔

بینک صارف کو یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ مطلوبہ سامان خرید کر مقررہ مدت میں اسے بیچے گا۔

ادائیگی کا طریقہ کار اور بینکاری کے دیگر معاملات کی تفصیلات طے کی جاتی ہیں۔

(2)پھر بینک اسی صارف سے ایک معاہدہ کرتا ہے جسے (Agency Agreement) کہا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کے تحت بینک اسی صارف کو اپنا وکیل مقرر کرتا ہے کہ وہ بینک کی وکالت یا نیابت میں جاکر مطلوبہ سامان خرید لے۔

(3) بینک اس سامان کی قیمت ادا کرتا ہے جو کبھی تو وکیل کے ذریعہ یا کبھی براہ راست بیچنے والے تک پہنچتی ہے۔

(4)سامان صارف کو موصول ہوتا ہے اور جب تک وہ سامان صارف تک نہ پہنچے اور صارف اسے خرید نہ لے وہ بینک کی ملکیت ہوتا ہے اور سامان کی تلفی یا کسی نقصان کی صورت میں بینک اس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

(5)پھر ایک الگ معاہدہ کے تحت صارف بینک سے وہ سامان خرید لیتا ہے اور اس کی ملکیت حاصل کرتا ہے۔

(6)صارف اس سامان کی قیمت اقساط میں بینک کو ادا کرتا ہے۔

اسلامی بینکوں کے (Murabaha Financing) اور سودی بینکوں کے (Interest base Financing) میں بنیادی فرق:

اسلامی بینکوں کے ربح (منافع) اور سودی بینکوں کے ربا (سود) میں بنیادی فرق مخاطرت (Risk) کا ہے۔
سودی بینک قرض دیتے ہیں اور اس پر سود وصول کرتے ہیں اور اس میں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوتا۔ مرابحہ میں اسلامی بینک صارف کا مطلوبہ سامان خریدتے ہیں پھر صارف کو بیچتے ہیں اور اس دوران انہیں نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے، یہی اندیشہ اور رسک اسلامی بینکوں کے منافع کو ربا سے نکال کر ربح بناتا ہے۔
سوال یہ ہے کہ کیا واقعی اسلامی بینک اس پورے عمل میں کسی قسم کے اندیشہ، رسک، یا ضمانت کو قبول کرتے ہیں ؟

کیا مرابحہ میں اسلامی بینک حقیقی خرید و فروخت کرتے ہیں؟ کیونکہ ضمانت اور رسک حقیقی خرید و فروخت میں ہے، کاغذی بیع میں نہیں!۔
کیا اسلامی بینک حقیقی بیع کی تمام شرعی شرائط پر عمل پیرا ہوتے ہیں؟
حقیقت یہ ہے کہ اگر سرسری نظر سے بھی اسلامی بینکوں میں جاری مرابحہ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں کسی قسم کا رسک، مخاطرت نظر نہیں آتی۔
حقیقی خرید و فروت میں بازار میں موجود ایک تاجر کو عمومی طور پر دو بنیادی اندیشوں کا سامنا ہوتا ہے:
.1 جو سامان اس کے پاس موجود ہے وہ کوئی خریدے گا بھی یا نہیں ؟۔
.2 سامان فروخت ہو کر خریدنے والے کے پاس اس کی منتقلی تک اس کے ضائع ہونے تلف ہو جانے اور دیگر ہر قسم کے نقصان کو تاجر نے ہی برداشت کرنا ہوتا ہے۔
اسلامی بینک کو عملی طور پر ان دونوں اندیشوں کا سامنا نہیں ہوتا۔
.1 بینک کے پاس کوئی سامان نہیں جس کے نہ بکنے کا اسے کوئی اندیشہ ہو۔
.2 صارف کے کہنے پر بینک کوئی بھی سامان خریدنے سے پہلے صارف سے تحریری صورت میں وعدہ لیتا ہے کہ وہ یہ سامان بینک سے لازماً خریدے گا۔
.3 بینک اس وعدہ پر ہی اکتفاء نہیں کرتا بلکہ پہلے سے صارف سے ایک مخصوص رقم سیکیورٹی کی مد میں وصول کرتا ہے تاکہ صارف کے وعدہ سے مکر جانے کی صورت میں ہونے والے نقصان کو پورا کیا جا سکے۔

.4سامان خریدنے سے لے کر صارف تک پہنچنے تک بینک کا عملاً کوئی کردار نہیں ہوتا۔ بلکہ سامان بیچنے والے کے پاس سے براہ راست صارف تک منتقل ہوتا ہے اور بینک پہلے اسے اپنے قبضہ میں لینے کی کوئی زحمت نہیں کرتا۔

ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی بینک مرابحہ کے حوالہ سے کسی قسم کا رسک یا مخاطرت کا سامنا کرتا ہے؟ اور اگر بینک کو مرابحہ میں تمویل کے ذریعہ جو منافع حاصل ہو رہا ہے اس کا دارومدار مخاطرت پر نہیں تو اس "ربح" کو "ربا" سے الگ حکم دینے کا کیا جواز ہے؟۔

مروجہ مرابحہ پر چند بنیادی شرعی اعتراضات:

) پہلا اعتراض(

(Master Murabaha Facility Agreement)میں صارف سے لیا جانے والا وعدہ اور اس کا لازمی ایفاء: وعدہ کی پاسداری شریعت میں اخلاقی طور پر یقیناً فرض ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۖ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾

الاسراء:34

ترجمہ: "وعدے پورے کرو، بیشک وعدوں کی پاسداری کے متعلق پوچھا جائے گا"۔ اسی لئے ایک مسلمان کا یہ دینی تقاضا ہے کہ وہ اپنے وعدوں کی پاسداری کرے، لیکن قانونی طور پر کسی وعدے کو جبراً پورا کرانا یا قانونی طور پر وعدے کے ایفاء کو لازم قرار دینا خصوصاً بیوع کے معاملات میں بہت سے شبہات کو جنم دیتا ہے۔ اسلامی بینکنگ کے کتنے ہی مسائل ایسے ہیں جس میں صارف سے وعدہ لیا جاتا ہے اور اسے قانوناً لازم قرار دیا جاتا ہے اور اس حیلہ کے ذریعہ بینک اپنے حصہ کا سارا رسک صارف کے کھاتے میں ڈال کر بے نیاز ہو جاتا ہے۔

مروجہ مرابحہ میں بھی اسی حیلہ کا استعمال کیا گیا ہے، صارف سے وعدہ لیا جاتا ہے کہ جب بینک اس کا مطلوبہ سامان حاصل کرلے گا تو صارف اسے ضرور خریدے گا، یا یہ وعدہ لیا جاتا ہے کہ اگر صارف نے اس سامان کو نہ خریدا تو بینک کو ہونے والا نقصان صارف برداشت کرے گا، اور اس حیلہ کے استعمال سے مرابحہ میں جو شرعی مخالفات سامنے آتی ہیں ان سے قطعی طور پر صرف نظر کیا جاتا ہے۔ ان شرعی مخالفات میں سب سے بدتر مخالفت مروجہ مرابحہ کا سودی تمویل سے مشابہ ہو جانا ہے۔ ان مخالفات کا ذکر آئندہ سطور میں ہوگا ان شاء اللہ۔

مروجہ مرابحہ میں صارف سے لئے جانے والے یکطرفہ وعدہ اور اس کے لازمی ایفاء کے حوالہ سے اسلامی بینکوں کے ذمہ داران دو بنیادی دلائل پیش کرتے ہیں:

)پہلی دلیل: (

مذہب مالکیہ میں ایفاء وعدہ کو لازم قرار دیا گیا ہے، لہٰذا اسی کو دلیل بناتے ہوئے مرابحہ میں صارف پر ایفاء وعدہ کو لازم قرار دیا گیا ہے۔[5]

اس دلیل کے جواب میں چند باتیں عرض کرنا چاہوں گا:

(1) پاکستان میں بالخصوص اسلامی بینکاری کی بنیاد مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب اور ان کے رفقاء نے رکھی ہے، اور مفتی صاحب اور ان کے رفقاء نے اسلامی بینکاری کی بنیادوں کو عموماً فقہ حنفی پر استوار کیا ہے کیونکہ مفتی صاحب کا تعلق مسلک حنفی سے ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ جب تمام بنیادیں اور اصول فقہ حنفی سے مستمد و مستفاد ہیں تو اس معاملہ میں فقہ حنفی سے درخور اعتناء کا کیا مطلب؟ کیا یہ

خروج عن المذھب

نہیں؟۔ خود مفتی تقی عثمانی صاحب اسلامی بینکاری کے متعلق غلط فہمیوں کے ازالہ میں فرماتے ہیں:

خروج عن المذھب

اس کو کہتے ہیں کہ ہمارے مذہب میں کوئی مسئلہ مصرح ہو کہ یہ چیز ناجائز ہے اور ہم اس کو چھوڑ کر مالکی یا شافعی مذہب سے مسئلہ لے لیں جب کہ وہاں اس کو جائز کہا گیا ہو۔

خروج عن المذھب

ہے"۔[6]

عرض یہ ہے کہ فقہ حنفی میں بھی وعدہ کے ایفاء کو مستحب تو کہا گیا ہے لیکن قانونی طور پر اس ایفاءِ وعدہ کو لازم قرار نہیں دیا گیا۔ جیسا کہ ابن عابدین نے

العقود الدریۃ

میں ذکر کیا ہے2۔ سوال یہ ہے کہ جب فقہ حنفی میں یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ موجود ہے تو پھر فقہ مالکی کی طرف جانے کی کیا ضرورت پیش آئی؟۔ کیا یہ

خروج عن المذھب

نہیں ؟۔

بہر حال یہ ایک الزامی توجیہ ہے، ہمارا تعلق الحمد للہ اہلحدیث مسلک سے ہے جس میں مذہب قرآن وحدیث ہے اور اس میں

خروج عن المذھب

کا کوئی تصور نہیں۔

(2)فقہ مالکیہ کی طرف جس بات کی نسبت کی گئی ہے، میں بہت احترام سے ذکر کرنا چاہوں گا کہ یہ نسبت غلط ہے۔مالکیہ نے ایفاء وعدہ کو اخلاقاًاور قانوناً دونوں لحاظ سے واجب قرار تو دیا ہے لیکن وہ صرف تبرعات میں ہے، یعنی جب ایک شخص کسی سے بھلائی کا ارادہ کرے، اس سے وعدہ بھی کرلے، تو دینی لحاظ سے بھی اور قانونی لحاظ سے بھی اس پر یہ واجب ہے کہ اس وعدہ کو پورا کرے، اور اس کے لئے بھی انہوں نے ایک شرط رکھی ہے کہ جب اس وعدہ کی وجہ سے جس سے وعدہ کیا گیا ہو وہ کسی معاملہ میں یا کام میں داخل ہو جائے تو وعدہ کرنے والے پر ایفاء دینی اور قانونی طور پر واجب ہے۔

امام سحنون مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جس وعدہ کا ایفاء لازم ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص کہے کہ تم اپنا مکان گرادو میں تمہیں قرض دوں گا تاکہ تم نیا مکان بنا سکو، یا تم حج کے لئے نکلو میں تمہیں زادراہ فراہم کروں گا، یا تم فلاں سامان خرید لو میں تمہیں ادھار پیسے دوں گا، یا تم شادی کرلو میں تمہیں قرضہ فراہم کروں گا تو ایسے وعدہ کو پورا کرنا لازم ہے، کیونکہ وہ شخص اس وعدہ کی بناء پر اس کام میں داخل ہوا ہے، جہاں تک محض وعدہ کا تعلق ہے تو اسے پورا کرنا مکارم اخلاق سے تعلق رکھتا ہے لیکن واجب نہیں ہے"۔][7

جہاں تک عقود معاوضات (یعنی تجارتی معاملات) کا تعلق ہے تو اس میں فقہاء مالکیہ نے وعدہ ایفاء کو واجب قرار نہیں دیا، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جس معاملہ میں وعدہ کو شامل کرکے اس کے ایفاء کو مالکیہ کی طرف نسبت کرکے لازم قرار دیا جارہا ہے، مالکیہ نے تو اس معاملہ کو ہی سرے سے ناجائز قرار دیا ہے اگرچہ وہ بغیر وعدہ کے ہی کیوں نہ ہو!!۔

امام ابن جزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " بیع عینہ کی تین اقسام ہیں: پہلی قسم: یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے کہے کہ تم فلاں سامان میرے لئے دس درہم میں خرید لو میں تمہیں کچھ عرصہ بعد پندرہ درہم دوں گا۔ یہ سود ہے اور حرام ہے"۔[8]

امام ابن رشد مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " اگر کوئی شخص یوں کہے کہ تم میرے لئے فلاں سامان دس درہم نقد میں خرید لو میں تم سے بارہ درہم ادھار میں خرید لوں گا، تو یہ معاملہ حرام ہے"[9]۔ یہی بات دیگر فقہاء مالکیہ نے بھی کہی ہے جن میں الباجی[10]، ابن عبدالبر[11] اور قاضی عیاض رحمہم اللہ[12] جیسے جلیل القدر فقہاء شامل ہیں۔ اور جس حرام معاملہ کی ان علماء نے نشاندہی کی ہے وہ بعینہ مروجہ مرابحہ کی صورت ہے۔ تو ایک ایسے معاملہ میں وعدہ کے لازمی ایفاء کی نسبت ان علماء کی طرف کیسے کی جاسکتی ہے جس معاملہ کو انہی علماء نے صریح حرام قرار دیا ہو؟

عقود معاوضات میں

الوعد الملزم

(لازمی ایفاء کا وعدہ) کی مالکیہ کی طرف نسبت کو بہت سے علماء نے غلط قرار دیا ہے، ان میں سے اسلامی بینکاری کے ماہر علماء میں ڈاکٹر سلیمان الاشقر[13]، ڈاکٹر رفیق

یونس المصری[14]، محترم ربیع محمود الروبی[15]، علامہ عبداللہ بن بیہ[16]، ڈاکٹر علی احمد سالوس[17]، فضیلۃ الشیخ بکر ابوزید[18] جیسے جلیل القدر علماء بھی شامل ہیں۔

)دوسری دلیل: (

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "لاضرر ولاضرار"۔ کہ " نہ کسی کو نقصان پہنچاؤ نہ خود نقصان اٹھاؤ"۔ اس حدیث کی روشنی میں صارف سے لیا جانے والا وعدہ بالکل جائز ہے، کیونکہ اگر بینک صارف کے کہنے کے مطابق سامان خرید لے پھر صارف سامان لینے سے انکاری ہو جائے اور بینک کو کوئی اور ایسا صارف نہ ملے جو بینک سے یہ سامان خریدے تو بینک کو بہت نقصان ہو گا، اسی لئے بینک صارف سے وعدہ لیتا ہے، کیونکہ بینک نے یہ سامان صارف کے کہنے پر خریدا تھا، اپنے لئے تو نہیں خریدا!، لہٰذا صارف کے انکاری ہو جانے پر بینک کو ہونے والے نقصان کا ذمہ دار صارف ہے اور اسے یہ نقصان برداشت کرنا چاہئے۔

اس دلیل کا جواب چند نکات کی صورت میں دینا چاہوں گا:

اگر بینک نے یہ سامان صارف کے لئے خریدا ہے تو بینک تو صارف کا وکیل ہوا، اور اس صورت میں بینک کا سامان کی قیمت ادا کر کے صارف سے اس سے زیادہ وصول کرنا قرض دے کر سود طلب کرنے کے مترادف ہے اور قطعی حرام ہے۔

اگر بینک نے یہ سامان اپنے لئے خریدا ہے تو صارف اس کے نقصان کا ذمہ دار نہیں ہے، کیونکہ اگر صارف وہ سامان خریدنے سے انکار کر دیتا ہے اور بینک وہ سامان کسی اور کو بیچے اور اس میں بینک کو منافع ہو تو کیا وہ منافع بینک اپنے پاس رکھے گا یا صارف کو دے گا؟۔ اگر نقصان صارف نے برداشت کرنا ہے تو اصولی طور پر منافع بھی صارف ہی کو ملنا چاہئے، اس منافع کا تذکرہ بینک کیوں نہیں کرتا؟۔

اگر بینک اس پورے معاملہ میں رسک نہیں اٹھاتا تو پھر منافع کا حقدار کیسے ہو سکتا ہے؟۔ فضیلۃ الشیخ بکر ابو زید رحمہ اللہ بیع مرابحہ کے جواز کی صورت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: " یہ جواز اس لئے ہے کہ اس صورت میں ایفاء وعدہ کا التزام نہیں ہے، نہ ہی نقصان کا عوض ادا کرنے کی شرط ہے، تو اگر سامان تلف ہو جائے تو صارف پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہو گی، بینک یہ سامان خریدتے وقت رسک لیتا ہے، اسے مکمل یقین نہیں ہوتا کہ صارف اس سے یہ سامان خریدے گا یا نہیں؟ اور یہی مخاطرت (رسک اٹھانا) اس معاملہ کو جواز کی شکل دیتا ہے "۔ یعنی اگر بینک اس معاملہ میں کسی قسم کا رسک اٹھانے پر رضامند نہیں تو مرابحہ کی صورت میں حاصل ہونے والا منافع بھی اس کے لئے جائز نہیں۔ کیونکہ عدم مخاطرت کی صورت میں یہ معاملہ قرض پر سود لینے کے مشابہ ہو جائے گا۔

لاضرر ولاضرار

والا قاعدہ بینک صرف اپنے لئے ہی کیوں استعمال کرتا ہے، کیا یہ قاعدہ صارف پر منطبق نہیں ہوتا، جو بیچارہ سامان نہ لینے کے باوجود بھی ایک بھاری رقم ادا کرنے کا پابند ہے!، کیا یہ اس کے لئے نقصان اور ضرر نہیں؟۔

وعدہ کا لازمی ایفاء: ایک جادو کی چھڑی!

اسلامی بینکاری نظام میں "وعدہ کا لازمی ایفاء" ایک جادو کی چھڑی ثابت ہوئی ہے، جہاں کوئی شرعی قباحت آئی وہاں اس جادو کی چھڑی کو استعمال کر کے اس حرام کو حلال بنا لیا گیا ہے، مثلاً:

مشارکہ متناقصہ میں مشارکہ کے معاہدہ میں ہی صارف سے وعدہ لے لیا جاتا ہے کہ وہ اس مشارکہ کے ذریعہ جو چیز خریدی گئی ہے اس میں بینک کے جو حصص (شیئرز) ہیں انہیں خریدے گا۔اب اگر ظاہری طور پر دیکھا جائے تو یہ ایک معاہدہ میں دو معاہدے ہیں:(1) مشارکہ کا معاہدہ۔(2) مشارکہ کے تناقص (بتدریج ختم کرنے) کا معاہدہ، جسے (Diminishing Musharakah) کہا جاتا ہے۔اور اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

نهى رسول اللّٰه ﷺ عن صفقتين في صفقة واحدة

مسند احمد بن حنبل: مسند عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حسن

کہ " نبی ﷺ نے ایک معاہدہ میں دو معاہدے کرنے سے منع فرمایا ہے"۔اب یہاں معاہدے کو لازمی وعدہ کا نام دے کر جائز کر لیا گیا ہے، اور راقم یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ معاہدہ میں اور وعدہ کے لازمی ایفاء میں سوائے نام کے اور کیا فرق ہے؟ کیا لازمی ایفاء، معاہدہ کی خصوصیت نہیں کہ جسے وعدہ کے ساتھ منطبق کر دیا گیا ہے؟۔

اسلامی بینکوں میں لیزنگ جسے اجارہ

المنتهيه بالتمليك

کہا جاتا ہے میں صارف سے یہ وعدہ کیا جاتا ہے کہ اگر صارف نے ایک مخصوص عرصہ تک کرایہ ادا کیا تو بینک اسے وہ چیز جس کا وہ کرایہ ادا کر رہا تھا بالکل معمولی قیمت میں بیچ دے گا یا ہدیہ کر دے گا۔ کسی چیز کو بیچنا یا عوض کے بدلہ ہدیہ کرنا دونوں ایک معاہدہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور دونوں میں سے ایک معاہدہ کا ذکر اجارہ کے معاہدہ میں ضرور ہوتا ہے، یعنی پھر ایک معاہدہ میں دو معاہدے (1) اجارہ کا معاہدہ۔(2) ہدیہ یا بیچنے کا معاہدہ۔اور اس معاملہ کو بھی لازمی وعدہ کہہ کر حلال کر لیا جاتا ہے۔

مضاربہ میں سرمایہ کی ضمانت لینا سود ہے، اسلامی بینک اول تو کسی سے مضاربہ کرتے نہیں ہیں اگر کسی کو مضاربہ پر سرمایہ فراہم کرتے ہیں تو اس سے یہ وعدہ لیتے ہیں کہ وہ ان کا سرمایہ انہیں ضرور لوٹائے گا، اور اس سود کو بھی لازمی وعدہ کا نام دے کر جائز کر لیا جاتا ہے۔

مرابحہ میں بھی صارف سے لئے جانے والا وعدہ جو کہ دراصل معاہدہ ہے اس سے بہت سی شرعی قباحتیں جنم لیتی ہیں:

(1) ملکیت میں آنے سے پہلے چیز کی فروخت

جب صارف سے یہ وعدہ لیا جاتا ہے کہ وہ بینک سے مطلوبہ سامان ضرور خریدے گا تو یہ وعدہ بذات خود ایک معاہدہ کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے کیونکہ معاہدہ میں بھی وہی خصوصیات ہوتی ہیں جو اس وعدہ میں پائی جارہی ہیں، یعنی سامان کی تعیین، قیمت کا تعین، ادائیگی کا طریقہ کار، ایجاب وقبول، یہ سب کچھ اس وعدہ میں شامل ہوتا ہے، اور پھر بعد میں جو الگ سے مرابحہ کا ایگریمنٹ کیا جاتا ہے وہ صرف دکھلاوا ہوتا ہے، کیونکہ صارف تو اس وعدہ کے ذریعہ سامان خریدنے کا پابند ہو چکا ہوتا ہے۔ تو اس میں سب سے پہلی قباحت یہ آتی ہے کہ بینک جب صارف سے یہ وعدہ لے رہا ہوتا ہے اس وقت مطلوبہ سامان بینک کے پاس موجود نہیں ہوتا تو گویا کہ بینک صارف کو وہ چیز بیچ رہا ہے جس کا وہ مالک نہیں اور اس سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں : " میں نے نبی ﷺ سے عرض کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ،

اگر ایک شخص میرے پاس آکر مجھ سے ایسی چیز مانگتا ہے جو اس وقت میرے پاس نہیں ہوتی تو کیا میں بازار سے خرید کر پھر اس کو بیچ دوں؟ تو نبی ﷺ نے فرمایا: "نہیں، جو چیز تمہارے پاس نہیں تم اس کا معاہدہ نہ کرو"۔[19] اس حدیث میں بالکل واضح ہے کہ اگر کسی شخص سے کوئی سامان طلب کیا جائے جو اس کے پاس موجود نہیں تو وہ طالب سے اس سامان کے متعلق کوئی وعدہ یا معاہدہ ہر گز نہ کرے جب تک کہ وہ سامان اس کی ملکیت میں نہ آجائے۔ جبکہ بینک سامان کی ملکیت حاصل کرنا تو درکنار ابھی اسے اس کی مکمل معلومات بھی نہیں ہوتیں کہ وہ پہلے ہی صارف سے تمام وعدے لے چکا ہوتا ہے، اور اس شرعی قباحت کو یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ یہ تو صرف ایک وعدہ ہے کوئی معاہدہ تو نہیں!۔

(2) خیار البیع کی نفی

نبی ﷺ کا فرمان ہے:

البیعان بالخیار مالم یتفرقا، و کانا جمیعا

صحیح بخاری: کتاب البیوع، باب اذا بین البیعان و لم یکتما و نصحا

کہ تاجر اور صارف دونوں کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے جب تک وہ دونوں بیع کی جگہ پر اکٹھے ہوں۔ یعنی جب جدا ہو جائیں تو یہ اختیار ختم ہو جاتا ہے۔ اس اختیار کو علماء خیار البیع کہتے ہیں، یہ اختیار تاجر اور خریدار دونوں کے لئے ہے اور شریعت کا عطا کردہ ہے اسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا، اور تمام علماء کا اس پر اتفاق واجماع ہے۔ لیکن مروجہ

مرابحہ میں صارف سے وعدہ لے کر اس اختیار کو چھین لیا جاتا ہے اور شریعت کے حکم کی صریحاً نافرمانی کی جاتی ہے۔

(4)سودی معاملہ سے مشابہت

جیسا کہ بحث کے آغاز میں یہ ذکر ہوا کہ سودی بینکوں اور اسلامی بینکوں کے معاملات میں بنیادی فرق مخاطرت (رسک) کا ہے۔ سودی بینک کے کسی معاملہ میں مخاطرت نہیں ہے اس لئے ان کا منافع ربا (سود) کہلاتا ہے۔ اسلامی بینکوں کا منافع اس وقت تک جائز ہوگا جب تک ان کے معاملات میں مخاطرت کا عنصر موجود رہے گا۔ لیکن مرابحہ میں جو تھوڑا بہت مخاطرت کا عنصر موجود تھا اسے بھی صارف سے لئے گئے وعدہ کے ذریعہ ختم کر دیا گیا۔

روجہ مرابحہ میں الوعد الملزم (لزوم وعدہ) کے معاشرہ پر اثرات

مروجہ مرابحہ میں صارف سے لئے گئے لازمی وعدہ کے معاشرہ پر بھی بہت گہرے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں ۔جب بینک کو یہ اطمئنان ہوتا ہے کہ صارف نے اس سے یہ سامان لازمی خریدنا ہے تو اسے نہ اس بات سے کوئی غرض ہوتی ہے کہ یہ سامان ضرورت کا ہے یا تعیش کا؟ یہ چیز معاشرہ میں زیادہ پھیل رہی ہے اور مقبول ہے یا کوئی اور چیز؟ اور نہ ہی اسے اس بات سے کوئی غرض ہوتی ہے کہ یہ سامان مناسب قیمت میں کہاں سے ملے گا؟، اسے صرف یہ غرض ہوتی ہے کہ یہ سامان مل جائے، چاہے جتنی قیمت پر ملے اور یہ سامان صارف کے سپرد کر کے اس سے زائد رقم وصول کی جائے۔ اسلامی بینکوں میں جو (Assets Financing) ہے اس میں عموماً ایسی چیزیں طلب کی جاتی ہیں جو معاشرہ میں زیادہ رائج نہیں ہوتیں۔ اسلامی بینک کے اس رویہ کی وجہ سے معاشرہ میں حقیقی تجارتی ماحول پیدا نہیں ہو سکتا، تاجروں کے درمیان چیز بیچنے میں مقابلہ بازی کا جو رجحان ہوتا ہے اور اس رجحان کی وجہ سے اشیاء کی قیمتوں میں کمی ہوتی ہے یہ رجحان بھی مروجہ مرابحہ کی وجہ سے ختم ہو سکتا ہے، اور بینک کا صرف اپنے منافع کو سامنے رکھنے کی وجہ سے ایسی چیزوں کی خریداری کرنا جو معاشرہ میں رائج نہ ہوں اس سے معاشرہ کی حقیقی تجاری سرگرمیوں کے متاثر ہو جانے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔

مرابحہ میں الوعد الملزم (لازمی وعدہ) کا شرعی تبادل

صارف کا مطلوبہ سامان کی خریداری سے انکاری ہونے کے سبب اسلامی بینک کو ہونے والے نقصان سے بچنے کے لئے دیگر شرعی متبادل موجود ہیں جنہیں اختیار کر کے بینک ممکنہ نقصان سے تحفظ بھی حاصل کر سکتا ہے اور اس میں کوئی شرعی قباحت بھی موجود نہیں۔ان متبادل میں سے چند اہم یہ ہیں:

اسلامی بینک سامان خریدتے وقت تین دن کے خیار الشرط کا مطالبہ کرے۔خیار الشرط سے مراد یہ ہے کہ خریدار یہ شرط لگائے کہ مجھے تین دن کا اختیار دیا جائے اگر میں سامان لوٹانا چاہوں تو ان تین دنوں میں لوٹا سکتا ہوں،اگر بیچنے والا اس پر رضامند ہو جائے تو یہ اختیار خریدار کو مل جاتا ہے اور بیچنے والا پابند ہوتا ہے کہ تین دن میں سامان واپس ہونے کی صورت میں اس کی قیمت لوٹا دے۔یہ اختیار شریعت کی طرف سے بیچنے والے اور خریدار دونوں کو حاصل ہے، نبی ﷺ کا فرمان ہے:

أو يخير أحدهما الآخر فتبايعا على ذلك فقد وجب البيع

صحيح بخاری: كتاب البيوع، باب اذا خير احدهما صاحبه بعد البيع فقد وجب البيع

کہ تاجر یا خریدار میں سے کوئی ایک دوسرے کو اختیار دیدے،اور وہ دونوں اس پر معاہدہ کر لیں تو بیع ہو جائے گی"۔یعنی وہ اختیار بھی حاصل ہو جائے گا اور بیع بھی مکمل ہو جائے گی۔بیع مرابحہ میں اس سہولت کی جانب سب سے پہلے امام محمد بن الحسن الشیبانی رحمہ اللہ نے

کتاب الحیل

کتاب الحیل:ص79،127 3اعلام الموقعین:4/ 23

میں اور پھر علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے

إعلام الموقعین"3

میں ذکر کیا ہے۔جب اسلامی بینک کے پاس تین دن کا اختیار ہو گا تو وہ صارف سے یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ سامان دیکھ لیں اگر صارف کو منظور ہوا تو بیع کر لے گا اور صارف کے انکار کرنے پر بینک یہ سامان خیار الشرط کی بناء پر واپس لوٹا سکتا ہے،اور اس کا کوئی نقصان بھی نہ ہو گا۔

اسلامی بینک بیع مرابحہ میں ہر ایک سے معاہدہ نہ کرے،بلکہ صرف انہی سے معاہدہ کرے جن کے حوالہ سے اسے مکمل اطمئنان ہو کہ اپنے وعدے سے نہیں پھریں گے۔

نقصان سے بچنے کاایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اسلامی بینک صارف کی ہر مطلوبہ چیز نہ خریدے، بلکہ صرف انہی چیزوں کے متعلق بیع مرابحہ کرے جو معاشرہ میں رائج ہوں تاکہ صارف کے انکار کی صورت میں یہ چیز بازار میں بیچ سکے اور اسے نقصان نہ ہو۔

)دوسرااعتراض(

اسلامی بینک کا مطلوبہ سامان کی خریداری میں صارف ہی کو وکیل مقرر کر دینا۔

مروجہ مرابحہ میں مطلوبہ سامان کی خریداری کے لئے بینک اسی صارف کو اپنا وکیل بنا دیتا ہے کہ وہ بینک کی طرف سے جاکر مطلوبہ سامان خرید لے اور پھر بینک وہ سامان صارف کو زائد نفع پر بیچ دیتا ہے۔ جیسا کہ اسٹیٹ بینک مرابحہ کے بارے میں اصول بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

"Agency Agreement" means the Agency Agreement between the Institution and the Client as provided in the Murabaha Document # 2". [20]

"ایجنسی ایگریمنٹ سے مراد وہ وکالتی معاہدہ ہے جو ادارہ(بینک)اور صارف کے درمیان ہوتا ہے، جیسا کہ مرابحہ کی دستاویز نمبر2 میں تحریر ہے"۔

اس کے جواز کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ جو سامان صارف کو درکار ہے اس کے بارے میں بینک یا کسی اور سے زیادہ معلومات صارف کو ہی ہوتی ہیں اور وہی بہتر چیز کی خریداری کر سکتا ہے، بینک کو اس معاملہ میں چونکہ کوئی تجربہ نہیں ہوتا اس لئے وہ صارف ہی کو وکیل بنا دیتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بینک کو اس معاملہ کا تجربہ نہیں ہے تو اسے یہ معاملہ کرنا ہی نہیں چاہئے، اور اگر صارف کو زیادہ معلومات ہیں تو اس کی معلومات سے استفادہ کا یہ طریقہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے یہ پوچھ لیا جائے کہ یہ سامان کہاں سے مل سکے گا، یا کہاں سے لینا زیادہ بہتر ہے، اسے وکیل بنا دینا ہی تو واحد حل نہیں۔

صارف ہی کو سامان کی خریدار میں وکیل بنا دینے سے مرابحہ کا معاملہ مزید مشتبہ ہو جاتا ہے:

صارف ہی کو وکیل بنا دینے سے بینک کا عملی طور پر مرابحہ میں کوئی کردار باقی نہیں رہتا اس کی کوئی محنت نہیں ہوتی تو مرابحہ کے منافع کو جائز کہنے کا پھر کیا جواز رہ جاتا ہے؟۔

بعض بینک صارف کو وکیل بنادینے کے بعد مطلوبہ سامان کی قیمت کے برابر رقم صارف کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کردیتے ہیں، اور پھر صارف کی طرف سے ملنے والی سامان کی رسید پر مرابحہ کا معاہدہ کرلیتے ہیں۔ یہ معاملہ تو بالکل ایسا ہے کہ کوئی شخص کسی کو کوئی چیز خریدنے کے لئے قرض فراہم کرے اور پھر اس قرض پر سود وصول کرے۔

صارف کو وکیل بنادینے کا کچھ افراد ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، اور جھوٹی رسید بناکر بینک سے رقم لیتے ہیں اور پھر اسے کسی اور مد میں استعمال کرکے زائد رقم قسطوں میں بینک کو لوٹاتے رہتے ہیں اور یہ معاملہ صریحاً سود اور حرام ہوجاتا ہے۔

اسی لئے خود مفتی تقی عثمانی صاحب کہتے ہیں: " کلائنٹ کو وکیل بنادینا تاکہ وہ تمویل کار کی طرف سے اس چیز کو خرید لے، مرابحہ کو مشتبہ بنادیتا ہے"[21] اسی طرح اسلامی بینکوں کے لئے شرعی معیار مقرر کرنے والی کتاب المعاییر الشرعیہ

میں ہے کہ:

الأصل أن تشتري المؤسسة السلعة بنفسها مباشرة من البائع ويجوز لها تنفيذ ذلك عن طريق وكيل غير الآمر بالشراء ولا يلجأ لتوكيل العميل (الآمر بالشراء) إلا عند الحاجة الملحة

المعايير الشرعية، المرابحة، رقم المعيار 3/1/3، ص 95

اصل یہ ہے کہ بینک خود براہ راست بیچنے والے سے سامان خریدے، اور اس کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ وہ کسی وکیل کے ذریعہ خریداری کرے لیکن یہ وکیل صارف نہ ہو، اور صارف کو کسی انتہائی ضرورت کے بنا وکیل نہ بنایا جائے"۔

اس کے باوجود بھی تقریباً تمام اسلامی بینک بنا کسی خاص ضرورت کے صارف ہی کو وکیل مقرر کرتے ہیں۔

)تیسرا اعتراض(

مروجہ مرابحہ میں نفع کے لئے شرح سود کے بینچ مارک (KIBOR) یا (LIBOR) کو معیار مقرر کرنا۔

اسلامی بینک مروجہ مرابحہ میں نفع کے تعین کے لئے شرح سود کو معیار مقرر کرتا ہے۔ (KIBOR) سے مراد ہے Karachi Interbank Offered Rate جو کہ دراصل قرض پر سود وصول کرنے

کے لئے ایک تناسب یا شرح ہے جو پاکستان کے تمام سودی بینکوں کے سود کی شرح کو دیکھ کر یومیہ، یا ہفتہ وار یا ماہانہ طے کیا جاتا ہے۔اسی طرح بین الاقوامی سطح پر (LIBOR) ایک شرح سود ہے جو کہ London Interbank Offered Rate کا مختف ہے،اور یہ دنیا کے تقریباً دس بڑے بینکوں کے شرح سود کو سامنے رکھ کر لندن میں بینکرز کی ایک فرم طے کرتی ہے اور دنیا کے تمام بینک اس شرح کو مستقبل کے سودوں کے لئے معیار بناتے ہیں۔

اسلامی بینک کا شرح سود کو معیار بنانا نہ صرف یہ کہ مروجہ مرابحہ کو مشتبہ کر دیتا ہے بلکہ پورے اسلامی بینکاری نظام کو مشکوک کر دیتا ہے۔ایک عام شخص کے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ آخر اسلامی بینک کا شرح سود سے کیا تعلق ہے؟۔

شرح سود کو معیار بنانے کے حوالہ سے اسلامی بینک کے سرکردہ افراد کا یہ کہنا ہے کہ یہ اسلامی بینک کی مجبوری ہے کیونکہ اسے مارکیٹ میں رہنا ہے اور چونکہ دیگر بینکوں سے بھی اس کے معاملات ہوتے ہیں اس لئے اپنے معاملات کو منضبط کرنے کے لئے اسے یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑتا ہے۔

اس دلیل کو دیکھتے ہوئے تو ہمارے ذہن میں ایک اور انتہائی کربناک سوال جنم لیتا ہے کہ کیا اسلامی بینک جس کے قیام کا بنیادی مقصد سود کو بینکاری نظام سے مٹانا تھا وہ خود سودی بینکوں سے سودی لین دین میں اس حد تک ملوث ہو چکا ہے کہ اسے مجبوراً شرح سود کو اپنے شرعی معاملات میں بھی معیار مقرر کرنا پڑ رہا ہے؟۔اگر اسلامی بینکوں کے معاملات کا طائرانہ جائزہ لیا جائے تو

بادی النظر

اسلامی بینکوں میں ملنے والا منافع سودی بینکوں سے ملنے والے منافع سے بالکل قریب ہوتا ہے،اور جس طرح سودی بینکوں میں شرح منافع بڑھتا ہے اسلامی بینک بھی اپنا منافع بڑھاتے ہیں۔

اس کی وضاحت درج ذیل چارٹ میں ملاحظہ کیجئے۔اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مختلف بینکوں کا ماہ ستمبر 2012 میں (Saving Account) پر منافع کا کیا تناسب تھا۔ان بینکوں میں اسلامی اور سودی دونوں بینکوں کا شرح منافع بیان کیا گیا ہے، جو کہ ان بینکوں کی ویب سائٹ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

Picture

اس چارٹ میں چھ بینکوں کا شرح منافع درج ہے، ان میں سے تین اسلامی بینک ہیں اور تین سودی بینک ہیں اور تمام بینکوں کا ایک مہینہ کا شرح منافع بالکل یکساں ہے۔

*اسلامی بینکوں سے ہونے والے مرابحہ، اجارہ میں لئے جانے والے منافع یا کرایہ کی شرح بھی سودی بینکوں سے دیئے جانے والے قرضہ پر سود کی شرح کے بالکل قریب یا کبھی کبھی زیادہ ہوتی ہے۔

اسٹیٹ بینک کی جانب سے شرح سود میں کمی زیادتی کا اسلامی بینک کے مارک اپ اور ڈیپازٹرز کو ادا کئے جانے والے منافع پر بہت نمایاں اثر ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی بینک کا شرح سود کو معیار مقرر کرنا خالی از معنی نہیں ہے، بلکہ یقیناً اسلامی بینکوں کے معاملات میں ایسی خامیاں موجود ہیں جن کی بناء پر انہیں اپنے منافع کو شرح سود سے مربوط کرنا پڑتا ہے اور یہی چیز ان بینکوں کو اسلامی قرار دینے میں اصل رکاوٹ ہے۔

)ایک اور دلیل(

مفتی تقی عثمانی صاحب، مرابحہ میں منافع کو شرح سود سے مربوط کرنے کے جواز کی دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی مثال یوں ہے کہ دو بھائی کاروبار کرتے ہیں، ایک بھائی شراب بیچتا ہے اور اس میں وہ منافع کی شرح پانچ فیصد رکھتا ہے، دوسرا بھائی شراب نہیں بیچتا بلکہ کوئی حلال مشروب بیچتا ہے لیکن اس میں وہ اپنے بھائی کی شرح منافع کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا منافع بھی پانچ فیصد ہی رکھتا ہے، تو ہم دوسرے بھائی کے کاروبار کو حرام تو نہیں کہیں گے، کیوں کہ وہ تو بالکل جائز چیز بیچ رہا ہے بس شرح منافع میں وہ اپنے بھائی کے شرح منافع کو معیار مقرر کرتا ہے، اسی طرح اسلامی بینک کا مرابحہ کا معاملہ بالکل حلال ہے اور شریعت کے مطابق ہے، وہ صرف شرح منافع میں سودی بینکوں کے شرح منافع کو معیار مقرر کرتا ہے سودی کام تو نہیں کرتا لہٰذا ایسا کرنے سے اسلامی بینک کا معاملہ حرام نہیں ہوتا]"22[

اس دلیل کے جواب میں دو باتیں عرض کروں گا:

(1) اگرچہ یہ ایک عقلی دلیل ہے اور اس کا نصوص سے کوئی تعلق نہیں اس کے باوجود بھی یہ دلیل بر محل نہیں ہے،

کیونکہ مفتی صاحب نے جو مثال دی ہے اس میں دوسرے بھائی نے پہلے بھائی کی اس چیز کو اپنایا ہے جو حرام نہیں تھی یعنی شرح منافع، پہلے بھائی کے کاروبار میں اصل جو چیز حرام تھی وہ شرح منافع نہیں تھا بلکہ وہ چیز تھی

جو بیچی جارہی تھی یعنی شراب۔اگر دوسرا بھائی اس شراب کو اپناتے ہوئے کوئی ایسی چیز بیچتا جو شراب کے مثل ہوتی یعنی کوئی نشہ آور چیز بیچتا تو وہ حرام کے زمرے میں داخل ہو جاتا۔جبکہ اسلامی بینک اس چیز کو اپنارہے ہیں جو اصلاً حرام ہے یعنی شرح سود!دونوں مثالوں میں زمین آسمان کا فرق ہے،لہٰذا اس مثال کو یہاں منطبق نہیں کیا جاسکتا۔

(2)دوسری بات یہ ہے کہ مرابحہ کے منافع کو (KIBOR) سے منسلک کردینے کی صورت میں مرابحہ کے جواز کیلئے علماء کی بیان کردہ ایک انتہائی اہم شرط میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔وہ شرط یہ ہے کہ مرابحہ میں بیچنے والا اپنا منافع صاف اور متعین کرکے بتائے۔جبکہ (KIBOR) اور (LIBOR) منضبط شرح سود نہیں ہیں بلکہ ان میں یومیہ،ہفتہ وار،یا ماہانہ بنیادوں پر تغیر واقع ہوتا رہتا ہے اور اس کے کم یا زیادہ ہونے کی صورت میں منافع میں کمی یا زیادتی واقع ہوتی رہے گی جو کہ ناجائز ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی بینکوں کے لئے قوانین مرتب کرنے والی کتاب

المعاییر الشرعیۃ

"میں درج ہے کہ:" مرابحہ میں واجب ہے کہ سامان کی قیمت اور منافع معین ہو اور معاہدہ کرتے وقت طرفین کے علم میں ہو۔اور کسی بھی حال میں یہ جائز نہیں کہ سامان کی قیمت یا منافع کو کسی نامعلوم تناسب پر چھوڑ دیا جائے یا کسی ایسے تناسب پر جو مستقبل میں قیمت یا منافع تعیین کرے۔جیسا کہ یہ جائز نہیں کہ بیع مرابحہ کرتے وقت منافع کو (LIBOR) کے تناسب پر چھوڑ دیا جائے"۔[23]

)چوتھا اعتراض(

اقساط کی ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ۔اس جرمانہ کو صدقہ کا نام دیا جاتا ہے۔

المعاییر الشرعیہ میں ہے:

يجوز أن ينص في عقد المرابحة للآمر بالشراء على التزام العميل المشتري بدفع مبلغ أو نسبة من الدين تصرف في الخيرات في حالة تأخره عن سداد الأقساط في مواعيدها المقررة، على أن تصرف في وجوه الخير بمعرفة هيئة الرقابة الشرعية للمؤسسة ولا تنتفع بها المؤسسة

المعايير الشرعية: المرابحة، رقم المعيار 6/5، ص 97–98

"جائز ہے کہ مرابحہ کے معاہدے میں صارف (خریدار) کا مقررہ وقت پر اقساط کی ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں ایک مخصوص رقم یا قرض کے تناسب سے کچھ رقم کی ادائیگی کا التزام بھی تحریر کر دیا جائے جو کہ فلاحی کاموں میں استعمال کی جائے گی، ایسے فلاحی کام جو اس بینک کے شریعہ سپر وائزری بورڈ کی معرفت میں ہوں، اور اس رقم سے بینک کوئی فائدہ حاصل نہ کرے"۔

اسٹیٹ بینک کی ہدایات کے مطابق:

"Where any amount is required to be paid by the Client under the Principal Documents on a specified date and is not paid by that date, or an extension thereof, permitted by the Institution without any increase in the Contract Price, the Client hereby undertakes to pay directly to the Charity Fund, constituted by the Institution2 "[24].

"جب بنیادی معاہدہ کے تحت صارف پر ایک مقررہ وقت میں مخصوص رقم کی ادائیگی لازم ہو اور وہ ادائیگی نہ کر سکے، اگرچہ بغیر کسی اضافی رقم کے بینک کی جانب سے اس مدت میں توسیع کر دی جائے تو بھی نادہندہ رہے، تو اس معاملہ میں صارف اپنے اوپر یہ لازم کرے کہ وہ بینک کے خیراتی فنڈ میں کچھ رقم دے گا"۔

مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں: " تاخیر کے سد باب کا ایک معقول طریقہ وہ ہے جو میں نے ابتداء میں پیش کیا تھا اور وہ بعد میں کافی مقبول ہوا، وہ یہ کہ مرابحہ یا اجارہ کے معاہدے میں مدیون یہ بات بھی لکھے کہ اگر میں نے ادائیگی میں تاخیر کی تو اتنی رقم کسی خیراتی کام میں خرچ کروں گا۔ یہ رقم دین (قرض) کے تناسب سے بھی طے کی جا سکتی ہے۔ ایسی رقم سے ایک خیراتی فنڈ بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس فنڈ سے کسی کی

امداد بھی کی جا سکتی ہے اور اس سے لوگوں کو بلا سود قرض بھی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ رقم بینک کی آمدنی میں شامل نہیں ہو گی۔ یہ طریقہ زیادہ مفید اس لئے ہے کہ اس طریقہ میں رقم کی شرح متعین نہیں، زیادہ سے زیادہ بھی رکھی جا سکتی ہے، اس سے قرضدار پر دباؤ ہو گا"۔[25]

دلیل: اس صدقہ کے جواز کے لئے دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ بعض مالکیہ کا مؤقف ہے کہ اگر کوئی شخص قرض لیتے ہوئے ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں اپنے اوپر صدقہ کی شرط لگالے تو اس پر واجب ہے کہ وہ اس شرط کو پورا کرے اور اس کے لئے امام حطاب المالکی کی اس عبارت کو پیش کیا جاتا ہے:

إذا التزم أنه إذا لم يوفه حقه في وقت كذا، فعليه كذا و كذا الفلان أو صدقة للمساكين فهذا محل الخلاف المعقود له هذا الباب، فالمشهور أنه لا يقضي به... وقال ابن دينار يقضى به

"جب قرضدار اپنے اوپر یہ لازم کرے کہ اس نے قرض خواہ کا حق اس کے وقت پر ادا نہیں کیا تو اس پر فلاں (غیر قرض خواہ) کے لئے اتنا مال لازم ہے یا مساکین کو صدقہ کرنا لازم ہے، تو اس میں اختلاف ہے، اور اسی کو بیان کرنے کے لئے یہ باب باندھا گیا ہے، پس مشہور (راجح قول) یہ ہے کہ اس پر فیصلہ نہیں کیا جائے گا، اور ابن دینار کہتے ہیں کہ اس پر فیصلہ کیا جائے گا"۔[26]

اس دلیل کے جواب میں چند نکات پر بات کرنی ہو گی:

(1) راجح قول کے مقابلہ میں مرجوح کا اختیار: اس معاملہ میں مالکیہ کے علاوہ دیگر تمام مسالک میں اجماع ہے کہ ادائیگی قرض میں تاخیر کی صورت میں قرضدار پر کسی بھی قسم کا جرمانہ یا قرضدار کا اپنے اوپر التزام جائز نہیں۔ صرف مالکیہ میں اختلاف ہے اور وہ بھی جیسا کہ امام حطاب مالکی رحمہ اللہ نے خود ذکر کیا کہ یہ قول مالکیہ میں سے صرف ابن دینار اور ابن نافع کا ہے اور مالکی مسلک میں یہ قول " مرجوح یعنی ناقابل قبول" ہے، اور راجح قول وہی ہے جو دیگر تمام ائمہ و مفتیان کا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اپنے مسلک کو چھوڑ کر دوسرے مسلک کی راجح بات یا قول پر عمل کرنا تو شاید بعض علماء کے نزدیک بعض صورتوں میں جائز ہو، لیکن کسی اور مسلک کے مرجوح قول کو اختیار کرنا تو کسی بھی عالم کے نزدیک جائز نہیں خاص طور پر اس صورت میں جبکہ وہ قول سود جیسے گناہ کی طرف لے جائے، بلکہ صاحبِ مسلک کا اپنے مسلک کے راجح قول کو چھوڑ کر مرجوح اختیار کرنے کو بھی علماء نے ناجائز قرار دیا ہے تو پھر کسی اور مسلک کے مرجوح اقوال کو اختیار کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟۔

علامہ قاسم ابن قطلوبغا حنفی کہتے ہیں:

إني قد رأيت من عمل في مذهب أئمتنا بالتشهي، حتى سمعت من لفظ بعض القضاة: وهل ثمّ حجر؟ فقلت: نعم. اتباع الهوى حرام، والمرجوح في مقابلة الراجح بمنزلة العدم

تصحیح القدوری، ص 1

"میں نے ان لوگوں کو دیکھا ہے جو ہمارے ائمہ کے مسلک میں اپنی خواہشات سے عمل کرتے ہیں، حتی کہ میں نے بعض قاضیوں کو یہ کہتے سنا: کہ کیا یہ ممنوع ہے؟، میں نے کہا: جی ہاں بالکل، خواہشات کی پیروی حرام ہے ،اور راجح قول کے مقابلہ میں مرجوح، معدوم (بالکل نہ ہونے) کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی طرح ابن عابدین حنفی لکھتے ہیں:

الواجب على من أراد أن يعمل لنفسه، أو يفتي غيره أن يتبع القول الذي رجّحه علماء مذهبه، فلا يجوز له العمل أو الافتاء بالمرجوح

"جو شخص خود کوئی عمل کرنا چاہے یا کسی اور کو فتوی دینے لگے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس قول کو اختیار کرے جسے اس کے مذہب کے علماء نے راجح قرار دیا ہے، اور اس کے لئے کسی مرجوح قول پر عمل کرنا یا فتوی دینا جائز نہیں]"27[

خود مالکی مسلک کے عالم ابوالولید الباجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وأما الحكم والفتيا بما هو مرجوح فخلاف الإجماع

الإحكام في تمييز الفتاوى عن الأحكام وتصرفات القاضي والإمام للقرافي ص 92

"مرجوح قول پر فیصلہ کرنا یا فتوی دینا (علماء کے) اجماع کے خلاف ہے"۔

(2) تنگ دست اور مالدار میں فرق نہ کرنا

اسلامی نظام معیشت کی بنیادی خوبی اور اعلی وصف یہ ہے کہ اس نظام نے جہاں حقوق کی ادائیگی کے حوالہ سے سختی رکھی ہے وہاں مجبور کی مجبوری کا بھی احساس کیا ہے، اور تنگ دست قرضدار کی مجبوری کا احساس کرتے ہوئے ایک سنہرا اصول بیان کیا کہ:

﴿وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾

البقرة: 280

کہ اگر: "(قرضدار) تنگ دست ہو تو اسے مہلت دو اس کی آسانی تک، اور اگر تم (یہ قرض) اس پر صدقہ کر (کے چھوڑ) دو تو یہ تمہارے لئے بہت بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو"۔ سودی نظامِ بینکاری کا ظلم واستحصال ہی یہی ہے کہ وہ سود لینے کے ساتھ ساتھ وقت پر ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں تنگدست ومالدار میں کوئی فرق کئے بغیر

جرمانہ عائد کرتا ہے،اور وہ تنگ دست جو اصل رقم دینے کی سکت بھی نہیں رکھتا بینک کے ظالمانہ شکنجے میں دبا رہتا ہے۔

مروجہ اسلامی نظام بینکاری کی بنیاد اگر اسلام کے اصولوں پر رکھی گئی ہے تو اس کی یہ بنیادی خوبی ہونی چاہئے تھی کہ یہ اسلام کی طرف سے تنگدست و مجبور افراد کے لئے عطا کی گئی ہمدردی، سہولت، احسان جیسے اعلیٰ اوصاف سے مزین ہوتا تاکہ سودی نظام بینکاری کے صحیح اور حقیقی متبادل کی صورت میں پوری دنیا میں متعارف ہوتا، لیکن مروجہ اسلامی نظام بینکاری، اسلامی نظام معیشت کے اس بنیادی وصف سے کوسوں دور نظر آتا ہے اور بالکل سودی نظام بینکاری کی مانند بے رحم اور بے حس قرض خواہ کا کردار ادا کرتا ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ اسلامی بینک مرابحہ کے آغاز ہی میں صارف سے یہ وعدہ لے لیتا ہے کہ مقررہ وقت پر عدم ادائیگی کی صورت میں ایک مخصوص رقم ادا کرنا ہوگی جسے اسلامی بینک صدقہ کا نام دیتا ہے،اور بینک کو اس بات سے کوئی غرض و دلچسپی نہیں ہوتی کہ صارف کی عدم ادائیگی کی کیا وجہ ہے؟ کیا وہ تنگدست یا مجبور تو نہیں؟ کیا وہ قرآن میں بیان کردہ "ذو عسرۃ" میں تو شامل نہیں کہ جو قرآن کے مطابق مہلت کے حقدار ہیں؟۔یہی وجہ ہے کہ اس پورے معاہدے میں عملی طور پر تو درکنار تحریری صورت میں بھی ایسی کوئی شرط یا شق نہیں ملتی جس میں بینک صارف کو کسی طرح کی مہلت دینے کا پابند نظر آئے۔

اسلامی بینک اپنے ہر صارف کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ ٹال مٹول کر کے اس کا مال کھانے کی کوشش میں ہے اور کسی طرح اس سے وہ پیسہ واپس وصول کر لیا جائے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سودی نظام بینکاری کو چھوڑ کر اسلامی نظام بینکاری کی جانب آنے والے افراد یقینی طور پر اچھے مسلمان ہیں جو کسی نہ کسی طرح سود سے بچنا چاہتے ہیں،اسلامی بینک کو بھی چاہئے کہ اپنے صارفین کا احترام کرتے ہوئے اور ان کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے انکے بارے میں حسن ظن رکھے اور یہ کوشش کرے کہ اپنے نادہندگان میں تنگدست اور مالدار کا فرق رکھے، اور ایسا تنگدست جو کہ اپنی اصل رقم ادا کرنے سے بھی قاصر ہے اس پر مزید بوجھ ڈالنے کے بجائے اسے مہلت دی جائے اور اگر وہ بالکل ہی تہی دامن ہو تو اس سے صدقہ لینے کے بجائے قرآنی حکم کے مطابق اس پر صدقہ کرے، اور فرمان الٰہی کے مطابق یقیناً یہی اسلامی بینک کے حق میں بہتر ہے۔

(2)کیا یہ واقعی صدقہ ہے یا تاخیر پر جرمانہ ہے؟

اسلامی بینک کی جانب سے صارف کو تاخیر کی صورت میں اضافی رقم کا پابند کیا جانا کسی صورت بھی صدقہ نہیں کہلایا جاسکتا کیونکہ:

.1اس رقم کی بنیاد قرض کی ادائیگی میں تاخیر ہے۔

.2اس رقم کا تعین قرض کی بقایہ رقم اور تاخیر کی مدت کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اسٹیٹ بینک نے مرابحہ کے حوالہ سے اس رقم کو (PENALTY) تصور کیا اور اس کے تعین کا طریقہ کار بیان کیا کہ":

"A sum calculated @ ——% per annum for the entire period of default, calculated on the total amount of the obligations remaining un-discharged."

رقم کا حساب مدت نادہندگی کے۔۔۔ فیصد (جسے بینک طے کرے گا) سالانہ سے ہوگا، جسے قرض کی بقایہ رقم سے حساب کر کے متعین کیا جائے گا۔

.3نام نہاد صدقہ کی رقم خود بینک ہی وصول کرتا ہے، اور صارف پر یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ یہ رقم بینک میں ہی جمع کرائے۔ بلکہ بینک اس رقم کو اپنا حق تصور کرتا ہے اور اس کی وصولی کے لئے عدالت میں بھی جاسکتا ہے۔ جیسا کہ اسٹیٹ بینک کی اسی مرابحہ دستاویز میں تحریر ہے:

"In case (i) any amount(s) referred to in clause 10.01 above, including the amount undertaken to be paid directly to the Charity Fund, by the Client, is not paid by him, or (ii) the Client delays the payment … the Institution shall have the right to approach a competent Court … (ii) for imposing of a penalty on the Client".

"درج بالا شق نمبر 10.01 میں مذکور رقم، اور خیراتی فنڈ میں دی جانے والی وہ رقم جس کا صارف نے اپنے اوپر التزام کیا تھا اگر وہ صارف کی طرف سے ادا نہیں کی جاتی یا اس کی ادائیگی میں تاخیر کی جاتی ہے۔۔۔ تو بینک مجاز عدالت میں جانے کا حق رکھتا ہے۔۔۔ تاکہ صارف پر جرمانہ نافذ کیا جاسکے"۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اسلامی بینک صدقہ کی رقم کو اپنا حق سمجھتا ہے اور اس کی وصولی کے لئے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہے۔ تو اس رقم کو صدقہ کہنے کی پھر کیا دلیل رہ جاتی ہے ؟۔

.4 صدقہ ایک عبادت اور خیرات وتعاون ہے، اور تمام علماء کا اتفاق ہے کہ جو عمل تبرعِ محض ہے، صرف تعاون پر مبنی ہے اس میں کوئی الزام وجبر نہیں کیا جاسکتا۔ مؤیدین اسلامی بینک یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ صدقہ بینک نے صارف پر لازم نہیں کیا بلکہ صارف نے خود اس کا التزام لیا ہے، اور اگر کوئی شخص کسی نیک کام مثلاً، صدقہ، ہدیہ وغیرہ کو اپنے اوپر لازم کرے تو وہ لازم ہو جاتا ہے جیسا کہ مالکیہ ودیگر بعض علماء نے ذکر کیا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ کیا یہ دلیل درست ہے یا نہیں ؟، اور کیا واقعتاً جب کوئی شخص اپنے اوپر کوئی نیک کام لازم کرلے تو اس پر لازم ہو جاتا ہے یا نہیں ؟، اور اس حوالہ سے علماء کے اختلاف سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم اس دلیل کو اگر قبول کر بھی لیتے ہیں تو چند سوال ذہن میں ابھرتے ہیں جن کا تسلی بخش جواب نہیں مل سکا کہ :

کیا مرابحہ کا معاہدہ بینک تیار کرتا ہے یا صارف ؟۔ اگر معاہدہ بینک بناتا ہے اور تمام شرائط بینک نے پہلے سے تحریر کی ہوئی ہوتی ہیں اور صارف نے صرف دستخط کرنے ہوتے ہیں تو اس میں صارف کی رضامندی اور التزام صرف دستخط ہی سے تصور کئے جاتے ہیں ؟۔

اگر صارف یہ کہے کہ میں اس صدقہ کا التزام نہیں کروں گا تو کیا بینک اس سے مرابحہ کا معاہدہ کرے گا ؟۔

کیا بینک کا بغیر التزام کے صارف سے معاہدے سے انکار کر دینے کو صارف پر صدقہ کے التزام کے حوالہ سے جبر تصور نہیں کیا جائیگا ؟۔

کیا کبھی مروجہ اسلامی بینک نے کسی صارف سے اس صدقہ کے التزام کے بغیر کوئی ایک معاہدہ بھی کیا ہے ؟۔

(4) تاخیر کی صورت میں مالی جرمانہ لگایا جاسکتا ہے ؟

اگر قرضدار مالدار اور قرض ادا کرنے کی استطاعت رکھنے کے باوجود ادائیگی میں جان بوجھ کر تاخیر کا مرتکب ہو تو وہ شریعت کی نظر میں ظالم ہے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

مطل الغني ظلم

"مالدار (قرضدار) کا (ادائیگی میں) ٹال مٹول کرنا ظلم ہے"[28]۔ بلکہ شریعت نے اس حوالہ سے قرض خواہ کی رہنمائی بھی کی ہے کہ وہ اس صورت میں کیا کرے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

لي الواجد يحل عرضه وعقوبته

" مالدار کا ٹال مٹول کرنا اس کی عزت اور اس پر سزا کو حلال کر دیتا ہے"۔[29]

لیکن تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ یہ جرمانہ مالی نہیں لگایا جائے گا، ابن المبارک رحمہ اللہ اس حدیث کی توضیح میں فرماتے ہیں: "عزت حلال ہونے سے مراد ہے کہ اس پر سختی کی جائے گی اور اس کی سزا سے مراد ہے کہ اسے قید کر دیا جائے گا"[30]۔ امام ابو بکر الجصاص رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

والمراد بالعقوبة هنا الحبس لأن أحدا لا يوجب غيره

اس حدیث میں سزا سے مراد قید ہے کیونکہ (علماء میں سے) کسی نے بھی اس کے علاوہ کوئی اور سزا واجب نہیں کی۔[31] بلکہ علماء نے اس کے برعکس بطور جرمانہ کسی بھی قسم کے مالی اضافہ کو حرام کہا ہے اور بیان کیا ہے کہ دور جاہلیت کا اصل سود یہی تھا، امام قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " دور جاہلیت کا اصل سود یہی تھا کہ ایک شخص کسی کو کوئی چیز ادھار پر بیچتا، جب ادائیگی کا وقت آتا اور خریدار کے پاس رقم نہ ہوتی تو وہ مطلوبہ رقم میں اضافہ کر کے اس کو مزید مہلت دے دیتا"[32]۔ ابن عبد البر رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ: " دور جاہلیت کا سود یہ تھا کہ اگر ایک شخص نے کسی کو قرض دیا ہوتا اور ادائیگی کا وقت آتا تو قرض خواہ، قرضدار سے پوچھتا کہ: "ادائیگی کرو گے یا (مزید مہلت لے کر) سود ادا کرو گے؟، اگر قرضدار اس وقت ادائیگی کر دیتا تو وہ لے لیتا ورنہ اس پر سود لگا دیتا"[33]۔ شریعت نے قرض کے بدلہ ہر قسم کے منافع کو ناجائز کہا ہے، اس بارے میں ایک حدیث بھی ذکر کی جاتی ہے کہ:

كل قرض جر منفعة فهو ربا

" ہر وہ قرض جس سے قرض خواہ کو کوئی فائدہ ملے وہ سود ہے"5۔ یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس معنی میں صحابہ کرام سے صحیح آثار منقول ہیں، ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " ہر وہ قرض جس میں اضافی رقم کا مطالبہ ہو وہ سود اور حرام ہے بغیر (علماء کے) کسی اختلاف کے، اور اس حوالہ سے ابی بن کعب، ابن عباس اور ابن مسعود سے صحیح آثار منقول ہیں"۔ اسی طرح اس کی حرمت پر اجماع کو ابن المنذر رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے فرماتے ہیں:

أجمعوا على أن المسلف إذا شرط على المستسلف زيادة أو هدية فأسلف على ذلك: أن أخذ الزيادة على ذلك ربا

اس بات پر تمام علماء کا اجماع ہے کہ جب قرض دینے والا، قرض لینے والے پر یہ شرط لگائے کہ وہ اسے بڑھا کر دے گا، یا کوئی ہدیہ دے گا اور اس شرط پر وہ اسے قرضہ دے تو اس کا یہ زائد رقم لینا سود ہے"۔[34]

ڈاکٹر نزیہ حماد لکھتے ہیں: " خلافت راشدہ سے لے کر خلافت عثمانی کے اختتام تک اس مالی جرمانہ کا کوئی حکم ہم تک نہیں پہنچا، جبکہ یقیناً اس پوری مدت میں بہت سی تاخیر اور ٹال مٹول کا سامنا رہا ہو گا، لیکن تعزیر کی بنیاد پر حبس و قید و دیگر سزاؤں کے احکامات صادر ہوئے لیکن اس مالی جرمانہ کا کوئی حکم کتب فقہ میں مذکور نہیں"۔[35]

(5) بینک کا صدقہ سے منفعت حاصل کرنا

اگر ایک لمحہ کے لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ صدقہ جائز ہے تو یہ بات تو طے ہے کہ اس صدقہ سے بینک کا کوئی منفعت حاصل کرنا قطعی حرام ہے، اس کا اقرار خود مفتی تقی عثمانی صاحب اور دیگر علماء نے بھی کیا ہے اور یہی بات المعاییر الشرعیۃ میں بھی تحریر ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ لیکن اگر عملی طور پر بینک کے معاملات کی جانب دیکھا جائے تو ہمیں نظر آتا ہے کہ اسلامی بینک اس سے اگر مادی نہ صحیح معنوی منفعت ضرور حاصل کرتا اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ:

یہ صدقہ جہاں خرچ کیا جاتا ہے وہاں بینک ہی کی تشہیر کی جاتی ہے۔

بہت سی کانفرنسز میں اور ذرائع ابلاغ میں یہ بات ذکر کی جاتی ہے کہ فلاں اسلامی بینک نے اس سال اتنے روپے خیراتی کاموں پر خرچ کئے جس سے بینک کو نیک نامی کی منفعت حاصل ہوتی ہے۔

یہ صدقہ جن اداروں کو دیا جاتا ہے انہیں بھی اس بات کا پابند کیا جاتا ہے کہ وہ اپنا اکاؤنٹ اسی بینک میں کھلوائیں

۔

یہ اور اسی قسم کے دیگر مادی و معنوی فوائد ہیں جنہیں اسلامی بینک ان نام نہاد صدقات سے حاصل کرتا ہے۔ کیا یہ منفعت کا حصول اس کے لئے جائز ہے؟۔

(6) سودی بینکوں کے ظلم اور استحصال کے لئے شرعی دلیل کی فراہمی:

اس صدقہ کے حامی علماء کو چاہئے تھا کہ اگر ایسا صدقہ لگانا تھا تو کم از کم اس کے لئے دلائل فراہم کرتے وقت اتنا ضرور خیال کر لیا جاتا کہ کہیں ان دلائل کا سہارا سودی بینک نہ لیں، کہ جن کی مخالفت میں اسلامی بینکنگ کی پوری مارکیٹ قائم ہے، لیکن اتنے زور و شور سے دلائل دئے گئے اور بودے دلائل کا اتنا ڈھیر لگا دیا گیا اور اتنی بحوث لکھ

دی گئیں کہ سودی بینکوں کو اپنا ظلم واستحصال شرعی سانچہ میں ڈھالنا آسان ہو گیا۔اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ''عذر گناہ بدتر از گناہ''۔

نام نہاد صدقہ و جرمانہ کا صحیح و حقیقی متبادل

مروجہ اسلامی بینکوں کو چاہئے کہ وہ کسی صارف سے معاہدہ کرنے سے پہلے اس کی حقیقی مالی استعداد کا علم ضرور حاصل کریں تاکہ ادائیگی میں تاخیر سے بچنا ممکن ہو۔

صارف سے ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں کسی بھی عملی اقدام سے پہلے تنگدست اور مالدار میں فرق ضرور رکھا جائے۔تنگدست وہ شخص ہے جس کے پاس موجود رقم اس کی اور اس کے خاندان کی کفالت سے زائد نہ ہو۔ایسا تنگدست شریعت کی نظر میں مہلت کا مستحق ہے،بلکہ اکثر علماء کے نزدیک اسے مہلت دینا واجب ہے۔

اگر صارف قرض ادا کرنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود تاخیر کرتا ہے تو اس پر مالی جرمانہ کے علاوہ اور کوئی بھی سزا دی جاسکتی ہے۔

ایسے معاملہ میں بینک کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ وہ صارف پر یہ شرط لگائے کہ ادائیگی کی صلاحیت ہونے کے باوجود تاخیر کی صورت میں اسے باقی ساری اقساط ایک ساتھ ادا کرنی ہوں گی۔

اسی طرح بینک ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں بیع فسخ کرنے کا بھی مجاز ہے اور اسے یہ شرعی حق حاصل ہے کہ جو چیز اس نے صارف کو بیچی تھی وہ اس سے واپس لے کر اس کی ادا کردہ رقم لوٹادے۔

خلاصہ کلام

اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ میں بہت سی شرعی قباحتیں موجود ہیں جو مروجہ مرابحہ کے ''ربح (Markup)'' کو سودی بینکوں کے ''ربا (Interest)'' کی مانند کر دیتی ہیں۔ان شرعی قباحتوں میں:

(1) بینک کا صارف سے مرابحہ کی ابتداء میں لیا جانے والا وعدہ جس کا قانوناً التزام کرایا جاتا ہے۔جو مروجہ مرابحہ کو

بیع مالا یملک

جیسی ممنوع بیع کے حکم میں داخل کر دیتا ہے۔

(2) بینک کا مرابحہ میں مطلوبہ سامان کی خریداری کے لئے صارف ہی کو وکیل مقرر کرنا۔جو اس معاملے کو سودی تمویل سے مشابہ کر دیتا ہے۔

(3) بینک کا مروجہ مرابحہ میں منافع کا شرح سود کے ذریعہ تعین کرنا۔

(4)اقساط کی ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں صارف پر لگایا جانے والا جرمانہ جسے صدقہ کا نام دیا جاتا ہے۔

یہ وہ بنیادی شرعی قباحتیں ہیں جن کی موجودگی میں کسی مزعومہ اسلامی بینک سے معاملہ کرنا حرام ٹھہرتا ہے۔

مرابحہ !اسلامی بینکنگ پر ایک سوالیہ نشان؟

اسلامی بینکنگ کے آغاز کی بنیاد اس بات پر رکھی گئی تھی کہ اسلامی بینک سودی بینک کی طرح صرف تمویل پر منافع حاصل نہیں کریں گے، بلکہ ان کا اصل کام تجارت ہوگا، وہ صرف ایک مالیاتی ادارہ کی حیثیت سے کام نہیں کرے گا جو لوگوں سے پیسہ لے کر آگے فراہم کرے۔ بلکہ وہ ایک حقیقی تجارتی ادارہ ہوگا جو کہ سرمایہ داروں سے شراکت داری کی بنیاد پر سرمایہ لے کر تجارت میں لگائے گا اور یہ شراکت داری نفع نقصان دونوں میں ہوگی، جہاں تک مرابحہ اور اجارہ کا تعلق ہے، یہ معاملات انتہائی ہلکی سطح پر جاری رکھیں جائیں گے، تاکہ تمویل کی ضروریات کو بھی پورا کیا جاسکے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مرابحہ خود بھی کوئی مثالی طریقہ تمویل (Mode of Financing) نہیں، جیسا کہ مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: ”یہ بات کسی صورت نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ مرابحہ اصل کے اعتبار سے طریقہ تمویل نہیں۔ یہ تو صرف سود سے بچنے کا ایک وسیلہ اور حیلہ ہے۔ ایسا مثالی ذریعہ تمویل نہیں جو اسلام کے معاشی مقصد کی تکمیل کرتا ہو“۔[36] یعنی اس کا استعمال ایک حیلہ کے طور پر کرنا چاہئے، دوسرے الفاظ میں اس کا استعمال انتہائی ضرورت کے وقت میں کرنا چاہئے اور جہاں اس سے بچنا ممکن ہو بچنا چاہئے، اس تناظر میں تو مرابحہ کا استعمال اسلامی بینکوں میں انتہائی کم ہونا چاہئے تھا۔

لیکن موجودہ حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں، تقریباً تمام اسلامی بینکوں کا اصل کاروبار اب مرابحہ ہی رہ گیا ہے، کیونکہ یہ سودی بینکنگ کے مزاج کے بالکل قریب ہے، اور جہاں پر تھوڑا سا فرق ہے، تھوڑا سا خطرہ ہے، وہاں مزید حیلوں کا سہارا لے کر بالکل ہی سودی صورت کے مطابق بنا لیا گیا ہے، تاکہ بازارِ سود میں لوٹ پوٹ ہونے والی عالمی معیشت میں جہاں کچھ لوگ اپنا دامن سود سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں انہیں بھی اسلامی نام سے دھوکہ دے کر، سودی پراڈکٹ پر اسلام کا لیبل لگا کر بیچ دیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی بینکوں کے پرزور حامی اور بانیوں میں شمار ہونے والے علماء اور تاجر حضرات بھی اب اس حقیقت کو ماننے لگے ہیں کہ اسلامی بینکنگ کو جس مزاج پر چلانے کا تہیہ کیا گیا تھا وہ اس میں ناکام ہو چکے ہیں۔ بطور مثال دو اقوال درج ذیل ہیں:

(1) علامہ یوسف قرضاوی:

جو کہ معروف عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی بینکنگ کے پرزور حامی بھی ہیں اور قطر اسلامی بینک اور فیصل اسلامی بینک کے شریعہ بورڈ کے چیئرمین ہیں کہتے ہیں:

أن المرابحة هي قريبة من التمويل الربوي"" مشيرا إلى أنه للأسف أصبحت المصرفية الإسلامية سجينة للمرابحة وأصبحت 95 في المائة من عملياتها في المرابحة—بحسب تقديراته

"مرابحہ سودی تمویل کے بہت قریب ہے اور افسوس ہے کہ اسلامی بینک مرابحہ کے "قیدی" بن گئے ہیں، اور میرے اندازے کے مطابق اسلامی بینکوں کے تمام معاملات میں مرابحہ کی نسبت 95 فیصد ہے"۔[37]

(2) ڈاکٹر صالح کامل

جو اسلامی بینکوں کی جنرل کونسل کے سربراہ، اور البرکہ اسلامی بینک اور اردن اسلامی بینک کے بانی ہیں کہتے ہیں:

بشرنا الناس بأن [المصرف الإسلامي سيقود الأمة] نحو التنمية الاقتصادية وزيادة المصادر وتشغيل العاطل وتأهيل العاجز، ولكن أقول بكل الصدق والتجرد: أننا أخذنا مفهوم البنك [الربوي]، ولم نستطع أن نتجاوز نمط الوساطة المالية، فأصبحت الصيغ الاستثمارية المفضلة لدى البنوك الإسلامية هجينًا بين القرض والاستثمار يحمل معظم سمات القرض الربوي وعيوب نظام الرأسمالي الغربي ويعجز عن إبراز معالم الاستثمار الإسلامي المبني على المخاطرة وعلى الاستثمار الحقيقي

"اسلامی بینکنگ کے آغاز میں ہم نے لوگوں کو یہ خوشخبری دی تھی کہ اسلامی بینک اس امت کو اقتصادی ترقی، ذرائع آمدنی میں اضافہ، بے روزگار کو روزگار اور عاجز کو باصلاحیت بنانے کی جانب گامزن کرے گا، لیکن اب میں بالکل سچائی اور غیر جانبداری سے کہتا ہوں کہ: ہم نے سودی بینکوں کا ہی مفہوم اپنا لیا ہے، ہم ایک درمیانی مالی واسطہ کی حیثیت سے آگے ہی نہ بڑھ سکے، اور اب اسلامی بینکوں کا سب سے پسندیدہ طریقہ سرمایہ کاری، قرض اور سرمایہ کاری کا دوغلی نسل کا بچہ ہے، جس میں سودی قرض کی اکثر علامات بھی ہیں اور مغربی سرمایہ دارانہ نظام

کی خامیاں بھی ہیں،اور یہ اسلامی بینک اسلامی سرمایہ کاری کی اکثر صفات کے اظہار سے لاچار ہے جو کہ مخاطرت اور حقیقی سرمایہ کاری پر مبنی ہے"۔

یہ دو اقوال ہی عبرت کے لئے کافی ہیں، یہ ان افراد کا اعتراف ہے جو کہ نہ صرف اسلامی بینک کے بھرپور مؤید رہے ہیں، بلکہ اسلامی بینکوں میں اعلی عہدوں پر فائز ہیں اور اسلامی بینکوں کے معاملات سے بہت اچھی طرح سے واقف ہیں۔

جو باتیں ان حضرات نے کہی ہیں وہ حقیقت ہے،اور درج ذیل دو چارٹ اس کے آئینہ دار ہیں۔

درج ذیل پہلا چارٹ عالمی بینک (World Bank) کی جانب سے تیار کردہ ہے جسے سلیمان سید علی نے تیار کیا ہے۔[38]اس چارٹ میں سات اسلامی ممالک میں اسلامی بینکنگ کے معاملات کا تناسب ذکر ہے۔ ہم نے صرف مرابحہ کا تناسب ذکر کیا ہے۔اس چارٹ میں واضح دیکھا جاسکتا ہے کہ اسلامی بینکوں میں مرابحہ کا تناسب کتنا زیادہ ہے، حتی کہ بعض ممالک میں جیسے یمن میں اسلامی بینکوں کا سو فیصد معاملہ صرف مرابحہ ہی ہے ،اور بعض ممالک جیسے کویت اور متحدہ عرب امارات میں یہ تناسب 90 فیصد سے زیادہ ہے۔واضح رہے کہ یہ جائزہ رپورٹ 2008ء میں تیار کی گئی تھی، گزشتہ چار سالوں میں یقیناً اس تناسب میں اضافہ ہی ہوا ہے کمی نہیں۔

Picture

دوسرا چارٹ اسٹیٹ بینک پاکستان کے اسلامی بینکنگ ڈیپارٹمنٹ کا تیار کردہ ہے جس میں پاکستان کے اسلامی بینکوں کے معاملات کا فیصدی تناسب ذکر کیا گیا ہے، یہ رپورٹ بھی 2008ء کی تیار کردہ ہے۔]39[

اس رپورٹ میں پاکستان کے اسلامی بینکوں کے معاملات کا فیصدی تناسب ذکر کیا گیا ہے، جس میں یہ واضح ہے کہ اسلامی بینکوں میں ذرائع تمویل (Modes of Financing)یعنی مرابحہ ،اجارہ اور مشارکہ متناقصہ کا تناسب بینک کے باقی دیگر تمام معاملات کے تین چوتھائی سے بھی زیادہ ہے یعنی تقریباً 90 فیصد!۔اور نفع و نقصان کی شراکت داری جس کی بنیاد پر اسلامی بینک وجود میں آیا تھا اس کا تناسب صرف 2 فیصد ہے اور اس میں بھی مضاربہ کا کوئی حصہ نہیں!۔

Picture

اسی طرح ایک اور رپورٹ جو اسٹیٹ بینک کے اسلامی بینکنگ ڈپارٹمنٹ نے سال 2012ء میں ستمبر کے مہینہ میں جاری کی، جس میں اسلامی بینکوں کی سال 2012ء کی تیسری سہ ماہی جو کہ جولائی تا ستمبر ہے کا جائزہ لیا گیا۔ اس رپورٹ کے اعداد و شمار بھی گزشتہ اعداد و شمار سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔][40

Picture

خلاصہ کلام:

اسلامی بینک کے قیام کا بنیادی مقصد معاشرہ کو سود اور عوام کو مالی ظلم و استحصال سے بچانا اور اسلامی معاشی نظام کے نفاذ کی سنجیدہ کوششیں کرنا تھا۔ اسی لئے ابتداء میں علماء نے یہ طے کیا تھا کہ اسلامی بینک مضاربہ اور مشارکہ جیسے شراکت داری والے معاملات کی طرف زیادہ توجہ دے گا، اور چونکہ ابتداء میں اسلامی بینک کو مشکلات کا سامنا تھا اس لئے مرابحہ اور اجارہ کو عبوری دور کے لئے اسلامی بینکاری نظام میں شامل کیا گیا تھا بلکہ کئی علماء نے اس کی عبوری دور کے لئے بھی اجازت نہیں دی تھی۔ اب اسلامی بینک اپنے ابتدائی دور سے گزر کر پختہ دور تک پہنچ چکا ہے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جن بینکوں نے مرابحہ کو ابتدائی طور پر عبوری نظام کی حیثیت سے اپنایا تھا وہ بتدریج اس کو ختم کر کے مضاربہ اور مشارکہ کی جانب آتے، لیکن صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ اسلامی بینکوں نے اب مرابحہ، اجارہ اور مشارکہ متناقصہ ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ہے، جبکہ اس میں سود کا شائبہ بھی ہے، صارف کا استحصال بھی، سودی حیلہ بھی اور مشکوک معاملات بھی!، اب ایسے نظام سے یہ توقع رکھنا کہ یہ معاشرہ کو اسلامی معاشی نظام کی جانب لے کر جائے گا بالکل عبث اور بیکار ہے، خصوصاً اب جبکہ اس نظام کو تقریباً ایک تہائی صدی سے زیادہ بلکہ نصف صدی گزر چکی ہے ۔اس لئے جو علماء اب بھی اس نظام کے حامی ہیں انہیں چاہئے کہ یا تو اس نظام کی اصلاح کے لئے انقلابی اقدامات اٹھائیں یا پھر اس نظام کو یہ سمجھ کر جائز نہ کہیں کہ یہ نظام ابھی اپنی ابتدائی عمر سے گزر رہا ہے اس لئے اسے وقت دیا جائے!۔ بلکہ ہماری نظر میں مروجہ مرابحہ اور سودی بینکوں کا سودی قرضہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، بلکہ اس سے بھی کڑوی حقیقت تو یہ ہے کہ صارفین کے لئے سودی بینک، اسلامی بینکوں سے کہیں زیادہ رحم دل واقع ہوئے ہیں۔

مروّجہ اجارہ کی شرعی حیثیت

اجارہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ہے اجرت دینا۔

فقہاء کی اصطلاح میں:

اجارہ سے مراد ایسا معاہدہ ہے جس میں ایک متعین چیز کے مخصوص فائدہ کو محدود مدت تک معلوم عوض کے بدلہ دیا جائے، یا کسی عمل کے بدلہ عوض ادا کیا جائے۔][41

اس کی مثال یوں ہے کہ :ایک شخص اپنا گھر کسی کو محدود مدت تک رہائش کے لئے دے اور اس کے عوض اس سے کرایہ وصول کرے جو کہ دونوں فریقین کے علم میں ہو۔

مروجہ اجارہ کی صورت

اسلامی بینکوں میں کیا جانے والا اجارہ، شرعی اجارہ سے صورت میں کافی مختلف ہے، اسے

اجارۃ المنتھیہ بالتملیک

(Hire – Purchase) کہتے ہیں۔یعنی کرایہ کا ایسا معاہدہ جس کے آخر میں چیز کی ملکیت کرائے دار کو منتقل ہو جائے۔اجارہ کی یہ صورت فقہاء نے ذکر نہیں کی اور نہ ہی اس طرح اجارہ کا تصور فقہاء نے دیا بلکہ (Hire – Purchase) کا آغاز ہی اسلامی سرزمین پر نہیں ہوا، اس کا آغاز سب سے پہلے امریکہ میں 1905ء میں ہوا۔[42] بعد میں اسے سودی بینکوں نے (Leasing Contract) کے نام سے ترویج دی، اور اسی صورت کو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ اسلامی بینکوں میں اجارہ کے نام سے شروع کیا گیا۔ اس معاہدہ کا بنیادی مقصد کسی چیز کو کرایہ پر دینا نہیں ہے، بلکہ اس چیز کو فروخت کرنا ہے، اور خریدنے والا اس چیز کی قیمت اقساط میں ادا کرتا ہے، جبکہ اس کی ملکیت بیچنے والے کے پاس رہتی ہے، اور بظاہر معاہدہ کرایہ کا کیا جاتا ہے ، خرید و فروخت کا نہیں۔اسلامی بینکوں میں اجارہ کے ذریعہ (Car Financing) اور (Home Financing) بجاتی ہے۔

مروجہ اجارہ میں ملکیت کے انتقال کی صورتیں

اسلامی بینکوں میں کئے جانے والے اجارہ کے معاہدے میں گاڑی یا گھر کی ملکیت پہلے بینک حاصل کرتا ہے پھر اسے صارف کو کرایہ پر دیتا ہے، کرایہ کی مدت کے اختتام پر ملکیت منتقل کرنے کی کئی صورتیں اسلامی بینکوں میں رائج ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ عام صورتیں یہ ہیں:

1۔ کرایہ کی مدت کے اختتام پر کرایہ کو ہی قیمت تصور کر کے چیز کی ملکیت صارف کو منتقل کرنا۔یعنی کرایہ کا معاہدہ اور پھر بغیر کسی الگ معاہدہ کے ملکیت کی منتقلی۔

2۔ بینک اپنے صارف سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ اگر اس نے مقررہ مدت تک کرایہ ادا کیا تو بینک اسے مذکورہ چیز ہدیہ کر دے گا۔ یعنی کرایہ کا معاہدہ اور اس معاہدہ میں ہدیہ کا وعدہ۔

3۔ بینک اپنے صارف سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ اگر اس نے مقررہ مدت تک کرایہ ادا کیا تو بینک اسے مذکورہ چیز الگ معاہدہ کر کے نمائشی قیمت کے بدلہ بیچ دے گا۔ یعنی کرایہ کا معاہدہ اور اس معاہدہ میں بیچنے کا وعدہ۔

اول الذکر صورت بالاتفاق حرام ہے اور اس پر مجمع فقہ اسلامی اور ہیئۃ کبار علماء سعودی عرب کا فتوی بھی ہے، کیونکہ اس میں ایک ہی چیز پر بیک وقت دو معاہدوں کو ملا دیا گیا ہے، جس سے بہت سی شرعی مخالفتیں جنم لیتی ہیں، اور اب یہ صورت اسلامی بینکوں میں موجود نہیں ہے۔

مروجہ اجارہ کی صورت تصویر نمبر 2 میں ملاحظہ کریں

picture

وضاحت:

(1) صارف، بینک سے معاہدہ کرتا ہے کہ وہ بینک سے مطلوبہ سامان (گھر، گاڑی) کرایہ پر حاصل کرے گا، اور اس کے لئے بطور ضمانت (Security) مخصوص رقم بینک میں جمع کراتا ہے۔

(2) بینک مطلوبہ سامان یا تو خود خریدتا ہے یا پھر صارف کو اپنا وکیل بناتا ہے اور صارف بینک کی طرف سے مطلوبہ سامان خریدتا ہے۔

(3) بینک مطلوبہ سامان کی قیمت فروخت کنندہ کو نقد ادا کرتا ہے۔

(4) صارف بینک سے اجارہ کا معاہدہ کر کے گاڑی حاصل کرتا ہے۔

(5) صارف مخصوص مدت تک بینک کو کرایہ ادا کرتا ہے، یہ کرایہ عموماً (KIBOR) یا (LIBOR) سے منسلک ہوتا ہے۔

(6) کرایہ کی مدت ختم ہونے کے بعد درج بالا انتقال ملکیت کی صورتوں میں سے کسی ایک صورت کے ذریعہ چیز کی ملکیت صارف کو منتقل ہو جاتی ہے۔

مروجہ اجارہ اور شرعی اجارہ میں کئی بنیادی فرق ہیں

(1)شرعی اجارہ میں مطلوبہ سامان مؤجر (کرایہ لینے والا) کی ملکیت ہوتا ہے اور اس کے پاس موجود ہوتا ہے، جبکہ مروجہ اجارہ میں مطلوبہ سامان بینک کے پاس موجود نہیں ہوتا بلکہ وہ بعد میں خرید کر اسے صارف کے حوالہ کرتا ہے۔

(2)شرعی اجارہ میں مؤجر کا مقصود سامان کی ملکیت اپنے پاس رکھ کر صرف اس کی مخصوص منفعت کو کرایہ پر دینا ہے، اور مستاجر (کرایہ دار) کا مقصد بھی سامان کے عین کا حصول نہیں بلکہ اس کی منفعت کا حصول ہوتا ہے، جبکہ مروجہ اجارہ میں بینک کا مقصود صرف منفعت کو کرایہ پر دینا نہیں ہوتا بلکہ سامان بیچنا ہوتا ہے، اور صارف کا مقصد بھی کوئی مخصوص منفعت کا حصول نہیں بلکہ سامان کی ملکیت کا حصول ہوتا ہے۔

مروجہ اجارہ، درحقیقت اجارہ ہے یا بیع

شریعت کا قانون ہے کہ

العبرة في العقود بالمقاصد و المعاني لا بالألفاظ و المباني

کہ شرعی

رو سے معاملات میں مقاصد کا اعتبار کیا جاتا ہے، ظاہری الفاظ کا نہیں۔ مروجہ اجارہ میں اسلامی بینکوں کا مقصود سامان کی فروخت ہوتا ہے اور صارف کا مقصود سامان خریدنا ہوتا ہے، بظاہر معاملہ کرایہ داری کی بنیاد پر طے کیا جاتا ہے، اور کرایہ بھی چیز کی قیمت کے حساب سے متعین کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ابراہیم ابواللیل کہتے ہیں: "یہ معاہدہ دراصل قسطوں پر بیع کی نئی شکل ہے"[43] اسی طرح دیگر کبار اہل علم بھی اسی کے قائل ہیں کہ یہ اجارہ نہیں بیع ہے، ان میں سلیمان بن ترکی التر کی[44]، شیخ عبداللہ محمد عبداللہ[45]، شیخ دبیان محمد الدبیان[46] شامل ہیں، اسی طرح بعض ممالک کے قوانین میں بھی اسے بیع ہی تصور کیا گیا ہے جیسا کہ مصر کا شہری قانون[47] اور کویت کا تجارتی قانون[48]۔ اسی لئے مروجہ اجارہ کو (Ijarah Financing) اور (Ijarah Loan) کہا جاتا ہے، اور اسی لئے کوئی ایک اسلامی بینک بھی مروجہ اجارہ کے تحت دی گئی چیز کی واپسی کا تقاضہ نہیں کرتا، اب چونکہ مقصد چیز کی بیع ہے لہذا مروجہ اجارہ پر، کرایہ داری کے احکامات لاگو نہیں ہوں گے بلکہ بیع کے احکامات کا اطلاق کیا جائے گا۔ اور اجارہ کی مکمل صورت کا جائزہ لینے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ دراصل اقساط پر چیز کی فروخت ہے جسے اجارہ کا نام دیا گیا ہے۔

اسلامی بینک قسطوں پر چیز کی فروخت کا طریقہ کار کیوں اختیار نہیں کرتے؟

یہ ایک بہت اہم سوال ہے کہ جب مروجہ اجارہ میں قسطوں پر فروخت کے طریقہ سے بہت حد تک مماثلت ہے اور مروجہ اجارہ میں اصل مقصد بھی چیز کی فروخت ہی ہے تو پھر اتنا حیلہ کر کے اجارہ اور بیع کو ملانے کی کیا ضرورت ہے ؟اسلامی بینک، اسے بیع التقسیط ہی کیوں نہیں کہہ دیتا اور اپنی اور صارف کی حیثیت کو مالک اور کرایہ دار کے بجائے، فرخت کنندہ اور خریدار کی حیثیت سے متعارف کیوں نہیں کراتا؟۔

اس کا آسان اور سیدھا سا جواب یہ ہے کہ، تاکہ بینک سامان قسطوں پر فروخت کرنے کے باوجود بھی سامان کی ملکیت اپنے پاس رکھے اور اسے مکمل اطمینان رہے، اور وہ ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رہے، وہ اس طرح کہ:

اجارہ میں کرایہ دار سامان کا مالک نہیں ہوتا، اگر کسی موقع پر کرایہ دار، کرایہ ادا کرنے سے عاجز ہو تو بینک اس سے اپنا سامان واپس لے سکتا ہے، اور اس سے جو رقم بینک نے وصول کی تھی وہ چونکہ کرایہ تھا اس لئے بینک اسے واپس نہیں کرتا کیونکہ صارف اس کرایہ کے عوض منفعت حاصل کر چکا ہے، اور اجارہ فسخ ہونے کی صورت میں مؤجر کرایہ واپس نہیں کرتا، جبکہ قسطوں پر فروخت کی صورت میں سامان کی ملکیت صارف کو مل جانے کے بعد اگر صارف اقساط ادا نہ کر سکے اور وہ تنگ دست ہو تو شرعی طور پر بینک اس پر جرمانہ نہیں لگا سکتا اور نہ ہی وہ سامان زبردستی واپس لے سکتا ہے، اور اگر سامان واپس لے تو شرعی اور قانونی طور پر بینک پر یہ واجب ہوتا ہے کہ صارف کی ادا کردہ رقم میں سے سامان کے استعمال کے برابر رقم منہا کر کے باقی رقم صارف کو واپس کرے۔

مروجہ اجارہ میں بینک سامان کی انشورنس کراتا ہے اور سامان تلف ہو جانے کی صورت میں انشورنس سے حاصل شدہ رقم کا سامان کے مالک ہونے کی حیثیت سے قانونی حقدار ٹھہرتا ہے، جبکہ صارف چونکہ صرف کرایہ دار ہے اس لئے وہ خالی ہاتھ رہتا ہے، اور دوسری طرف سامان (گھر، گاڑی) پر لگنے والے ٹیکس، اور سامان (مثلاً گاڑی) کے خراب ہونے کی صورت میں درستگی وغیرہ کے اخراجات کو "جاری اخراجات (Running Expenses)" کہہ کر بینک صارف کے ناتواں کندھوں پر ڈال دیتا ہے۔

شرعی اجارہ میں بعض صورتوں میں کرایہ دار سے کرایہ معاف ہو جاتا ہے جب کرایہ دار کو سامان کی مخصوص منفعت حاصل نہ ہو، مثال کے طور پر اگر اس نے گھر کرایہ پر حاصل کیا اور گھر پر کسی نے جبراً قبضہ کر لیا تو ایسی صورت میں چونکہ اسے گھر کی مطلوبہ منفعت حاصل نہیں، اس لئے وہ کرایہ ادا نہیں کرتا، لیکن مروجہ

اجارہ میں چونکہ بینک صارف کو گھر کرایہ پر نہیں دے رہا ہوتا بلکہ در حقیقت بیچ رہا ہوتا ہے اس لئے وہ بہر صورت صارف سے ماہانہ رقم وصول کرتا رہتا ہے، چاہے صارف کو منفعت حاصل ہو یا نہیں۔

صارف چونکہ کرایہ دار ہے اس لئے وہ یہ سامان (مثلاً گھر) کسی کو بیچ نہیں سکتا، جبکہ بینک چونکہ مالک مکان ہے اس لئے وہ جب چاہے کسی کو بھی وہ سامان بیچ سکتا ہے، اور صارف اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔

الغرض کہ اسلامی بینک اجارہ اور بیع کے ملاپ سے بننے والے مروجہ اجارہ میں ہر جائز و ناجائز فائدہ سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ اس اجارہ کی حقیقت ہے جسے اسلامی بینک سودی بینکوں کے لیزنگ (Leasing Contract) کا متبادل قرار دیتے ہیں۔

مروجہ اجارہ میں شرعی اعتراضات

)پہلا اعتراض(

بینک کا صارف سے وعدہ لینا کہ وہ مطلوبہ سامان کو بینک سے کرایہ پر حاصل کرے گا۔

یہ بالکل اسی وعدہ کی طرح ہے جو مروجہ مرابحہ کے (Master Murabaha Facility Agreement) میں بینک صارف سے لیتا ہے، اور مزید اطمئنان کے لئے مخصوص رقم سیکیورٹی کے طور پر بھی لی جاتی ہے۔ اس حوالہ سے گزشتہ صفحات میں تفصیل گزر چکی ہے کہ اگر صارف پر اس وعدہ کے ایفاء کو قانوناً لازم کیا جاتا ہے تو اس سے معاملہ ناجائز ہو جاتا ہے، کیونکہ اس وعدہ کی وجہ سے معاہدہ منعقد ہو جاتا ہے اور بعد میں الگ سے جو اجارہ یا مرابحہ کا معاہدہ کیا جاتا ہے وہ محض دکھلاوا ہے، کیونکہ جس ایگریمنٹ میں صارف سے پہلے ہی وعدہ لے لیا گیا ہے اسی میں مطلوبہ سامان کی تفصیلات، کرایہ کا تعین، ادائیگی کا طریقہ کار طے کر لیا جاتا ہے، جبکہ ابھی بینک نے مطلوبہ سامان حاصل نہیں کیا ہوتا۔ اور بیع کی طرح اجارہ میں بھی یہ شرط ہے کہ مؤجر (سامان کرایہ پر دینے والا) کے پاس سامان موجود ہو۔

)دوسرا اعتراض(

بینک کا صارف کو وکیل بنانا۔

اس حوالہ سے بھی مرابحہ میں تفصیل گزر چکی ہے کہ بینک کا صارف کو ہی وکیل بنا دینے سے معاملہ مشتبہ ہو جاتا ہے اور سودی تمویل کے مشابہ ہو جاتا ہے۔

)تیسرا اعتراض(

بینک کا سامان کی ملکیت کو اپنے پاس رکھنا۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان ہوا ہے کہ مروجہ اجارہ دراصل بیع (خرید وفروخت) کا معاملہ ہے، لہذا اس پر بیع کے احکامات کا ہی اطلاق کیا جائے گا۔ بیع کے احکامات میں سے ایک یہ ہے کہ معاہدہ ہونے کے بعد سامان کی ملکیت بائع سے مشتری کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، چاہے قیمت مکمل ادا کی گئی ہو یا ادائیگی جاری ہو مجمع الفقہ الاسلامی کی قسطوں پر خرید وفروخت کے بارے میں قرارداد کے مطابق:

لا حقَّ للبائع في الاحتفاظ بِملكيّة المبيع بعد البيع

بائع کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ بیع ہو جانے کے بعد ملکیت کو اپنے پاس محفوظ رکھے[49]۔ جبکہ مروجہ اجارہ میں بینک چیز کی ملکیت کو اپنے پاس رکھتا ہے، اور بعد میں آخری قسط کی ادائیگی کے بعد خود بخود یا پھر الگ معاہدہ کے تحت یا ہدیہ کے ذریعہ سامان کی ملکیت منتقل کی جاتی ہے۔

)چوتھا اعتراض(

ایک معاہدہ میں دو معاہدے" کی قباحت مروجہ اجارہ میں صارف کو ملکیت کی منتقلی کے لئے عموماً بینک کی جانب سے ہدیہ کا وعدہ کیا جاتا ہے، یا مدت کے اختتام پر رسمی قیمت کے بدلہ فروخت کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ مرابحہ کی بحث میں تفصیلاً گزر چکا ہے کہ کسی معاہدہ میں کسی چیز کا دو طرفہ یا یکطرفہ وعدہ اور اس کا التزام دراصل بذات خود ایک معاہدہ کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے، کیونکہ قانوناً و قضاء لازمی ایفاء، معاہدہ کی صفت ہے نا کہ وعدہ کی۔ لہٰذا اسلامی بینک کا صارف سے کیا گیا وعدہ ایک معاہدہ ہے اور اس طرح اجارہ کے معاہدہ میں دو معاہدے شامل ہیں: اجارہ کا معاہدہ، بیع کا معاہدہ۔ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اجارہ کے ساتھ بیع کا معاہدہ کیا جا سکتا ہے، اور دونوں معاہدوں کو ایک معاہدہ میں جمع کیا جا سکتا ہے، ڈاکٹر علی قرۃ الداغی کہتے ہیں: "جمہور فقہاء (مالکیہ، شافعیہ، اور حنابلہ) نے اجارہ اور بیع کو ایک معاہدہ میں جمع کرنے کو جائز کہا ہے۔ شرح الخرشی میں ہے: "اجارہ اور بیع کو ایک معاہدہ میں جمع کرنا جائز ہے، جیسے کوئی شخص کسی سے کھال خریدے اس شرط پر کہ بیچنے والا اس کھال سے مشتری کو جوتا بنا کر دے گا"[50]۔ اسی طرح المغنی میں ہے: "اگر دو مختلف قیمت والے عقد ایک عوض کے بدلہ جمع کر دئے جائیں ۔۔۔ جیسے وہ یوں کہے: میں تمہیں یہ گھر بیچتا ہوں اور دوسرا گھر کرایہ پر دیتا ہوں ایک ہزار کے عوض، تو یہ عقد صحیح ہو گا۔[51]

اس کا جواب یہ ہے کہ:

اولاً:

مروجہ اجارہ درحقیقت اجارہ نہیں بلکہ بیع ہے، کیونکہ اس میں مؤجر (بینک) اور مستاجر (صارف) کا مقصد سامان کی منفعت نہیں ہوتا بلکہ تملیک اور تملک ہوتا ہے، یعنی چیز بیچنا اور خریدنا مقصود ہوتا ہے، لہٰذا مروجہ اجارہ میں بیع کا وعدہ ایک معاہدہ میں دو معاہدے کی قباحت کو شامل ہے۔

ثانیاً:

مروجہ اجارہ میں اجارہ اور بیع کے جمع ہونے سے بیع میں غرر اور جہالت داخل ہو جاتی ہے، چونکہ بیع آخری قسط کی ادائیگی کے ساتھ معلق ہوتی ہے، اور بیع میں ضروری ہے کہ مبیع (سامان) کی کیفیت سے فروخت کنندہ اور خریدار دونوں مکمل آگاہ ہوں، لیکن مروجہ اجارہ میں بینک اور صارف دونوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ آخری قسط کی ادائیگی تک مبیع (سامان) کی کیا کیفیت ہو گی؟ بینک صارف سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ اجارہ کی مدت کے اختتام پر یہ چیز اسے بیچ دے گا، اور دونوں کو ہی اس بات کا یقین نہیں ہوتا کہ مقررہ مدت تک چیز باقی بھی ہو گی یا نہیں، اگر موجود ہو گی تو اس کی کیفیت کیسی ہو گی؟۔

جہاں تک ہدیہ کا تعلق ہے تو یہ ہدیہ اقساط پوری کرنے کے عوض دیا جارہا ہے اور اگر ہدیہ کسی عوض کے بدلہ ہو تو اس کا حکم ہدیہ کا نہیں ہوتا بلکہ بیع کا حکم ہوتا ہے، ایسے ہدیہ کو ہدیۃ الثواب کہتے ہیں، شرح حدود ابن عرفہ میں ہے:

ھبۃ الثواب.. عطیۃ قصد بھا عوض مالي.. وحکمھا حکم البیع

ہدیہ ثواب ایسا عطیہ ہے جس میں مالی عوض کا حصول مراد ہو، اور ایسے ہدیہ پر بیع کا حکم لگتا ہے"۔ دلیل الطالب میں ہے:

فإن کانت بعوض معلوم فبیع

اگر ہدیہ کسی معلوم عوض کے بدلہ ہو تو وہ بیع ہے۔ امام کاسانی رحمہ اللہ بدائع الصنائع میں لکھتے ہیں: "اگر وہ ہدیہ دیتے وقت عوض (بدلہ) کی شرط لگادے یعنی وہ یوں کہے کہ: "میں تمھیں یہ چیز تحفہ میں دیتا ہوں اس شرط پر کہ تم مجھے وہ کپڑا دو گے"، تو ایسے معاہدہ کی نوعیت میں اختلاف ہے، ہمارے تینوں اصحاب) امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، اور امام محمد (یہی کہتے ہیں کہ یہ معاہدہ ہے تو ہدیہ کا لیکن اس کا حکم تجارت کا ہو گا"[52]۔ تو واضح ہوا کہ اس ہدیہ کا حکم بھی بیع کا ہی ہے کیونکہ بینک صارف کو یہ ہدیہ اقساط پوری کرنے کے عوض دیتا ہے، اور

چونکہ یہ بیع ہے لہٰذا اس کا وعدہ کرنا، بیع کا وعدہ ہے اور وعدہ میں جب یکطرفہ یا دوطرفہ التزام ہو تو ایسا وعدہ معاہدہ میں بدل جاتا ہے، لہٰذا مروجہ اجارہ میں سامان کی ملکیت کی منتقلی کے لئے بینک کا صارف سے ہدیہ کا وعدہ کرنا دراصل دو معاہدوں کو ایک معاہدہ میں جمع کرنا ہے۔

اسلامی بینک کی طرف سے ہدیہ کے حوالہ سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہم یہ ہدیہ اقساط کے بدلہ نہیں دے رہے، بلکہ یہ محض ہدیہ ہے جو ہم اپنے صارف کو اچھے مراسم کی بنیاد پر دے رہے ہیں، تو ہمارا اسلامی بینک سے یہ سوال ہے کہ کیا وہ گاڑی اور گھر جو انہوں نے صارف کو اجارہ کے طور پر دیئے تھے اور پانچ سال، دس سال تک اس کا کرایہ (بقول بینک) وصول کیا، کیا بینک وہ گھر اور گاڑی اپنے صارف سے واپس لے سکتا ہے؟، ایک اور سوال یہ ہے کہ پاکستان جیسے غریب ملک میں جہاں غربت اپنی حدوں کو چھو رہی ہے لاکھوں کروڑوں افراد ایسے ہیں جنہیں کوئی رہائش میسر نہیں، جن کے پاس کوئی سواری نہیں، تو اسلامی بینک ایسے صارف کو جو مہنگی رہائش کے بھی متحمل ہو سکتے ہیں، اور مہنگی سواری بھی خرید سکتے ہیں کو ہی گھر اور گاڑی ہدیہ کرنے پر مصر کیوں ہیں، کیا وہ یہ گاڑیاں اور گھر جنہیں وہ بلا عوض اپنے صارفین کو ہدیہ کر رہے ہیں ان غریبوں کو نہیں دے سکتے جو اس کے اصل مستحق ہیں؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی بینک ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ وہ یہ ہدیہ ان اقساط کے عوض دے رہے ہیں جو انہوں نے وصول کی ہیں، لہٰذا اسے ہدیہ نہیں بیع ہی کہا جائے گا۔

خلاصہ کلام

مروجہ اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ، شرعی اجارہ سے عملی اور ماہیتی اعتبار سے بہت مختلف ہے۔

مروجہ اجارہ درحقیقت بیع کا معاملہ ہے اور اس پر بیع کے احکامات کا ہی اطلاق کیا جائے گا۔

مروجہ اجارہ میں درج ذیل شرعی قباحتیں پائی جاتی ہیں:

بینک کا صارف سے اجارہ کی ابتداء میں لیا جانے والا وعدہ جس کا قانوناً التزام کرایا جاتا ہے یہ وعدہ مروجہ اجارہ کو "بیع مالا یملک" (ایسی چیز کی فروخت جو انسان کی ملکیت میں نہ ہو) جیسی ممنوع بیع کے حکم میں داخل کر دیتا ہے۔

بینک کا اجارہ میں مطلوبہ سامان کی خریداری کے لئے صارف ہی کو وکیل مقرر کرنا۔ جو اس معاملہ کو سودی تمویل سے مشابہ کر دیتا ہے۔

بینک کامروجہ اجارہ میں کرایہ کے تعین میں شرح سود کو معیار مقرر کرنا۔ جس کے سبب اجارہ میں کرایہ مجہول (نام معلوم) ہو جاتا ہے۔

اقساط کی ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں صارف پر لگایا جانے والا جرمانہ جسے صدقہ کا نام دیا جاتا ہے۔

بینک کا سامان کی ملکیت کو اپنے پاس رکھنا۔

ایک معاہدہ میں دو معاہدے کی قباحت۔

ان تمام شرعی اعتراضات کی موجودگی کے سبب اسلامی بینکوں میں جاری اجارہ کا معاہدہ شرعی لحاظ سے صحیح نہیں ۔اس کے ناجائز و حرام ہونے کا فتوی سعودی عرب کی کبار علماء کمیٹی نے بھی دیا ہے اور اس کا بنیادی سبب ایک معاہدہ میں دو معاہدوں کی قباحت قرار دیا ہے۔[53]

مروجہ اجارہ کا شرعی متبادل

مروجہ اجارہ کا حقیقی شرعی متبادل، قسطوں پر بیع ہے، اور اس میں بینک کے لئے یہ سہولت بھی ہے کہ وہ چیز فروخت کرنے کے بعد اس کی ملکیت بطور رہن کے اپنے پاس رکھ لے، اور جب اقساط مکمل ہو جائیں تو اس کی ملکیت صارف کو واپس کر دی جائے۔ یہی وہ متبادل ہے جس کی طرف سعودی عرب کی علماء کمیٹی نے بھی درج بالا فتوی میں رہنمائی کی ہے۔

مشارکہ متناقصہ

Diminishing Musharakah

مشارکہ عربی کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے شراکت داری۔ اصطلاحی طور پر فقہاء نے مشارکہ کی مختلف تعریفات کی ہیں جو کہ تقریباً ہم معنی ہیں، ان تعریفات میں سے ایک یہ ہے کہ:

الإجتماع في إستحقاق أو تصرف

کسی چیز کے استحقاق (حق ملکیت) یا اس کے تصرف میں (دو یا دو سے زائد افراد کا) جمع ہو جانا[54]۔ یعنی دو یا دو سے زائد افراد مل کر کوئی چیز خریدیں یا اس کی ملکیت بغیر کسی معاہدہ کے دونوں کو مل جائے، یا دو یا دو سے زائد افراد مل کر سرمایہ لگا کر کوئی کاروبار شروع کریں اور اس کے منافع میں حصہ دار بنیں۔

مشارکہ کے جواز کی دلیل

اللہ رب العزت کا فرمان ہے:

﴿فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ﴾

النساء:12

ترجمہ: ''اگر (میت) کی وراثت میں (میت کے بھائی بہن) دو سے زائد ہوں تو وہ مال کے تیسرے حصہ میں شراکت دار ہیں''۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ﴾

الزمر:29

ترجمہ: ''اللہ تعالی مثال بیان کرتا ہے ایسے شخص کی جس (کی ملکیت) میں کئی شراکت دار ہیں جو ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں''۔

اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾

ص:24

ترجمہ: ''اور بیشک بہت سے شراکت دار ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں، سوائے ان کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے''۔

اسی طرح نبی ﷺ کا فرمان ہے:

إن اللّٰه عز وجل يقول: أنا ثالث الشريكين ما لم يخن أحدهما صاحبه فإذا خانه خرجت من بينهما

بیشک اللہ تعالی فرماتا ہے کہ میں دو شراکت داروں کے ساتھ تیسرا ہوں جب تک کہ ان میں سے کوئی اپنے شریک کے ساتھ خیانت نہیں کرتا، جب وہ خیانت کرتا ہے تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں۔

مشارکہ کی اقسام

مشارکہ کی بنیادی طور پر دو قسام ہیں:

)ا (شرکۃ الملک۔(۲) شرکۃ العقد۔

(1)شرکۃ الملک:

اس سے مراد یہ ہے کہ دو یا دو سے زائد افراد کسی چیز کی ملکیت میں شراکت دار ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ دونوں کی شراکت داری برابر ہو۔ اور اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ شراکت داری کا سبب خرید و فروخت ہی ہو، بلکہ وصیت یا ہدیہ وغیرہ کے ذریعہ بھی دو یا دو سے زائد افراد کسی چیز کی ملکیت میں شریک بن سکتے ہیں۔

(2) شرکۃ العقد:

عقد کا مطلب ہے معاہدہ، اس سے مراد ایسا معاہدہ ہے جس کے ذریعہ دو یا دو سے زائد افراد مال میں یا عمل میں یا دونوں میں شریک (پارٹنر) بنتے ہیں، اور تمام شرکاء کو مال یا عمل میں تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، اور شراکت داری سے وجود میں آنے والے کاروبار و تجارت کا منافع طے شدہ تناسب کے مطابق تمام شرکاء میں تقسیم ہوتا ہے اسے (Joint Commercial Enterprise) کہا جاتا ہے۔ شرکۃ العقد کی مزید پھر کچھ اقسام ہیں:

(1) مال میں شراکت

یہ قسم مالی شراکت کے تناسب، اور حق تصرف کے لحاظ سے دو اقسام پر مبنی ہے:

عقد کا مطلب ہے معاہدہ، اس سے مراد ایسا معاہدہ ہے جس کے ذریعہ دو یا دو سے زائد افراد مال میں یا عمل میں یا دونوں میں شریک (پارٹنر) بنتے ہیں، اور تمام شرکاء کو مال یا عمل میں تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، اور شراکت داری سے وجود میں آنے والے کاروبار و تجارت کا منافع طے شدہ تناسب کے مطابق تمام شرکاء میں تقسیم ہوتا ہے اسے (Joint Commercial Enterprise) کہا جاتا ہے۔ شرکۃ العقد کی مزید پھر کچھ اقسام ہیں:

(1) مال میں شراکت

یہ قسم مالی شراکت کے تناسب، اور حق تصرف کے لحاظ سے دو اقسام پر مبنی ہے:

(1) شرکۃ العنان:

اس سے مراد ایسی شراکت داری ہے جس میں مالی، عملی شراکت داری کا تناسب، حق تصرف، منافع کی تقسیم برابری کی سطح پر نہ ہو، یعنی کسی شریک کا مال زیادہ ہو، کسی کو تصرف کا اختیار زیادہ دے دیا جائے، اسی طرح کسی شریک کو دیگر شرکاء کی نسبت زیادہ منافع ملے۔ البتہ خسارہ کی صورت میں ہر شریک اپنی مالی شراکت داری کے حساب سے نقصان برداشت کرتا ہے۔

(2)شرکۃالمفاوضۃ:

اس سے مراد ایسی شراکت داری ہے جس میں تمام شرکاء مالی، عملی شراکت داری، حق تصرف، منافع کی تقسیم اور خسارہ اٹھانے میں برابر ہوں،اس کے شرعی حکم میں اختلاف ہے اور راجح یہی ہے کہ

شرکۃالمفاوضۃ

ناجائز ہے۔

(2)عمل میں شراکت

(3)ایک شریک کی جانب سے مال اور دوسرے شریک کی جانب سے عمل

اس شراکت داری کو اصطلاحاً مضاربہ کہتے ہیں۔

مشارکہ متناقصہ کی تعریف:

درج بالا تفصیل ذکر کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ مشارکہ متناقصہ شراکت داری کی ایک نئی قسم ہے جس کا ذکر کتب فقہ میں نہیں ملتا اور سب سے پہلے اس کا استعمال اسلامی بینک میں ہی کیا گیا ہے۔ متناقصہ نقص سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے کمی۔

مشارکہ متناقصہ سے مراد ایسا مشارکہ ہے جس میں ایک شریک دوسرے شریک کا حصہ تدریجاً خریدنے کا وعدہ کرتا ہے حتی کہ آخر میں وہ شریک پورے اثاثہ کا مالک بن جاتا ہے۔[55]اسلامی بینکوں میں مشارکہ متناقصہ کا استعمال عموماً ٹھوس اثاثہ جات کی تمویل (Fixed Asset Financing) میں کیا جاتا ہے،اور کبھی کسی کاروبار میں مشارکہ متناقصہ کے ذریعہ مالی تمویل کاری کی ضروریات کو بھی پورا کیا جاتا ہے۔ شرعیہ اسٹینڈرز کے مطابق مشارکہ متناقصہ کا شمار شرکۃالعقد کی قسم شرکۃالعنان میں سے ہے۔[56]جبکہ مروجہ اسلامی بینکوں کے تعامل سے یہ محسوس ہوتا ہے وہ اسے شرکۃالملک کی حیثیت دیتے ہیں۔

اسلامی بینکوں میں مشارکہ متناقصہ کے ذریعہ عموماً جن چیزوں میں تمویل کی جاتی ہے ان میں:

House Financing

Car Financing

Plant and machinery financing

وغیرہ شامل ہیں۔

مشارکہ متناقصہ کی صورت

وضاحت:

(1)سب سے پہلے صارف بینک سے اپنے مطلوبہ سامان کے لئے تمویل (Financing) کی خواہش کا اظہار کرتا ہے،اور بینک صارف سے مشارکہ کا معاہدہ کرتا ہے۔اسی معاہدہ میں صارف بینک سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ مطلوبہ سامان میں بینک کا جو حصہ (Share) بنتا ہے وہ الگ الگ (Units) کی صورت میں ماہانہ یا سہ ماہی بنیادوں پر خریدے گا۔

(2) بینک اور صارف دونوں مل کر مطلوبہ سامان میں مخصوص رقم ادا کر کے ملکیت میں شراکت دار بن جاتے ہیں، جس میں بینک کا حصہ کم از کم 80 اور زیادہ سے زیادہ 90 فیصد تک ہوتا ہے اور اگر کوئی کاروبار ہے تو صارف اور بینک شرکہ العقد کے ذریعہ پارٹنر بن جاتے ہیں۔

(3)صارف اور بینک کے سرمایہ سے مطلوبہ سامان حاصل کیا جاتا ہے یا کوئی کاروبار شروع کیا جاتا ہے۔

(4)اگر مشارکہ متناقصہ کے ذریعہ کوئی سامان خرید اگیا ہے تو مذکورہ سامان کو صارف استعمال کرتا ہے مثلاً: گھر میں رہائش رکھتا ہے یا گاڑی کو استعمال کرتا ہے،اسی استعمال کو بینک منافع تصور کرتا ہے جو کہ صارف کو مل رہا ہے اور اگر کوئی کاروبار ہے تو اس سے حاصل ہونے والی آمدنی یا منافع بینک اور صارف کے مابین شراکت داری کے تناسب سے تقسیم ہوتا ہے۔

(5) بینک اپنی شراکت داری کو اکائیوں (Units) میں تقسیم کرتا ہے،مثلاً اگر بینک کا حصہ 80 فیصد ہے تو بینک اسے آٹھ آٹھ فیصد کی دس یا دس دس فیصد کی آٹھ اکائیوں (Units) میں تقسیم کرتا ہے،اور صارف اپنے وعدہ کے مطابق مخصوص مدت میں ان اکائیوں کو خریدنے کا پابند ہوتا ہے، حتیٰ کہ آخری اکائی کی خریداری کے ساتھ ہی شراکت داری ختم ہو جاتی ہے اور صارف اس چیز کی مکمل ملکیت حاصل کر لیتا ہے۔اور جب تک وہ ان اکائیوں کو مکمل خرید نہیں لیتا اس وقت تک چونکہ وہ محصولہ سامان میں بینک کا حصہ استعمال کر رہا ہے لہذا وہ بینک کو اس کے حصہ کے تناسب سے کرایہ ادا کرتا ہے۔

اس مکمل وضاحت کی روشنی میں مشارکہ متناقصہ کی صورت یوں بنتی ہے کہ گھر کی خریداری کا خواہش مند صارف بینک سے مشارکہ کی بنیاد پر گھر خریدنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے، بینک اور صارف سرمایہ لگا کر ایک گھر جس کی قیمت مثلاً دس لاکھ روپے ہو خریدتے ہیں،اس میں صارف دو لاکھ روپے ادا کرتا ہے اور بینک آٹھ لاکھ روپے،

اس طرح صارف کا اس شراکت داری میں حصہ بیس فیصد ہوتا ہے اور بینک کا اسی فیصد، پھر مشارکہ کی ابتداء میں کئے گئے معاہدہ کے مطابق صارف متعین مدت میں بینک کا حصہ خریدتا ہے، بینک اپنے حصہ کو اکائیوں (Units) میں تقسیم کرتا ہے، مثلاً وہ ایک لاکھ کے آٹھ یونٹس بناتا ہے اور صارف اپنے وعدہ کے مطابق ہر تین مہینہ بعد ایک یونٹ خریدنے کا پابند ہوتا ہے۔

مروجہ مشارکہ متناقصہ پر شرعی اعتراضات

)پہلا اعتراض:(

بینک کا صارف سے وعدہ لینا کہ وہ شراکت داری کے ذریعہ حاصل کردہ سامان میں بینک کا جو حصہ بنتا ہے اسے مختلف اکائیوں (Units) کی صورت میں خریدے گا۔

بینک یہ وعدہ صارف سے اس وقت لیتا ہے جب ابھی مشارکہ کی تکمیل نہیں ہوتی اور نہ ہی ابھی کوئی سامان خریدا گیا ہوتا ہے، یعنی مشارکہ کی ابتداء ہی میں مشارکہ کے تناقص (Diminish) کا عہد لے لیا جاتا ہے۔ اس وعدہ کی وجہ سے مشارکہ متناقصہ میں کئی شرعی اشکالات وارد ہوتے ہیں:

(1) سرمایہ کی ضمانت

مشارکہ میں دو یا دو سے زائد افراد نفع اور نقصان کی بنیاد پر شراکت داری کرتے ہیں، اگر نفع ہو تو طے شدہ بنیاد پر تقسیم ہو جاتا ہے، اور اگر نقصان ہو تو شراکت داری کے تناسب سے ہر شریک نقصان اٹھاتا ہے اور اس میں کسی کو استثناء نہیں ہوتا، اور مشارکہ میں کسی بھی شریک کے سرمایہ کی ضمانت نہیں دی جاتی، یہی بات مشارکہ کو سودی معاملہ سے الگ کرتی ہے۔ لیکن مروجہ مشارکہ میں بینک کا صارف سے مشارکہ کی ابتداء ہی میں یہ وعدہ لے لینا کہ بینک کا جو حصہ بنتا ہے وہ صارف خریدے گا اور جب تک وہ بینک کا حصہ خرید نہیں لیتا وہ بینک کو کرایہ بھی ادا کرے گا، اور پھر اس وعدہ کو قانوناً لازمی ایفاء کرانا دراصل مشارکہ میں سرمایہ کی ضمانت لینا ہے، اور یہ صورت بالکل یوں ہی بن جاتی ہے جیسے کوئی شخص کسی کو مکان خریدنے کے لئے دس لاکھ روپے قرض دے پھر اس سے گیارہ لاکھ روپے وصول کرے، یعنی مشارکہ میں سرمایہ کی ضمانت لینے یا ضمانت دینے سے مشارکہ سودی معاملہ کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔

(2) ایک معاہدے میں دو معاہدے

مشارکہ متناقصہ میں بینک مشارکہ کے معاہدے کے ساتھ ہی صارف سے وعدہ لیتا ہے کہ وہ موجودہ مشارکہ میں بینک کا جو حصہ بنتا ہے اسے ضرور خریدے گا، اسے بینک وعدہ کا نام دیتے ہیں جبکہ اس وعدہ کا قانوناً التزام کرایا جاتا ہے، اور یہ بات گزشتہ صفحات میں بارہا مقام پر تفصیل کے ساتھ ذکر ہوئی ہے کہ ایسا وعدہ جس میں قانوناً التزام کا عنصر پایا جائے وہ دراصل معاہدہ ہے، وعدہ نہیں۔ اور اس تفصیل کی روشنی میں یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ مروجہ مشارکہ متناقصہ میں بھی یہ قباحت موجود ہے کہ ایک معاہدے میں دو معاہدے جمع کر دیئے جاتے ہیں۔

(3) بیع مالا یملک (ایسی چیز فروخت کرنا جس کا وہ مالک نہ ہو) کی قباحت

بینک صارف سے مشارکہ کے آغاز ہی میں یہ وعدہ لے لیتا ہے کہ صارف بینک کا حصہ خریدے گا، اور جس وقت یہ وعدہ لیا جاتا ہے اس وقت مطلوبہ سامان کی ملکیت حاصل کرنا تو الگ بات، وہ سامان ابھی خریدا بھی نہیں گیا ہوتا، اور جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ جس وعدہ کا قانوناً التزام کرایا جاتا ہو اس کی حیثیت معاہدے کی ہوتی ہے، تو گویا اس معاہدے کے ذریعہ بینک ایسا سامان صارف کو بیچ رہا ہے جو کہ ابھی خود بینک کے پاس موجود نہیں، اور ایسی خرید وفروخت شرعاً جائز نہیں۔

) دوسرا اعتراض:(

بینک کے (Units) خریدنے میں صارف کی طرف سے تاخیر کی صورت میں "صدقہ" کا التزام:

جیسا کہ مرابحہ اور اجارہ کی بحث میں یہ ذکر ہوا کہ کسی بھی مالی معاملہ میں ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں اگر قرضدار جان بوجھ کر تاخیر کا مرتکب ہوا ہو تو اس پر مالی جرمانہ کے علاوہ کوئی اور سزا دی جا سکتی ہے، اور جہاں تک بات ہے صدقہ کی تو یہ دراصل مالی جرمانہ ہے اور قطعاً حرام ہے۔

لیکن مشارکہ متناقصہ میں صدقہ کا التزام نہایت حیران کن ہے، کیونکہ مروجہ مشارکہ میں صارف بینک سے (Units) خریدتے وقت ہر (Unit) کے لئے الگ معاہدہ کرتا ہے جس میں ہر دفعہ الگ ایجاب وقبول ہوتا ہے کیونکہ بینک محصولہ سامان میں خود کو شریک تصور کرتا ہے گویا کہ وہ سامان میں حق ملکیت رکھتا ہے اور صارف نے جب بھی شراکت داری میں اپنا حصہ بڑھانا ہو تو وہ بینک سے ان (Units) کو خریدتا ہے جو کہ محصولہ سامان میں بینک کی حق ملکیت وشراکت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب وہ (Units) بینک کی ملکیت ہیں اور ہر دفعہ صارف یکمشت ادائیگی کر کے ایک ایک (Unit) الگ الگ خریدتا ہے تو وہ شرعاً

وقانوناً بینک کا قرضدار تو نہ ہوا، پھر تاخیر اور سبب تاخیر پر بحث کیوں ہو؟ پھر صارف پر صدقہ کا التزام چہ معنی دارد؟ اور اگر بینک صارف کو اپنا قرضدار سمجھتا ہے اور اس کی نظر میں ان اکائیوں (Units) کی قیمت صارف پر قرض ہے، تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ صارف ان (Units) کا مالک ہے اور اب اس نے صرف ان کی قیمت ادا کرنی ہے، اگر ہم اس بات کو تسلیم کریں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر بینک ان (Units) کا کرایہ کیوں وصول کرتا ہے؟، وہ تو حق ملکیت و حق شراکت ہی نہیں رکھتا کہ اپنے حصہ کو استعمال کرنے پر صارف سے کرایہ کا تقاضا کرے؟۔

الغرض یہ کہ صدقہ کا التزام اور اس کی منطق مرابحہ اور اجارہ میں تو پھر کسی حد تک معقول نظر آتی ہے اگرچہ شرعاً وہ ناجائز ہی سہی، لیکن مشارکہ متناقصہ میں تو صدقہ کا التزام دائرہ معقولیت سے بھی خارج ہے چہ جائیکہ ہم اس پر کوئی شرعی بحث کریں۔

مشارکہ متناقصہ کی مجوزہ شرعی صورت

مشارکہ متناقصہ کی درست شرعی صورت اسی وقت بن سکتی ہے جب اس میں وارد شرعی اعتراضات کو ختم کیا جائے:

(1) بینک مشارکہ کے آغاز میں صارف سے وعدہ لے سکتا ہے کہ صارف بینک کا حصہ خریدے گا، لیکن اس وعدہ کا قانونی التزام نہ ہو۔

(2) مشارکہ کا معاہدہ اور مشارکہ میں بینک کا اپنا حصہ بیچنے کا معاہدہ الگ الگ ہونا چاہئے، دونوں معاہدوں کو ایک ہی معاہدے میں جمع نہ کیا جائے۔

(3) مشارکہ متناقصہ میں صدقہ کا کوئی جواز نہیں، چونکہ یہ ایک خرید و فروخت کا معاہدہ ہے لہذا اس میں بینک صارف پر کوئی جبر و زبردستی نہیں کر سکتا، البتہ اتنا ضرور کیا جا سکتا ہے کہ صارف پر یہ واضح کر دیا جائے کہ اگر وہ بینک سے اس کا حصہ نہیں خریدے گا تو بینک اپنا حصہ (Share) کسی اور کو فروخت کرنے میں آزاد ہو گا۔

آخر میں اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ہم سب کو اپنی اصلاح کرنے کی توفیق عطا فرمائے، مروجہ اسلامی بینکوں کے سرکردہ افراد کو یہ توفیق دے کہ وہ انہیں حقیقی اسلامی مالیاتی و تجارتی ادارہ بنائیں اور پوری دنیا میں سودی اقتصادی نظام کی بیخ کنی کر کے عالمی اسلامی اقتصادی نظام کے نفاذ کو ممکن بنائیں۔

والله اعلم وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد

[1] البناية في شرح الهداية 486/6

[2] بدائع الصنائع للكاساني 3163/7.

[3] المغني 4259/4 روضة الطالبين للنووي 526/3

[4] اسلامی بینکاری کی بنیادیں۔ ص 8

[5] کانفرنس اسلامی بینک دبئی 1979ء۔ مجلہ مجمع فقہ اسلامی ع 5، ج 2، ص 753

[6] اسلامی بینکاری۔ غلط فہمیوں کا ازالہ، ص 246 العقود الدرية لابن عابدين، ج/2، ص 321

[7] الفروق للقرافی،

[8] س 256 القوانين الفقهية 407

[9] المقدمات 58/2

[10] المنتقى 38/5

[11] الاستذكار 255/19

[12] التنبيهات 604/2

[13] بحوث فقهية في قضايا اقتصادية عصرية ص 96

[14] بحوث في المصارف الاسلامية، ص 253

[15] بيع المرابحة للواعد الملزم لشراء، ص 21

[16] مجلة المجمع الفقه الاسلامی، ع 5، ج 2، ص 945–989

[17] سابق مصدر

[18] سابق مصدر

[19] الترمذی: کتاب البیوع، باب ماجاء فی کراهية بيع ماليس عندک (صحيح)

[20]Murabahadocument#1,Clause1.02StateBankofPakistan

[21] اسلامی بینکاری کی بنیادیں: ص:

[22]AnIntroductionofIslamicFinance(82)

[23] المعايير الشرعية: المرابحة، رقم المعيار 6/4، ص 96

[24]Murabahadocument#1,Clause10.1StateBankofPakistan

[25] اسلام اور جدید معیشت و تجارت 144–

[26]تحریر الکلام في مسائل الالتزام، ص170-172
[27]عقود رسم المفتی، ص4
[28]صحیح بخاری: کتاب الحوالات، باب الحوالة وهل یرجع فی الحوالة
[29]سنن أبي داؤد کتاب الاقضیة، باب فی الحبس فی الدین وغیره (حسن)
[30]سنن أبي داؤد، 3628، أیضاً
[31]أحکام القرآن للجصاص ص 647
3[32]تفسیر القرطبی 67/3
[33]الاستذکار 5259/20 سنن البیهقي 350/5-351
[34]المغني لابن قدامة 354/4
[35]دراسات في أصول المداینات، ص291
[36]اسلامی بینکاری کی بنیادیں، ص108
[37]الشرق الاوسط۔ 2010/10/24
[38]IslamicBankingintheMenaRegion,SalmanSyedAli(page 18)
[39]HandbookofIslamicBankingProducts&Services(page:4)
[40]IslamicBankingBulletin,September2012,SBP(page11)
[41]الروض المربع شرح زاد المستقنع، ص318 اور حاشیة ابن عابدین 6/9–7
[42]Wikipedia,(Hire–Purchase)
[43]البیع بالتقسیط والبیوع الائتمانیّة الأخری، ص:315–317
[44]مجلة مَجْمَع الفقه الإسلامي، العدد الخامس 2599/4
[45]البیع بالتقسیط، ص:195
[46]الإجارة المنتهیة بالتملیك ص:2
[47]القانون المدَني المصري، شق نمبر 430
[48]القانون التجاري الکویتيّ، شق نمبر 140
[49]مجمع فقه الإسلامی کا فیصله نمبر) 53–2/6(
[50]شرح الخرشي علی مختصر خلیل):4/7(

[51]المغني لابن قدامة):260/4(
[52]بدائع الصنائع:6\132
[53]توی کبار علماء کمیٹی۔تاریخ فتوی(1420/10/29ھ)
[54]المغنی لابن قدامة)3/5(
[55]المعايير الشرعية)171(
[56]المعايير الشرعية(171)

(10) نقد و ادھار سودے

الشیخ مفتی حافظ محمد سلیم حفظہ اللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

نهى النبي صلى اللّٰه عليه وسلم عن بيعتين في بيعة واحدة

سنن ترمذی: کتاب البیوع، باب ماجاء فی النهي عن بيعتين فی بيعة.

یعنی "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سودوں میں ایک سودے سے منع فرمایا ہے۔"

اسی طرح مسند احمد میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"نهى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عن صفقتين في صفقة واحدة۔"

مسند احمد 1، 657/3774۔(حسن)

یعنی " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سودے میں دو سودوں سے منع فرمایا ہے"۔

ان احادیث سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ قیمت کے فرق کے ساتھ نقد و ادھار بیع جائز نہیں۔ لہٰذا ہم بتوفیق اللہ و عونہ اس حدیث کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے اس مسئلے کے حکم کو ائمہ سلف کے اقوال کی روشنی میں واضح کریں گے۔

اولاً: یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ نقد و ادھار بیع میں قیمت کا فرق شرعاً بلا کسی کراہت کے حسب ذیل وجوہ کی بناء پر جائز و حلال ہے۔

(1) شرعاً ایسی کوئی نص نہیں جس میں نقد و ادھار ایک ہی قیمت پر فروخت کرنے کا حکم دیا گیا ہو۔

(2) شرعاً نقد بیع میں منافع کو متعین (fixed) نہیں کیا گیا، تو ادھار میں نقد والے منافع کو متعین کر دینا بلا دلیل ہو گا جو کہ صحیح نہیں ہے۔

(3)رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں صحابہ کرام آپس کی تجارت میں نقد وادھار کے لئے ایک ہی قیمت رکھتے تھے اسکا صراحۃً یا اشارۃً کہیں کا ذکر ملتا ہو، راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔

ان نکات کو سمجھنے کے بعد اب ہم مذکورہ بالا روایتوں (جن کی بناء پر بعض اہل علم یہ مؤقف رکھتے ہیں کہ نقد و ادھار کا ریٹ ایک ہی ہونا چاہئے) کی صحیح توضیح ومفہوم اہل علم کے اقوال کی روشنی میں بیان کرتے ہیں، تاکہ مسئلہ سمجھنا مزید آسان ہو جائے۔ نیز اس مسئلے کی توضیح مختلف جہات سے ہدیہ قارئین ہے۔

اولا: اس روایت میں ایک ہی چیز کی بیع دو سودوں کے ساتھ یا دو شرطوں کے ساتھ منع کی جارہی ہے۔ جبکہ نقد بیچی جانے والی چیز نقد میں ایک بیع ہے اور وہ جائز ہے۔ اسی طرح ادھار بیچی جانے والی چیز ادھار میں ایک بیع ہے اور وہ بھی جائز ہے۔

بیک وقت دونوں کا ریٹ بتادیا جائے اور مشتری وہ چیز اس بات کی وضاحت کئے بغیر لے جاتا ہے کہ سودا نقد ریٹ پر ہو یا ادھار پر تو یہ بیع جہالت ثمن ہونے کے سبب منع ہے یہی اسکی توضیح متعدد علماء نے کی ہے:

(1)امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وقد فسر بعض أهل العلم، قالوا: بيعتين في بيعة، أن يقول: أبيعك هذا الثوب بنقد بعشرة، وبنسيئة بعشرين، ولا يفارقه على أحد البيعين، فإذا فارقه على أحدهما فلا بأس إذا كانت العقدة على أحد منهما۔

سنن ترمذی: 4/357،

"بعض اہل علم نے اس حدیث کی یہ وضاحت کی ہے کہ ایک سودے میں دو سودوں کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کہے کہ میں تمہیں یہ کپڑا نقد دس درہم کا اور ادھار میں بیس درہم کا بیچتا ہوں اور کسی ایک بیع کو طے نہ کرے پس جب ان دونوں میں کسی ایک بیع کو طے کر دے گا تو پھر کوئی حرج نہیں ورنہ جہالت ثمن کی وجہ سے جائز نہیں"۔

(2)یہی توجیہ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ سے منقول ہے:

إذا قلت: أبِيعك بالنقد إلى كذا، وبالنسيئة بكذا وكذا، فذهب به المشتري، فهو بالخيار في البيعين ما لم يكن وقع بيع على أحدهما، فإن وقع البيع هكذا، فهذا مكروه، وهو بيعتان في بيعة، وهو مردود، وهو الذي ينهى عنه

مصنف عبدالرزاق: 138/3

یعنی "جب تو کہے کہ میں تمہیں یہ چیز نقد میں اتنے روپے کی دیتا ہوں اور ادھار میں اتنے روپے کی اب خریدار اسے لے گیا پس وہ بااختیار ہے دونوں میں سے کسی ایک بیع کو اختیار کرنے پر۔ جب تک کسی ایک بیع پر فیصلہ نہیں ہوا ہو اگر یہ بیع اسی طرح برقرار رہے تو یہ مکروہ ہے اور یہ ایک سودے میں دو سودے کہلائیں گے۔ اور یہ مردود ہے اور اسی سے روکا گیا ہے"۔

(3) امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وتفسير ما نهي عنه من بيعتين في بيعة على وجهين: أحدهما: أن يقول: بعتك هذا الثوب نقدا بعشرة، أو نسيئة بخمسة عشر، فهذا لا يجوز؛ لأنه لا يدري أيهما الثمن الذي يختاره منهما فيقع به العقد، وإذا جهل الثمن بطل البيع

عون المعبود: 238/9

یعنی: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ایک سودے میں دو سودوں سے منع کیا ہے، اس کی دو صورتیں ہیں:
ایک یہ کہ کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے تمہیں یہ کپڑا نقد میں دس درہم کا اور ادھار میں پندرہ درہم کا بیچا۔ یہ ناجائز ہے اس لئے کہ وہ نہیں جانتا کہ ان دونوں میں سے کس قیمت کو اس نے اختیار کیا ہے، اور کس پر عقد واقع ہوا ہے۔ لہٰذا جب قیمت مجہول ہو تو بیع باطل ہے"۔

(4) یہی بات امام ابن اثیر رحمہ اللہ نے "النھایۃ" میں ذکر کی ہے۔

(5) امام شافعی رحمہ اللہ اس کا معنی تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ومن معنى نهي النبي صلى الله عليه وسلم عن بيعتين في بيعة أن يقول: أبيعك داري هذه بكذا على أن تبيعني غلامك بكذا، فإذا وجب لي غلامك وجب لك داري، وهذا يفارق عن بيع بغير ثمن معلوم، ولا يدري كل واحد منهما على ما وقعت عليه صفقته

سنن ترمذی: 358/4.

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سودے میں دو سودوں میں روکنے کا معنی یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے یہ کہے کہ میں تمہیں اپنا گھر بیچتا ہوں اتنے کا، اس شرط پر کہ تم اپنا غلام مجھے بیچ دو اتنے کا۔ اب جب آپ کا غلام میرا ہو جائے گا تو میرا گھر آپ کا ہو جائے گا۔ اور یہ بیع اس لئے ناجائز ہے کہ یہ بیع ثمن معلوم کے بغیر واقع ہوئی ہے۔ (یعنی قیمت کا علم نہیں) اور ان میں سے کوئی نہیں جانتا کس پر انکی بیع واقع ہوئی" ۔(یعنی قیمت کسی چیز کو ٹھہرایا)

(6)امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس حدیث کا مصداق ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

وفي السنن عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم أنہ قال: "من باع بیعتین في بیعۃ فلہ أوکسھما أو الربا فیہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم أنہ قال إذا تبایعتم بالعینۃ واتبعتم أذناب البقر وترکتم الجھاد في سبیل اللہ أرسل اللہ علیکم ذلا لا یرفعہ عنکم حتی ترجعوا الی دینکم وھذا کلہ في بیعۃ العینۃ وھو في بیعۃ

یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان:

"من باع بیعتین في بیعۃ۔۔۔"الخ

مجموع الفتاوی:29/432

)یعنی جو دو بیع کرتا ہے ایک بیع میں پس یا تو وہ کم قیمت لے ورنہ سود ہے(

اذا تبایعتم بالعینۃ۔۔"الخ"

سنن أبي داود: کتاب الاجارۃ، باب النھي عن العینۃ، حدیث نمبر:3462

یعنی جب تم

بیع عینہ

کرو اور گائیوں کی دموں کو پکڑلو (معنی یہ کہ زراعت کرنے لگ جاؤ گے۔) اور جہاد چھوڑ دو گے تو اللہ تم پر ایسی ذلت بھیجے گا کہ جو تم پر سے اٹھائی نہیں جائے گی حتٰی کہ تم اپنے دین کی طرف لوٹ آؤ) کے بارے میں ہے۔

اور "بیع عینۃ" کی تعریف یہ ہے کہ بیچنے والا کوئی چیز ادھار پر مہنگے داموں بیچ کر پھر خود ہی خریدار سے نقد کم قیمت پر خرید لیتا ہے۔

مثلاً زید نے عمرو کو ایک مہینہ کے ادھار پر ایک کار دو لاکھ روپے (200000) میں بیچی اور پھر خود ہی عمرو سے وہ کار نقد میں ایک لاکھ اسی ہزار (180000) میں خرید لی اس حیلہ کے ذریعے بائع کو عین اس کی چیز واپس مل گئی اسی لئے اس کو بیع عینہ کہا جاتا ہے۔

اور عمرو کو اصل میں رقم کی ضرورت تھی جو ایک بیع کو حیلہ بنا کر اس نے حاصل کر لی یہ ایک ہی چیز تھی جس کے دو سودے ہوئے لہٰذا یہ اس بنا پر ناجائز اور حرام ہے۔ نا کہ نقد اور ادھار میں قیمت کے فرق کی وجہ سے۔

بیع عینہ کی عصر حاضر میں ایک مروجہ شکل

ہمارے معاشرے میں اس کی ایک شکل جو کثرت سے رائج ہے اور عام طور پر اس پر عمل درآمد ہوتا ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک شخص رقم کی ضرورت کے پیش نظر اپنا مکان یا دوکان کسی ایسے شخص کو فروخت کر دیتا ہے جس کا مقصد بھی رقم انویسٹ کرنا ہوتا ہے اب مکان یا دوکان فروخت کرتے ہوئے وہ یہ ایگریمنٹ کرتا ہے کہ آپ ابھی مجھ سے پچیس لاکھ میں خرید لیں اور دو سال بعد مجھے ستائیس لاکھ میں فروخت کر دینا۔ مزید یہ ہے جب تک میں اس مکان یا دوکان کو فروخت کرنے کے بعد استعمال کروں گا آپ کو ماہانہ دس ہزار روپے بطور کرایہ ادا کروں گا۔ اس خرید فروخت کے معاملے کو بغور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہتی کہ یہاں تجارت ایک بہانہ اور حیلہ ہے حقیقتاً تو رقم کے عوض رقم حاصل کرنا ہے

گویا ہر ایسی تجارت جس کا مقصد کسی چیز کا فروخت نہیں بلکہ تجارت کو بنیاد بنا کر رقم پر طے شدہ منافع رقم کی صورت میں حاصل کرنا ہو تو یہی صورت

بیع عینۃ

ہے جو کہ

نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيعتين في بيعة

کے تحت حرام قرار پاتی ہے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ

نهى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عن بيعتين في بيعة

کا مصداق نقد اور ادھار کو قرار دینے والوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

وأبعد كل البعد من حمل الحديث على البيع بمائة مؤجلة وخمسين حالة وليس ههنا ربا ولا جهالة وغرر ولا قمار ولا شيء من المفاسد فإنه خيره بين أي ثمنين شاء

بحواله تهذيب السنن شرح ابو داؤد

یعنی یہ حقیقت سے بہت دور کی بات ہے جس نے بھی اس حدیث

نهى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عن بيعتين في بيعة

کو نقد وادھار بیع کی ممانعت پر محمول کیا ہے۔ یعنی ادھار ۱۰۰ میں دیتا ہے اور نقد ۵۰ میں دیتا ہے۔ اسلئے کہ اس (نقد وادھار) میں نہ سود ہے نہ قیمت کا ابہام ہے نہ دھوکہ نہ کوئی جوا اور نہ ہی کوئی خرابی، بلکہ اس میں بائع نے مشتری کو اختیار دیا ہے کہ جس قیمت پر چاہو خرید لو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ امام ابن القیم رحمہ اللہ بھی بیع عینہ ہی کو اسکا مصداق بناتے ہیں۔

نوٹ: موجودہ اسلامی بینکوں میں اجارہ کے غلط و ناجائز ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں بھی ایک بیع میں دو بیع لازم آتی ہے۔ جس طرح کہ مرابحہ، اجارہ کے بارے میں معلومات رکھنے والوں پر مخفی نہیں ہے۔][1

ثانیا: ان ائمہ کرام کی توجیہات کو ابو داؤد کی روایت نے مزید واضح کر دیا ہے۔ بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ جس بیع میں نقد وادھار میں سے کوئی ایک معاملہ طے نہ ہو سکا ہو۔ اسکا شرعا حکم کیا ہے؟ اسکو برقرار رکھا جائے یا نہیں؟

۔ حدیث ملاحظہ فرمائیے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من باع بيعتين في بيعة، فله أوكسهما أو الربا

سنن أبي داود: كتاب الاجارة، باب فيمن باع في بيعة، حديث نمبر 3461

یعنی: جس نے بیچ دیا ایک بیع کو دو سودوں کے ساتھ یا تو وہ کم قیمت لے ورنہ وہ سود ہو گا۔

الحديث يفسر بعضه بعضا

بعض روایت بعض کی وضاحت کرتی ہیں کے اصول کے تحت، اس روایت پر غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مذکورہ روایت کو صرف نقد وادھار کے ساتھ خاص نہیں کیا جا سکتا کیونکہ روایت میں لفظ بیعتین

یعنی دو سودے کرنے کا ذکر ہے۔ جو تمام صورتوں کو شامل ہے جن کا ابھی مختلف فقہاء محدثین کے حوالے سے ذکر ہوا۔ لہٰذا حدیث کو صرف نقد وادھار سے مقید و مخصوص کرنا محتاج دلیل ہے۔

مذکورہ روایت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نقد وادھار بیع جائز ہے۔ نیز اگر کسی ایک بیع کو طے نہ کیا گیا ہو اور اب بیع کو برقرار رکھا جائے تو کم قیمت پر برقرار رکھا جائے۔ مثلا ایک شخص اگر یہ کہتا ہے کہ میں یہ چیز نقد میں تمہیں 10 روپے میں بیچتا ہوں اور اگر ادھار میں لو گے تو 15 روپے کی۔ اب ان میں سے کوئی ایک بیع طے نہ ہوئی ہو تو بیع جہالت ثمن کی وجہ مردود ہو گی اور اگر بیع کو برقرار رکھنا ہے تو کم قیمت پر یعنی 10 روپے پر بیع ہو گی، 15 روپے کا مطالبہ سود ہو گا۔

ثالثا: نقد وادھار بیع کے فرق کو بیع سلم کی روشنی میں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ بیع سلم کا جواز بھی اس امر کی دلیل ہے کہ نقد وادھار بیع میں قیمت کا فرق جائز ہے۔

صحیح مسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: " اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینے تشریف لائے تو مدینہ کے رہائشی پھلوں کی ایک سال یا دو سال کی پیشگی بیع کیا کرتے تھے۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من أسلف في تمر فليسلف في كيل معلوم ووزن معلوم الى اجل معلوم۔

صحیح مسلم: کتاب المساقاۃ، باب السلم، حدیث نمبر: 1604

"جو شخص کھجوروں میں پیشگی بیع کرے اسے چاہئے کہ وہ ادھار بیع کرلے (یعنی قیمت پہلے ہی ادا کردے) ان شروط کے ساتھ۔ اسکا ماپ تول وزن معلوم ہونا چاہئے۔ اسکی ادائیگی کی مدت معلوم ہونی چاہیئے یعنی وہ چیز مشتری کو کب ملے گی"۔

روایت پر غور کرنے سے واضح ہوا کہ ایک چیز کی کوالٹی، اسکی مقدار اور اسکے قبضہ کا وقت معلوم ہونے کے بعد اسکی پیشگی قیمت ادا کی جاسکتی ہے اور بائع وقت معین پر وہ چیز مشتری کو دینے کا پابند ہوگا۔

واضح رہے کہ بیع سلم کا تعلق زراعت سے مخصوص ہے، مطلقاً کسی بھی چیز کی بیع سے نہیں۔

اب جو شخص قبل از وقت بیع کر رہا ہے کیا وہ بائع کو وہ ریٹ دیگا جو اس وقت مارکیٹ میں ہوگا یا وہ پیشگی رقم دینے میں اپنا فائدہ بھی دیکھے گا یقیناً بائع کو جس وقت چیز تیار ہو کر مارکیٹ میں آئیگی اور اسکا جو ریٹ ہوگا وہ ریٹ سال بھر پہلے یا چھ ماہ قبل رقم لینے کی صورت میں اسے نہیں ملے گا تو جب یہاں مشتری کو فائدہ ہو رہا ہے۔ تو ادھار میں زیادہ قیمت کے سبب سے بائع کو فائدہ ہو رہا ہے اور تجارت اسی چیز کا نام ہے۔ لہٰذا دونوں ہی شرعاً جائز و حلال ہیں

۔

رابعا: نقد وادھار بیع کے فرق کے جواز کو مؤطا امام مالک میں مذکور اس واقعہ کی روشنی میں بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ کہ:

عن عبيد أبي صالح مولى السفاح أنه قال: "بعت بزاً لي من أهل دار نخلة إلى أجل، ثم أردت الخروج إلى الكوفة فعرضوا علي أن أضع عنهم بعض الثمن، وينقدوني فسألت عن ذلك زيد بن ثابت فقال: "لا آمرك أن تأكل هذا ولا تؤكله

موطاامام مالک: کتاب البیوع، باب ماجاء فی الربا فی الدین

یعنی: عبید ابو صالح (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے کپڑا دار نخلہ (جو مکہ اور طائف کے درمیان مقام ہے) والوں کے ہاتھ بیچا ایک معین مدت کے وعدے پر جب میں کوفہ جانے لگا تو ان لوگوں نے کہا اگر تم کچھ کم رقم کر دو تو تمہارا روپیہ ہم ابھی دے دیتے ہیں تو (ابو صالح) نے یہ مسئلہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے معلوم کیا۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہیں اس روپئے کے کھانے اور کھلانے کی اجازت نہیں دیتا۔ (سود کا شائبہ ہونے کے سبب)

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جو عبید ابو صالح کو جو مسئلہ بتاتے ہیں وہ بالکل واضح ہے۔ یعنی ایک ادھار رقم پر سود اطے ہونے کے بعد اب فوری نقد ادائیگی کی صورت میں کچھ رقم کی کمی کا مطالبہ تو رقم سے رقم کو خریدنا ہے اور اس میں سود کا شائبہ ہے۔ اس لئے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اسے کھانے اور کھلانے سے منع کیا۔

اس اثر کو نقد و ادھار کی بحث میں ذکر کرنے کی غرض یہ ہے کہ مذکورہ واقعہ سے اتنی بات تو بداھۃً واضح ہوئی۔ کہ جب دار نخلہ والوں نے نقد ادائیگی پر ابو صالح عبید سے رقم کی کمی کا مطالبہ کیا تو انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ نقد و ادھار میں شرعاً قیمت میں فرق نہیں ہوتا لہٰذا میں نے نقد والی قیمت ہی تو رکھی تھی۔ اور نہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس سائل ابو صالح سے فرمایا کہ نقد و ادھار میں قیمت کا فرق ہی نہیں ہوتا لہٰذا ان مطالبہ کرنے والوں سے کہہ سکتے ہو کہ میں نے تو تمہیں نقد والی قیمت میں چیزیں فروخت کی ہیں۔

مزید کئی مثالیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نقد و ادھار بیع کی کتب احادیث سے دکھائی جا سکتی ہیں۔ لیکن کہیں بھی یہ صراحت نہیں ملتی کہ وہ مطلقاً ادھار بیع میں بھی وہی قیمت رکھتے تھے جو نقد میں ہوتی تھی۔

نقد و ادھار بیع کی قیمت میں فرق اور سلف کا مؤقف

*علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

و قالت الشافعیۃ و الحنفیۃ و زید بن علی و المؤید باللّٰہ و الجمھور أنہ یجوز

نیل الاوطار: 201/8

یعنی: شوافع، احناف، زید بن علی، مؤید باللہ اور جمہور کا یہی مؤقف ہے۔

*اسی طرح مولانا عبد الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ کا بھی یہی مؤقف ہے۔[2]

*مولانا شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ کا بھی یہی مؤقف ہے۔[3]*سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ بھی اسکے قائل ہیں۔]4[

*نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ کا بھی یہی مؤقف ہے۔]5[

*مولانا عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ کا بھی یہی مؤقف ہے۔]6[

*اسی طرح شیخ ابن باز رحمہ اللہ سابق مفتی سعودی عرب بھی اسکے جواز کے قائل تھے۔]7[

*شاہ ولی اللہ کا بھی یہی مؤقف ہے] 8[

*مولانا عبدالحئی لکھنوی کا بھی یہی مؤقف ہے۔]9[

* شاہ عبدالعزیز کا بھی یہی مؤقف ہے۔]10[

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ:

(1)نقد وادھار بیع میں قیمت کا فرق جائز ہے۔

(2)اگر نقد وادھار بیع میں سے کوئی ایک بیع طے نہ ہو تو وہ جہالت ثمن کی وجہ سے ناجائز ہے.

اگر ایسی بیع (جس میں نقد وادھار بیع میں سے کوئی ایک بیع طے نہ ہو اور مشتری چیز لے کر چلا جائے) کو برقرار رکھا گیا تو پھر دونوں قیمتوں میں سے کم قیمت متعین ہو جائیگی۔

وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

[1] تفصیل کے لئے البیان کی اسی اشاعت خصوصی میں شائع تحریر بعنوان: ”مروجہ اسلامی بینکوں کے ذرائع تمویل کی شرعی حیثیت“ از: عثمان صفدر، صفحہ نمبر 137

[2]تحفۃ الأحوذی: باب ماجاء فی النھی عن بیعتین فی بیعۃ، حدیث نمبر:1231

3 [3] عون المعبود: کتاب الاجارۃ، باب فیمن باع بیعتین فی بیعۃ، حدیث نمبر 3458

[4]تاویٰ نذیریہ:2/162

[5]روضۃ الندیہ:2/89،

[6] فتاویٰ اہلحدیث:2/263،

[7] فتاوی اسلامیہ:2/442

[8]المسوی شرح مؤطا: باب ماجاء فی الربا فی الدین

[9] مجموع الفتاوی فارسی
[10] فتاوی عزیزیہ

(11) بیع سلم کی مروّجہ صورتیں اور ان کا شرعی حکم

الشیخ عبدالوکیل ناصر حفظہ اللہ

جائز کاروباری معاملات میں سے ایک صورت بیع السلم (بیع السلف) کی بھی ہوتی ہے درج ذیل سطور میں ہم بالکل عام فہم انداز میں بیع السلم، اس کی تعریف، حکم اور شرائط کو تفصیل کے ساتھ بیان کر رہے ہیں۔ وباللہ التوفیق

بیعِ سلم کی تعریف

کتبِ فقہ:

نیل الاوطار، الفقہ السلامي وأدلتہ اور الملخص الفقھی

وغیرہ میں بیع السلم کی تعریف کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ:

"لین دین کا وہ معاملہ کہ جس میں فروخت کنندہ یہ ذمہ داری قبول کرے کہ وہ مستقبل کی فلاں تاریخ پر خریدار کو ان ان متعین صفات کی حامل چیز مہیا کرے گا اور خریدار مطلوبہ شئے کی مکمل قیمت پیشگی (Advance) اُسی مجلسِ عقد میں ادا کرے۔"

مزید آسان الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ "مخصوص صفات کی حامل چیز خریدنے کا معاملہ طے کر کے قیمت مکمل طور سے پہلے فوری ادا کر دینا اور چیز بعد میں یا کچھ تاخیر سے حاصل کرنا، بیع السلم یا بیع السلف کہلاتا ہے۔"

بیعِ سلم کا حکم

یہ معاملات کی ایسی قسم ہے کہ جو کتاب وسنت اور اجماع امت کی رو سے جائز ہے۔

قرآن کریم سے ثبوت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾

البقرۃ: 282

ترجمہ: "اے ایمان والو! جب تم آپس میں مقررہ وقت تک ادھار کا معاملہ کیا کرو تو اس کو لکھ لیا کرو"۔

مفسر قرآن، حبر امت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ''میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ مقررہ مدت تک ضمانت دی گئی ''بیع السلف'' کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جائز قرار دیا ہے اور اس کی اجازت دی ہے، اور پھر انہوں نے بطور دلیل کے مذکورہ آیت پڑھی۔] "1[

سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں بیع کا یہ سلسلہ اپنے حساب سے موجود تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کچھ اصلاحات کے ساتھ باقی رکھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص بیع السلف (بیع السلم) کرنا چاہتا ہے وہ معلوم وزن، معلوم و متعین پیمانے اور معلوم و متعین مدت کے ساتھ کرے۔''[2] یہ حدیث بیع السلم کے جواز کی دلیل ہے، مزید تفصیل کتب ستہ وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اجماعِ امت سے ثبوت

امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے اس کے جواز پر اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے۔]3[

لوگوں کی حاجت و ضرورت بھی اس کی متقاضی ہے کہ یہ بیع جائز ہو، کیونکہ اس میں فریقین میں سے ہر ایک فائدہ اٹھاتا ہے، فروخت کنندہ جلد و فوری رقم وصول کر کے اور خریدار (فوری ادائیگی کی وجہ سے) چیز سستی حاصل کر کے۔] 4[

حافظ ذوالفقار علی حفظہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

سلم کی اجازت کا فلسفہ

بعض کسانوں اور مینو فیکچررز کے پاس ضرورت کے مطابق مثلاً بیج، کھاد، آلات، خام مال خریدنے اور لیبر وغیرہ کے لئے رقم نہیں ہوتی، ایسے لوگوں کو اسلام نے یہ سہولت دی ہے کہ وہ حصول رقم کی خاطر اپنی فصل یا پیداوار قبل از وقت فروخت کر سکتے ہیں تاکہ قرض کے لئے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچے رہیں۔ اضافی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی چیز بیچنے کے لئے کسٹمر تلاش کرنے کی فکر سے آزاد ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا سودا پہلے ہی ہو چکا ہوتا ہے۔

اس سے خریدار کو بھی فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ سلم میں قیمت ان چیزوں کی نقد قیمت سے کم ہوتی ہے جو نقد ادا کی جاتی ہو، مزید برآں اگر چیز آگے بیچنا چاہتا ہو تو مارکیٹنگ کیلئے مناسب وقت بھی اسے مل جاتا ہے۔] 5[

محقق العصر الشیخ مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ امام ابن قیم رحمہ اللہ سے بیع سلم کی رخصت میں حکمت تحریر فرماتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں:

اسلام نے جب اس بیع کو جائز قرار دیا ہے تو اسے سود نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ تو ایک اسلامی تدبیر ہے، جس کی وجہ سے انسان سود پر قرض لینے سے بچ سکتا ہے۔ لوگ اس کو اپنا لیں تو سود پر قرض لینے سے مسلمانوں کی جان چھوٹ سکتی ہے۔][6

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بیع السلم بیعِ معدوم ہے اور خلافِ قیاس ہے، لہٰذا یہ جائز نہیں۔

اس حوالہ سے ہم معروف محقق الشیخ مبشر احمد ربانی اور پھر امام ابن قیم رحمہ اللہ کے جوابات تحریر کریں گے۔

شیخ مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

"معدوم (غیر موجود) کی بیع جائز ہے۔ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت صحیحہ میں یا کسی صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی ممانعت وارد نہیں ہوئی۔ ہاں جس طرح بعض موجودہ اشیاء کی بیع حرام ہے، اسی طرح بعض معین معدوم چیزوں کی بیع سے روکا گیا ہے۔

حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو لفظ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

پھر شیخ نے بیعِ سلم کی تعریف اور اس کے جواز کے دلائل لکھنے کے بعد فرمایا:

"لاتبع مالیس عندک"

"جو تیرے پاس نہیں اس کی بیع نہ کر] "7[

اللہ کے رسول اصلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کسی معین چیز کے بارے میں ہے، جیسا کہ امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ھذا بیوع الاعیان دون بیوع الصفات"

کہ یہ ممانعت معین چیزوں کی بیع میں ہے صفات کی بیع میں نہیں یعنی جس میں عدم (نہ ہونے) کی صفت پائی جائے، اس کے لئے نہیں۔] 8[

یا پھر اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز فروخت نہ کر جس کے دینے پر قدرت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔] 9[

پھر شیخ نے بیعِ سلم کی تعریف اور اس کے جواز کے دلائل لکھنے کے بعد فرمایا:

”خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے ایسی چیز کی بیع کی اجازت دی ہے جو معدوم ہو جبکہ اس کے اوصاف وزن اور مدت وغیرہ معلوم ہو جائیں اور اس میں کسی قسم کی جہالت باقی نہ رہے“۔[10]

امام ابن قیم رحمہ اللہ بیعِ سلم کے خلافِ قیاس یا بیعِ معدوم ہونے کے اعتراض کے حوالہ سے جواباً فرماتے ہیں:

بعض حضرات بیع سلم کو خلافِ قیاس کہتے ہیں، ان کے پاس دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا” جو چیز تمہارے پاس نہیں ہے اسے مت بیچو“[11] پس بیعِ سلم بھی معدوم ہے لہٰذا وہ ناجائز ہونی چاہیے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں کیونکہ بیعِ سلم میں جس چیز کا سودا ہوتا ہے وہ (اپنی صفات کے اعتبار سے واضح و) ظاہر ہوتی ہے، فروخت کنندہ کے ذمہ ہوتی ہے، اور اُسے عموماً سونپے جانے پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔

اور یہ تو بالکل ایسی ہی صورت ہے جیسے نفع کے عوض مزدوری کرنا۔ اور اس صورت کا مطابقِ قیاس ہونا ہم زبردست دلائل سے ثابت کر چکے ہیں۔ لہٰذا بیع معدوم پر اس کا قیاس غلط ہے۔

بیعِ معدوم میں تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اسے حاصل کرنے پر قدرت ہو گی بھی یا نہیں۔ اس میں فروخت کنندہ اور خریدار دونوں ہی دھوکہ میں رہتے ہیں پھر اس پر اس کے مخالف چیز کو قیاس کرنا یہی تو بدترین قیاس ہے، ظاہری بھی اور باطنی بھی، صورۃً بھی اور معناً بھی، کسی طرح بھی یہ قیاس کسی عقلمند کے نزدیک تھوڑی دیر کیلئے بھی صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ کہاں وہ (بیعِ معدوم کہ) جو نہ پاس ہو، نہ ملکیت میں ہو اور نہ ہی اُسے سونپنے پر قدرت و طاقت حاصل ہو اور کہاں وہ (بیعِ سلف کہ) جو فروخت کنندہ کے ذمے ہو، خریدار کو مل سکتی ہو، اور جسے سونپے جانے پر قدرت وطاقت حاصل ہو۔

اب ان دونوں کو جمع کر دینا ایسے ہی ہے جیسے مردار اور ذبیحہ کو ایک کہنا، جیسے سود اور تجارت کو ایک سمجھنا۔

اور جو حدیث (بیعِ سلم کے عدمِ جواز کے لئے) پیش کی گئی ہے اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سیدنا حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا ”کہ جو تمہارے پاس نہیں اُسے مت بیچو“[12]

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ: کوئی شخص کسی معین چیز کو جو اس کے پاس نہ ہو بلکہ دوسرے کی ملکیت میں ہو، وہ اُسے کسی کو بیچ دے پھر اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا پھرے اور اسے خریدار تک پہنچانے کی سعی میں رہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ :وہ اس چیز کو بیچنے کی کوشش کرتا ہے جسے خریدار تک پہنچانے کی قدرت وطاقت اسے نہیں۔ گووہ ایسی ذمہ داری اٹھالیتا ہے کہ جس کے بارے میں اُسے معلوم نہیں کہ وہ اُسے ادا کر بھی پائے گا کہ نہیں۔

اس طرح اس میں کئی ایک خرابیاں لازم آتی ہیں:

(1) ایک ایسی معین چیز کا بیچنا جو اس کی ملکیت میں نہیں۔

(2)ایسا معاملہ اپنے ذمہ لینا جسے پورا کرنے کی طاقت نہیں۔

(3)ایسی چیز کا ادھار کرنا جس کے ملنے کی عادتاً توقع نہیں۔

(اور جہاں تک بیعِ سلم کا تعلق ہے تو)جب مذکورہ تینوں خرابیاں نہ ہوں تو بیشک اور قرضوں کی طرح یہ بھی ایک طرح کا قرض ہوگا۔ جیسے کوئی چیز مؤخر قیمت پر قرضاً لے لی جائے۔

پس قیاس و مصلحت کا تقاضہ یہی ہے کہ ادھار کی خرید وفروخت جائز ہو۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے: ''ایمان والو!جب تم قرض کا لین دین کرو جس میں مدت مقرر کی گئی ہو تو لکھت پڑھت کر لیا کرو''[البقرۃ: 282]

یہ آیت قیمت اور مال دونوں کو شامل ہے(یعنی دونوں میں ادھار جائز ہے) سیدنا عبداللہ بن عباس جو قرآن کریم کے ترجمان ہیں انہوں نے اس سے یہی سمجھا اور سمجھایا ہے جیسا کہ وہ فرماتے ہیں کہ :اپنی ذمہ داری پر قرض حلال ہے۔ پھر آپ رضی اللہ عنہما نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ پس ادھار کی خرید وفروخت قیاس کے مطابق اور مصلحت کے موافق ہے۔ شریعت جو مکمل ہے اور مکمل انصاف پر مبنی ہے وہ اسے کبھی ناجائز نہیں کر سکتی۔(بیعِ سلم میں) مکمل قیمت تو اسی وقت لے لی جاتی ہے اور چیز بعد میں دی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اگر قیمت بھی نہیں لی جائے تو ذمہ داری بے فائدہ ہو گئی اسی کا نام سلم رکھا گیا ہے(یعنی ایسی بیع کہ جس میں)قیمت ہاتھوں ہاتھ سونپ دی جاتی ہے،اور اگر قیمت اور چیز دونوں ہی ادھار ہوں تو یہ

''بیع الکالی بالکالی''

'' یعنی ادھار کے بدلے ادھار کی بیع'' ہو جائے گی جو حدیث کی رو سے ناجائز ہے اور جس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اس میں خطرے بڑھ جائیں گے اور معاملہ غرر ودھوکے کا ہو جائے گا۔

اسی لئے شارع علیہ السلام نے اس مسئلہ میں مخصوص باغ یا کھیتی کے پھل واناج کو منع فرمادیا۔اس لئے کہ ممکن ہے اس میں پھل نہ آئے اور نہ اناج نکلے تو دے گا کہاں سے ؟؟

اور پھر ابن قیّم رحمہ اللہ تھوڑا آگے چل کے فرماتے ہیں:

اس (بیعِ سلم) کا جواز انسانی حاجت کو پورا کرنے کے لئے ہے اس میں (خریدار و فروخت کنندہ) دونوں کے لئے سہولت ہے۔ایک کو قیمت پہلے مل جاتی ہے اور دوسرے کو چیز سستی مل جاتی ہے۔

پس سچ تو یہ ہے کہ شریعت میں جو ہے اسی میں آسانی ہے،اسی میں مصلحت ہے،وہی مطابق قیاس ہے۔وہی عقل سے بھی ملتا ہے۔۔۔۔]13[

بیعِ سلم کی شرائط

بیع سلم میں ان تمام شروط و پابندیوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے جو شریعت نے عام بیع میں مقرر کی ہیں۔البتہ سلم کو غرر (جہالت و دھوکہ) سے صاف رکھنے کے لئے کچھ خاص شرائط بھی رکھی گئی ہیں جو درج ذیل ہیں:

رأس المال (قیمت) سے متعلقہ شرائط یہ ہیں:

(1)اس کی جنس معلوم ہو۔

جیسے سونے چاندی میں ہے،روپیہ میں ہے،ڈالر میں ہے یا کسی اور صورت میں۔

(2)اس کی مقدار معلوم ہو۔

(3)اسے مکمل طور سے مجلس عقد میں ہی ادا کر دیا جائے۔

مسئلہ :بیعِ سلم میں قیمت مؤخر کرنے کا حکم ؟

جمہور اہل علم مالکیہ،شافعیہ اور حنفیہ کے مطابق بیعِ سلم میں خریدی گئی چیز کی مکمل قیمت پیشگی مجلس عقد ہی میں ادا کرنا شرط ہے،اُسے مؤخر نہیں کیا جا سکتا اور اگر مکمل قیمت کی ادائیگی سے قبل دونوں فریق یعنی فروخت کنندہ و خریدار الگ الگ ہو جائیں تو عقد باطل قرار پائے گا کیونکہ اس طرح یہ ادھار کی ادھار کے ساتھ بیع ہو جائیگی جو کہ حدیث کی رو سے حرام ہے[14]،البتہ مالکی فقہاء کے مطابق اس میں دو سے تین دن تک کی تاخیر کی اجازت ہے،کیونکہ یہ معمولی تاخیر ہے جو قابل برداشت ہے لیکن اگر معاہدہ میں مکمل قیمت کی ادائیگی کی مدت تین دن سے زیادہ طے ہو تو مالکیہ کے مطابق بھی عقد باطل ہو جائے گا۔

تاخیر سے ملنے والی شئے،سامان (مسلم فیہ) کی شرائط یہ ہیں:

(1)وہ ضمانت کے تحت ہو۔(فروخت کنندہ اسے حوالہ کرنے کا ضامن ہو)

(2)اس کا ایسا مکمل وصف بیان کر دیا جائے کہ جس سے اس کی مقدار ووزن اور ممتاز صفات کا علم ہو جائے تاکہ کسی بھی قسم کے دھوکہ وتنازع کا خدشہ باقی نہ رہے۔

(3)اس کی مدت معلوم ہو کہ کب تک وہ چیز خریدار کے حوالہ کر دی جائیگی۔]15[

بعض اہل علم نے شرائط کو کچھ مزید پھیلا کر اور کھول کر بیان کیا ہے، جس سے مجموعی طور پر کبھی تو سات شرائط دکھائی دیتی ہیں جیسا کہ ''المخلص الفقہی''میں شیخ صالح بن فوزان حفظہ اللہ نے لکھا ہے اور کبھی شرائط اس تعداد سے بھی آگے نظر آتی ہیں جیسا کہ شیخ وہبہ زحیلی رحمہ اللہ نے ''الفقہ الاسلامی'' میں گیارہ تک شرائط ذکر کی ہیں۔

اس سلسلہ میں قارئین کی مزید وضاحت کے لئے اپنے وقت کے معروف ومعتبر اہل علم کی لکھی جانے والی حواشی، تعلیقات، تشریحات، فتاویٰ جات اور آراء تحریر کی جاتی ہیں تاکہ مسئلہ سلم، اس کی شرائط کا فہم اور بھی سہل ہو جائے اور دیگر متعلقہ مسائل کی مکمل وضاحت ہو جائے۔

مجتہد العصر حافظ عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں لکھا ہے:

بیع سلم کے جائز ہونے کی شرطیں حسب ذیل ہیں

(1)مبیع (سامان) کی جنس معلوم ہو مثلاً کہ وہ گیہوں ہے یا جو، مکئی یا باجرہ۔

(2)اس کی صفت معلوم ہو کہ وہ جید یعنی کھری ہے یا ردی۔

(3)اس کی نوع معلوم ہو مثلاً بارانی زمین کی ہے یا نہری زمین کی۔

(4)وقت ادائیگی معلوم ہو جو کم از کم ایک مہینہ ہے اور اس سے زائد وقت جو وہ مقرر کرے وہ بھی معلوم ہو۔

)کم از کم ایک مہینہ کی شرط کی وضاحت آگے آرہی ہے(

(5)جو چیز فروخت کی جارہی ہے اس کی مقدار معلوم ہو۔

(6)سرمایہ جو کہ اب دیا جارہا ہے جس کے بدلے مقررہ وقت پر سامان وصول کرنا ہے اگر یہ سرمایہ (قیمت) تولنے یا ماپنے یا گننے کی چیز ہو تو اس کا معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔

(7)اگر فروخت کردہ سامان ایسی چیز ہے جس کے اٹھانے میں مشقت اور کرایہ خرچ ہوتا ہو تو جس جگہ سے وصول کرنا ہے اس کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے۔

بطور تصدیق ووضاحت کے حافظ محمد عبداللہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

جوابات صحیح ہیں..... بازاری نرخ سے اتنا کم مقرر نہ کیا جائے کہ سال میں کبھی بھی اتنا کم ہونے کا خیال نہ ہو، اگر ایسا ہو تو اس میں بھی سود کا شبہ ہے، نیز یہ بھی شرط ہے کہ غلہ کے بدلے غلہ نہ ہو کیونکہ حدیث میں اس کو سود کہا گیا ہے اور مدت کم از کم ایک ماہ شرط نہیں کیونکہ حدیث میں اس کا ثبوت نہیں۔][16

شیخ الحدیث علامہ داؤد راز دھلوی رحمہ اللہ، صحیح بخاری کی مختصر تشریح، ترجمہ وفوائد کے ضمن میں کچھ نکات علمیہ تحریر فرماتے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

جو چیزیں ماپ تول کر بیچی جاتی ہیں ان میں ماپ تول ٹھہرا کر سلم کرنا چاہئے۔ اگر ماپ تول مقرر نہ کئے جائیں تو یہ بیع سلم جائز نہ ہوگی الغرض اس بیع کے لئے ضروری ہے کہ وزن مقرر ہو اور مدت مقرر ہو ورنہ بہت سے مفاسد کا خطرہ ہے۔ مثلاً سو روپے کا اتنے وزن کا غلہ آج سے پورے تین ماہ بعد تم سے وصول کرلوں گا یہ طے کر کے خریدار نے سو روپیہ اسی وقت ادا کر دیا۔ یہ بیع سلم ہے جو جائز ہے۔ اب مدت پوری ہونے پر وزن مقررہ کا غلہ اسے خریدار کو ادا کرنا ہوگا۔

کیل اور وزن سے ماپ تول مراد ہیں۔ اس میں جس چیز سے وزن کرنا ہے، (وہ) کلو (ہے) یا قدیم سیر، من۔ یہ بھی جملہ باتیں طے ہونی ضروری ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ " اس امر پر اجماع ہے کہ بیع سلم میں جو چیزیں ماپ یا وزن کے قابل ہیں ان کا وزن مقرر ہونا ضروری ہے اور جو چیزیں محض عدد سے تعلق رکھتی ہیں ان کی تعداد کا مقرر ہونا ضروری ہے۔ حدیث مذکورہ سے معلوم ہوا کہ مدینہ میں اس قسم کے لین دین کا عام رواج تھا"۔][17

دیار عرب کے معروف عالم دین شیخ ابو بکر الجزائری حفظہ اللہ اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

میعاد ادائیگی اتنی ہو کہ اس مدت میں قیمت کا اتار چڑھاؤ ہو سکتا ہو مثلاً ایک ماہ یا دو ماہ اس لئے کہ دو چار دن کی مدت کا حکم عام "بیع" والا ہے اور بیع میں یہ شرط ہے کہ مبیع کو اچھی طرح دیکھ لے یا اس کی معرفت حاصل کرلے۔

وقت ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ اس وقت مطلوبہ جنس کا پایا جانا ممکن ہو لہٰذا بہار کے موسم کو تازہ کھجور کی ادائیگی کا وقت یا سردیوں میں انگور کی ادائیگی کا وقت مقرر نہ کیا جائے، اس لئے اس صورت میں مسلمانوں میں اختلاف واقع ہوگا۔][18

بیع سلم سے متعلق اہم مسائل

(1) کیا مدت کا تعین شرط ہے؟

اگرچہ علماء نے مدت معینہ کے تقرر کو شرط قرار دیا ہے مگر شافعیہ کہتے ہیں کہ جب بیع سلم تاخیر سے (جس میں دھوکہ بھی ہو سکتا ہے) جائز ہے تو معاہدہ کے وقت ادائیگی بالاولیٰ جائز ہے، حدیث میں اجل (مدت) کا ذکر اس لئے نہیں کہ صرف یہی شرط ہے (یا اس کا موجود ہونا ہر حال میں ضروری ہے) بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ جب کوئی معاملہ اجل (مدت) سے متعلق ہو تو اس میں وہ معلوم ہونی چاہئے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

صحیح اور حق بات یہی ہے جسے شافعیہ نے اختیار کیا ہے کیونکہ کسی بھی حکم کو بغیر دلیل کے لازم کر لینا درست نہیں۔[19]

(2) مدّتِ مقررہ تک مال ادا نہ کیا گیا۔

معروف عالم شیخ عبدالستار حماد صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

"اگر اس (طے شدہ) مدت میں مال مہیا نہ کیا جائے تو تاجروں کے عرف میں اسے جرمانہ تو کیا جا سکتا ہے، لیکن ریٹ وغیرہ میں کمی کرنے کا دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا، (کیونکہ) اس (بیعِ سلم) میں رقم پیشگی ہی ادا کرنا پڑتی ہے، بصورت دیگر طرفین سے ادھار ہو گا جو شرعاً درست نہیں ہے۔] "[20

" (3) معاہدہ بیعِ سلم" میں ادائیگی کی جگہ کا تعین نہیں کیا گیا ہو تو؟

الشیخ ابو بکر الجزائری حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

اگر "معاہدہ بیع" میں ادائیگی کی جگہ کا تعین نہیں کیا گیا تو "مقام معاہدہ" ہی ادائیگی کی جگہ طے پائے گا۔ اگر جگہ کا تعین کیا گیا ہے تو اس پر عمل کیا جائے گا اور اس بارے میں جس جگہ ادائیگی پر دونوں متفق ہوں، اس کے مطابق عمل کیا جائے گا اس لئے کہ مسلمان معاملات میں جو شرطیں طے کر لیں ان کی پابندی ضروری ہے۔[21]

(4) کیا مسلم فیہ (طے شدہ چیز) کا مسلم الیہ (جسے قیمت دی گئی یعنی فروخت کنندہ) کے پاس ہونا ضروری ہے؟

اس سلسلے میں معلوم ہو کہ یہ شرط تو بہر حال نہیں ہے، البتہ انتہائے مدت تک اس کا دستیاب ہونا ضروری ہے۔ صحیح بخاری شریف میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ لوگوں نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ

(بیعِ سلم کے وقت) کیاان لوگوں کے پاس کھیتی موجود ہوتی تھی؟ توانہوں نے کہاکہ ہم ان سے اس کے متعلق پوچھتے نہیں تھے۔

جس سے یہ بات واضح ہے کہ مطلوبہ چیز کافروخت کنندہ کے پاس ہوناشرط نہیں ہے وگرنہ اُس چیز کااگر فروخت کنندہ کے پاس ہوناضروری ہوتاتووہ اُس کاسوال ضرور کرتے۔

علامہ محدث داؤدرازدھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سلم ہر شخص سے کرنادرست ہے۔ مسلم فیہ (یعنی وہ سامان جس میں سلم کیاگیاہے) یااس کی اصل اس کے پاس موجود ہو یانہ ہواتناضرور معلوم ہوناچاہئے کہ معاملہ کرنے والااداکرنے اور وقت پر بازار سے خرید کر یااپنی کھیتی یامزدوری وغیرہ سے حاصل کرکے اس کے اداکرنے کی قدرت رکھتاہے یانہیں۔]22[

(5) تمام اجناس میں بیع سلم جائزہے۔

جیساکہ صحیح بخاری میں موجود یہ الفاظ اس بات کے مؤید ہیں ''من أسلف فی شیء...'' جو کسی بھی چیز میں سلف (سلم) کامعاملہ کرے۔

یہاں ''فی شیء'' کہاگیاجو تمام جائزاشیاء کو شامل ہے۔البتہ شرائط ضرور ملحوظ رکھی جائیں۔

(6) قلاش آدمی اور بیعِ سلم۔

علامہ محدّث داؤدرازدھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اگر کوئی شخص قلاش محض ہواور وہ بیع سلم کررہاہو تو معلوم ہوتاہے کہ وہ اس دھوکہ سے اپنے مسلمان بھائی کاپیسہ ہڑپ کرناچاہتاہے اور آج کل عام طور پر ایساہوتارہتاہے (لہٰذا سلم کے وقت اس کادھیان بھی رکھنا چاہئے)۔]23[

(7) مخصوص باغ یازمین کے مخصوص قطعہ کی پیداوار میں بیع سلم کرنے کا حکم۔

مخصوص باغ یازمین کے مخصوص قطعہ کی پیداوار میں بیع سلم کرناجائز نہیں، کیونکہ اس میں غرر پایاجاتاہے، ممکن ہے وہ باغ پھل نہ دے یاقطعہ زمین میں فصل ہی نہ ہو۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص باغ کی کھجور میں بیع سلم نہیں کی۔

علامہ ابن المنذر رحمہ اللہ نے اس بات پر اجماع ذکر کیاہے کہ متعین باغ وزمین کی پیداوار میں سلم کی ممانعت پر علماء متفق ہیں۔]24[

جواز کی استثنائی صورت

علامہ داؤد راز دھلوی رحمہ اللہ

"باب الکفیل فی السلم"

کے تحت وارد ہونے والی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اگر کسی خاص کھیت کے غلہ میں یا کسی خاص درخت کے میوہ میں سلم کرے اور ابھی وہ غلہ یا میوہ تیار نہ ہوا ہو تو یہ سلم درست نہ ہو گی۔ لیکن تیار ہونے کے بعد خاص کھیت اور خاص پیداوار میں بھی سلم کرنا درست ہے۔ اس (ممانعت) کی وجہ یہ ہے کہ جب تک غلہ یا میوہ پختگی پر نہ آیا ہو اس کا کوئی بھروسہ نہیں ہو سکتا کہ غلہ یا میوہ اگے گا یا نہیں؟۔ احتمال ہے کہ کسی آفت ارضی یا سماوی سے یہ غلہ اور میوہ تباہ ہو جائے پھر دونوں میں جھگڑا ہو۔][25

(8) شیئرز کے سودوں میں بیعِ سلم جائز نہیں

حافظ ذوالفقار علی حفظہ اللہ رقمطراز ہیں:

شیئرز کے سودوں میں چونکہ کمپنی کا نام ذکر کرنا ضروری ہوتا ہے جس سے اس کی حیثیت متعین چیز میں سلم کی ہو جاتی ہے جو ناجائز ہے، ممکن ہے جب سپردگی کا وقت آئے مارکیٹ میں اس کمپنی کے شیئرز دستیاب نہ ہوں لہٰذا شیئرز میں بیعِ سلم جائز نہیں۔][26

(9) کپڑوں میں بیعِ سلم جائز ہے

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ نے کپڑوں میں بھی بیع سلم کو جائز قرار دیا ہے۔][27

علامہ ابن المنذر رحمہ اللہ نے کپڑوں میں بیع سلم کے جواز پر اجماع نقل کیا ہے].28[

(10) سلم میں رہن اور ضمانت (گارنٹی) طلب کرنا

بیع سلم میں بیچی گئی چیز چونکہ فروخت کنندہ کے ذمہ ادھار ہوتی ہے لہٰذا خریدار حوالگی یقینی بنانے کے لئے رہن یا گارنٹی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت سے بیع سلم کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے اس کے بعد والی آیت میں بصورتِ ادھار رہن کی اجازت دی گئی ہے۔ لہٰذا رہن کا جواز بیع سلم میں قرآن کریم سے ثابت ہوتا ہے۔][29

امام بخاری رحمہ اللہ نے

"باب الرھن فی السلم"

کا عنوان قائم کیا ہے اور اس میں یہ روایت ذکر کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین مدت کے لئے ایک یہودی سے غلہ لیا تو اس کے عوض میں اس کے پاس لوہے کی زرہ گروی رکھی۔

(11) سلم میں کسی کو ضامن بنانا

شارح صحیح بخاری علامہ داؤد راز دھلوی رحمہ اللہ

"باب الکفیل فی السلم"

کے تحت وارد ہونے والی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

معلوم ہوا سلم یا قرض میں اگر کوئی دوسرا شخص سلم والے یا قرض دار کا ضامن ہو تو یہ درست ہے۔

(12) سلم کے ذریعہ خریدی گئی چیز کو قبضہ سے قبل آگے فروخت نہ کیا جائے

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ " سلم کے ذریعے خریدی گئی چیز کو قبضہ سے قبل فروخت کرنے کی حرمت میں ہم کسی اختلاف کا علم نہیں رکھتے۔ بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبضہ سے قبل غلے کی بیع سے منع فرمایا ہے۔]"30[

(13) تجارت میں سلم کا استعمال

اکثر علماء کی رائے میں یہ رعایت تاجروں کے لئے بھی ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ بھی اسی نقطہ نظر کے حامی ہیں چنانچہ انہوں نے

"باب السلم الی من لیس عندہ اصل"

قائم کر کے اس کا اثبات کیا ہے۔

اس باب کے تحت جو وہ روایت لائے ہیں وہ مختصراً پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے کہ صحابہ کرام جس سے بیع سلم کا معاملہ کرتے اس سے مال کی موجودگی کا دریافت نہ فرماتے تھے۔] 31[

(14) مزعومہ اسلامی بینکوں میں سلم کا استعمال

حافظ ذوالفقار علی حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

بلاشبہ سلم ایک بہترین غیر سودی تمویل (financing) ہے جو عصر حاضر میں بھی لوگوں خصوصاً کاشتکاروں اور مینو فیکچرز کی مالی ضرورتیں پوری کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے اور بعض اسلامی بینک اس سے فائدہ

اٹھا رہے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اسلامی بینک اس کی عملی تطبیق میں گڑبڑ کرتے ہیں جس سے یہ معاملہ شرعی اصول کے مطابق نہیں رہتا۔ وہ یوں کہ گنے کے سیزن میں شوگر ملوں کو گنا خریدنے کے لئے رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملز مالکان چاہتے ہیں کہ ہمارا مقصد بھی پورا ہو جائے اور ہم سود سے بھی محفوظ رہیں اب وہ اسلامی بینک کی طرف رجوع کرتے ہیں، بینک اس شرط پر رقم فراہم کرتا ہے کہ آپ نے ہمیں اس کے عوض فلاں تاریخ تک اتنی چینی مہیا کرنی ہے یعنی بینک سلم کا معاہدہ کر لیتا ہے شوگر ملز کی طرف سے فراہمی یقینی بنانے کے لئے بینک ضمانت بھی طلب کرتا ہے چونکہ بینک کاروباری ادارہ نہیں جو آگے بیچنے کے لئے گاہک تلاش کرتا پھرے اس لئے معاہدے کے وقت ہی یہ بھی طے کر لیا جاتا ہے کہ مل مالک بینک کے وکیل کی حیثیت سے یہ چینی مارکیٹ میں اس قیمت پر فروخت کر کے رقم بینک کے سپرد کریگا۔ بعض دفعہ معاہدے کے وقت اس کی صراحت نہیں ہوتی مگر فریقین کے ذہن میں یہی ہوتا ہے۔ اگر شوگر مل بروقت چینی فراہم نہیں کرتی تو بینک دی گئی رقم کے فیصد کے حساب سے جرمانہ وصول کرتا ہے جو بینک کی زیر نگرانی قائم خیراتی فنڈ میں جمع کروایا جاتا ہے۔

بینک کا خود قبضہ کرنے کے بجائے فروخت کنندہ کو ہی وکیل بنانا شرعی اصول کے خلاف ہے۔

چنانچہ علماء احناف کے سرخیل علامہ سرخسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"اس کا مطلب یہ ہے کہ سلم کے ذریعے بیچی گئی چیز فروخت کنندہ کے ذمہ ادھار ہوتی ہے اور جس کے ذمہ ادھار ہو وہ خود اپنی ذات سے اس کی وصولی کے لئے اس شخص کا وکیل نہیں بن سکتا جس کا اس کے ذمہ ادھار ہو"۔[32]

علامہ ڈاکٹر محمد سلیمان اشقر سلم سے اسلامی بینکوں کے فائدہ اٹھانے کے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بینک چیز کی مارکیٹنگ کے لئے فروخت کنندہ کو ہی اپنا وکیل مقرر کر دے خواہ اس کی اجرت دے یا نہ دے۔ تو اگر یہ وکالت پہلے سے عقد سلم سے مربوط ایگریمنٹ کے ذریعے ہو تو یہ عمل باطل ہو گا جو جائز نہیں کیونکہ یہ ایک عقد میں دو عقد جمع کرنے کے مترادف ہے اور اگر (ایگریمنٹ تو نہ ہو مگر) پہلے ہی سے ذہن میں یہ ہو کہ معاملہ اس طرح تکمیل کو پہنچے گا تو پھر بھی یہ جائز نہیں"۔[33]

(15) سلم متوازی

یہاں یہ بتادینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی بینکوں میں سلم سے فائدہ اٹھانے کا جو طریقہ اسلامک بینکنگ کے ماہرین نے تجویز کیا ہے اس کو "سلم متوازی" کہتے ہیں۔ یعنی بینک کسی تیسرے فریق کے ساتھ سلم کا معاہدہ کرلے جس کی تاریخ ادائیگی پہلی سلم والی ہی ہو۔ متوازی سلم میں مدت کم ہونے کی وجہ سے قیمت زیادہ ہوگی اور یوں دونوں قیمتوں میں فرق بینک کا نفع ہوگا۔ مگر ہمارے ہاں اسلامی بینکوں میں یہ طریقہ شاذونادر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر فروخت کنندہ کو ایجنٹ بنانے کا طریقہ ہی اختیار کیا جاتا ہے جو شرعاً درست نہیں۔]34[

وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

[1] کتاب الام: باب السلف۔ مصنف عبدالرزاق: ص14064

[2] صحیح بخاری: کتاب السلم، باب السلم فی وزن معلوم

[3] الاجماع ص:112

[4] المغنی از ابن قدامہ، مفہوماً

[5] دور حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم ص164

[6] آپ کے مسائل اور ان کا حل 1/413

[7] ترمذي: كتاب البيوع، باب ما جاء في كراهية البيع ما ليس عندك (صحیح)

[8] شرح السنۃ 8/140

[9] مجموع الفتاویٰ: 20/530

[10] آپ کے مسائل اور ان کا حل 413-411/1

[11] ترمذي: كتاب البيوع، باب ما جاء في كراهية البيع ما ليس عندك (صحیح)

[12] ترمذي: كتاب البيوع، باب ما جاء في كراهية البيع ما ليس عندك (صحیح)

[13] اعلام الموقعین مترجم 1/314

[14] الموسوعۃ الفقہیۃ: 25/202

[15] فقہ السنہ: 3/152

[16] فتاویٰ اہلحدیث 266-67/2

[17] صحیح بخاری: کتاب السلم، ترجمہ وتشریح از مولانا محمد داؤد راز، جلد 3

[18]منہاج المسلم-مترجم، ص547

[19]فقہ السنہ3/152

2 [20] فتاویٰ اصحاب الحدیث2/253

3 [21]منہاج المسلم: مترجم ص:547

[22] صحیح بخاری: کتاب السلم، ترجمہ وتشریح از مولانا محمد داؤد راز، جلد3

[23] صحیح بخاري: کتاب السلم، باب السلم فی وزن معلوم

[24]دیکھئے المغنی از ابن قدامہ۔البیوع

[25] صحیح بخاری: کتاب السلم، ترجمہ وتشریح از مولانا محمد داؤد راز، جلد3

2 [26]دور حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم، ص:169

[27]فقہ الحدیث2/312

[28]الاجماع، مترجم ص112

[29]سورۃ البقرۃ:282

[30]دور حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم

[31]فصیل کیلئے حوالہ مذکورہ بالا

1 [32]المبسوط: ج15ص101

[33]بحوث فقھیۃ قضایا اقتصادیۃ معاصرۃ: ج1ص:214

[34]دور حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم از حافظ ذوالفقار علی حفظہ اللہ

(12) مروجہ اسلامی بینکوں میں رائج مضاربہ کی شرعی حیثیت

الشیخ حافظ ذوالفقار احمد حفظہ اللہ

الحمدللّٰہ وحدہ و الصلوۃ و السلام علی من لا نبی بعدہ أمّا بعد فأعُوذُ بِاللّٰہ مِنَ الشّیطانِ الرّجِیم ،بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم ﴿وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ﴾

ص:24

ترجمہ:"اور اکثر شراکت دار ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں سوائے ان لوگوں کے جو ایمان دار ہوں اور نیک عمل کرتے ہوں اور ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔"

یہ امر طے شدہ ہے کہ روپے پیسے میں اضافہ کرنے اور اسے بڑھانے کے لئے اسے کسی کاروبار میں لگانا ضروری ہے۔اگر کسی شخص کے پاس دس لاکھ روپیہ موجود ہو اور وہ اسے کسی کاروبار میں نہ لگائے تو وہ دس سال کے بعد بھی دس لاکھ ہی رہے گا،اس کو دس لاکھ پچاس ہزار کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس سے کوئی کاروبار کیا جائے

۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں بے شمار ایسے لوگ موجود ہیں جن کے پاس سرمایہ تو موجود ہے مگر وہ کاروبار کی صلاحیت نہیں رکھتے یا وہ کاروبار کرنا ہی نہیں چاہتے اور دوسری طرف ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو کاروبار کے ماہر تو ہوتے ہیں لیکن ان پاس سرمایہ نہیں ہوتا لہٰذا ایک ایسے نظام کی ضرورت تھی جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے،یعنی جن لوگوں کے پاس سرمایہ نہیں وہ ان لوگوں سے سرمایہ لے کر اس سے کاروبار کر سکیں یا اپنے پہلے سے جاری کاروبار کو ترقی دے سکیں جن کے پاس اپنی ضرورت سے زائد سرمایہ موجود ہو اور اس کا فائدہ سرمایہ کار کو بھی پہنچے۔ظہورِ اسلام سے قبل عرب معاشرے میں اس کی دو صورتیں رائج تھیں۔

(1) سرمایہ دار ضرورت مند کو سرمایہ دے کر اس کا ایک طے شدہ کرایہ وصول کرتا۔اسلام کی نگاہ میں یہ طریقہ سراسر باطل اور حرام ہے کیونکہ روپیہ پیسہ ایسی چیز نہیں جس کا کرایہ لیا جا سکے،لہٰذا قرآن نے اسے سود قرار دے کر اس پر پابندی عائد کر دی۔

(2) سرمایہ داراس شرط پر سرمایہ دیتا کہ کاروبار سے جو منافع حاصل ہوگا وہ اس کے اور کاروباری فریق کے درمیان ایک طے شدہ تناسب (Ratio) سے تقسیم ہوگا۔اس طریق کار کو مضاربہ کہا جاتا ہے جس کا لغوی معنی ہے " سفر کرنا" اور اس کا نام مضاربہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ کاروباری فریق اپنی سفری کوشش اور محنت کے بدلے نفع کا حق دار بنتا ہے۔ مضاربہ میں چونکہ سرمایہ کار اپنے مال کا کچھ حصہ الگ کر کے دوسرے فریق کے حوالے کر دیتا ہے اس لئے بعض اہل علم اسے قراض یا مقارضہ بھی کہتے ہیں جس کا معنی ہے "کاٹنا" ۔اسلامی شریعت نے بھی اس کو برقرار رکھا اور بعض شرائط اور پابندیوں کے ساتھ اس کو جائز قرار دیا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی بعثت سے قبل حضرت خدیجہ الکبری رضی اللہ عنہا کے مال سے مضاربت کی بنیاد پر تجارت کی تھی اور بہت سے صحابہ کرام نے مضاربہ کی بنیاد پر کاروبار کئے۔

مضاربہ کے بارے میں روایات

کتب حدیث میں ہمیں مضاربہ کے متعلق درج ذیل روایات ملتی ہیں۔

(1) سنن ابن ماجہ میں سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ثلاَثٌ فِيهِنَّ الْبر كةُ الْبَيْعُ إِلَى أَجَلٍ وَ الْمقَارَضةوَإِخْلاَطُ الْبر بِالشَّعِيرِ لِلْبَيْتِ لاَلِلْبَيْعِ

سنن ابن ماجہ: کتاب التجارۃ، باب الشرکۃ والمضاربۃ 2 سنن البیقی: کتاب القراض۔

ترجمہ: "تین چیزوں میں برکت ہے۔(1)معینہ مدت کے لئے ادھار فروخت کرنا۔(2)مضاربہ کی بنیاد پر کسی کو مال دینا۔(3) گھریلو ضرورت کے لئے گندم میں جو کی ملاوٹ کرنا البتہ فروخت کرنے کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ۔"

(2) سنن بیھقی میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں کے بارے میں منقول ہے:

إذا دفع مالاً مُضاربةً اشترط على صاحبه أن لا يسلُک به بحرًا و لا ينزل به واديا و لا يشتري به ذات كبدٍ رطبةٍ فإن فعل فهُو ضامنٌ فرُفع شرطه إلى رسُول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فأجازه

سنن دار قطنی: کتاب البیوع، (یہ حدیث صحیح ہے)

”جب کسی کو وہ مضاربت پر مال دیتے تو یہ شرط لگاتے کہ وہ یہ مال سمندر میں نہیں لے جا سکتا اور کسی وادی میں بھی نہیں لے جائے گا اور نہ اس سے جانور خریدے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو نقصان کا ضامن وہ خود ہو گا۔ ان کی یہ شرط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی گئی تو آپ نے اس کی اجازت دے دی۔“

سند کے لحاظ سے یہ دونوں روایات ضعیف ہیں۔

(3) سیدنا حکیم بن حزام بھی انہی شرائط کے ساتھ مضاربت پر مال دیا کرتے تھے۔][1

(4) سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی مضاربہ کی بنیاد پر مال دیا تھا۔][2

(5) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبداللہ اور عبیداللہ ایک لشکر کے ساتھ عراق گئے۔ جب وہ واپس آ رہے تھے تو ان کی ملاقات بصرہ کے گورنر ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ہوئی، انہوں نے کہا میری یہ خواہش ہے کہ تمھیں کوئی فائدہ پہنچا سکوں۔ میرے پاس بیت المال کا کچھ مال ہے جو میں مدینہ منورہ امیر المؤمنین کی خدمت میں بھیجنا چاہتا ہوں، میں وہ مال تمھیں بطور قرض دے دیتا ہوں تم یہاں سے کچھ سامان خرید لو اور مدینہ منورہ میں وہ سامان بیچ کر اصل سرمایہ بیت المال میں جمع کرا دینا اور نفع خود رکھ لینا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس پر راضی نہ ہوئے اور انہوں نے اسے مضاربہ قرار دے کر اصل سرمائے کے علاوہ ان سے آدھا نفع بھی وصول کیا۔][3

(6) سنن بیہقی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”مضاربہ میں ہر سرمایہ کار اپنے سرمائے کے تناسب سے نقصان برداشت کرے گا اور منافع طے شدہ تناسب کے مطابق تقسیم ہو گا۔“

مضاربہ کے اصول و ضوابط

پہلا اصول

مضاربہ میں دو فریق ہوتے ہیں۔

(1) کاروبار کے لئے سرمایہ فراہم کرنے والا جسے رَبُّ المال کہا جاتا ہے۔

(2) کاروبار کرنے والا فریق جسے مضارب کہتے ہیں۔

رب المال یعنی سرمایہ فراہم کرنے والا براہ راست کاروبار یا مینجمنٹ میں حصہ تو نہیں لے سکتا البتہ اسے کاروباری پالیسیوں کے متعلق اعتماد میں لینا، حسابات کی تفاصیل معلوم کرنا اور کاروبار کی مناسب نگرانی کرنا تاکہ مضارب

بد دیانتی اور غفلت کامرتکب نہ ہو اس کا بنیادی حق ہے جس سے کسی عالم، فقیہ اور مجتہد کو اختلاف نہیں کیونکہ یہ دونوں کاروبار میں ایک دوسرے کے شریک ہیں کہ ایک کی محنت اور دوسرے کا سرمایہ شامل ہے لہٰذا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ سرمایہ کار کو کاروبار کی نگرانی اور اس بات کو یقینی بنانے کا اختیار دیا جائے کہ مضارب اپنا فرض پوری دیانت داری سے ادا کر رہا ہے یا نہیں اور اگر عقلی لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی ہے کہ ایک شخص نے خطیر رقم دی ہو اور اسے کاروبار سے بالکل ہی الگ تھلگ رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب امام مالک رحمہ اللہ یہ پوچھا گیا کہ ایک شخص نے دوسرے کو مضاربت پر مال دیا، اس نے محنت کی جس کے نتیجے میں اسے منافع حاصل ہوا۔ اب مضارب یہ چاہتا ہے کہ وہ سرمایہ کار کی غیر موجودگی میں منافع سے اپنا حصہ وصول کر لے تو کیا یہ درست ہے؟ اس پر امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

لاینبغی لہ أن یأخذ منہ شَیْئًا إِلَّا بِحَضْرَةِ صَاحِبِ الْمَالِ

مؤطا: باب المحاسبۃ في القراض

"جب تک رَبُّ المال موقع پر موجود نہ ہو مضارب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ منافع سے اپنا حصہ وصول کرے۔"

مروجہ اسلامی بینکوں میں کرنٹ اکاؤنٹس کے علاوہ بقیہ تمام اکاؤنٹس عام طور پر مضاربہ کی بنیاد پر ہی کھولے جاتے ہیں یعنی بینک میں رقم رکھنے والے ربُّ المال اور بینک مضارب ہوتا ہے لیکن کسی بھی اسلامی بینک میں اس اصول پر عمل نہیں کیا جاتا بلکہ ہر اسلامی بینک کے اکاؤنٹ اوپننگ فارم میں یہ عبارت درج ہوتی ہے کہ:

"بینک کی جانب سے متعین کردہ کوئی بھی رقم بطور نفع یا نقصان حتمی ہو گی اور تمام صارفین اس کے پابند ہوں گے۔ کسی صارف کو یہ حق حاصل نہیں ہو گا کہ ایسے نفع یا نقصان کے تعین کی بنیاد کے بارے میں سوال کرے۔"

بینک کی طرف سے اکاؤنٹ ہولڈر پر یہ پابندی عائد کرنا عدل وانصاف کے منافی اور ربُّ المال کی حق تلفی ہے۔ اس ناروا شرط کا ہی نتیجہ ہے کہ اسلامی بینکوں کے منافع میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے مگر ڈپازٹر کے منافع کی شرح وہی ہے حتی کہ بعض اسلامی بینکوں کے منافع میں ایک سال کے دوران ایک سو چھ فیصد تک اضافہ ہوا ہے لیکن ڈپازٹرز کے پرافٹ میں اس حساب سے اضافہ نہیں کیا گیا، صرف ایک آدھا فیصد اوپر نیچے کیا جاتا ہے جو کہ سراسر زیادتی ہے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ مروجہ اسلامی بینک بد دیانتی کے مرتکب ہیں اور ان میں رائج مضاربہ حقیقی معنوں میں مضاربہ نہیں ہے۔

دوسرا اصول

مضاربہ کے صحیح ہونے کا دوسرا اصول یہ ہے کہ فریقین بالکل شروع میں ہی منافع کے تقسیم کی شرح طے کر لیں یعنی یہ فیصلہ کر لیں منافع سرمایہ کار اور مضارب میں مساوی تقسیم ہو گا یا سرمایہ کار منافع کے ساٹھ فیصد اور مضارب چالیس فیصد کا حق دار ہو گا کیونکہ مضاربہ میں منافع ہی معقود علیہ ہوتا ہے اور اگر یہ مجہول ہو تو مضاربہ فاسد ہو گا۔ چنانچہ المعاییر الشرعیہ میں مرقوم ہے:

يشترط في الربح أن تكون كيفية توزيعه معلومة علما نافيا للجهالة ومانعا للمنازعة

"منافع میں یہ شرط ہے کہ اس کی تقسیم کی کیفیت اس طرح معلوم ہو کہ اس میں کوئی بے خبری اور نزاع کا امکان نہ ہو۔"

جب کہ مروجہ اسلامی بینکوں میں اکاؤنٹ کھولتے وقت منافع کے تقسیم کی شرح بالکل واضح نہیں کی جاتی بلکہ بینک اس کا اعلان مضاربہ شروع ہونے کے بعد کرتا ہے۔ چنانچہ اسلامی بینکوں کے اکاؤنٹ اوپننگ فارم میں یہ عبارت درج ہوتی ہے:

"بینک ڈپازٹر کے ساتھ کاروبار سے حاصل ہونے والے اجمالی نفع (Gross Income) میں اس شرح سے شریک ہو گا جس کا اعلان بینک نے ہر مہینے یا عرصے کے آغاز میں کیا ہو گا۔ بینک کا حصہ وقتاً فوقتاً تبدیل ہو سکتا ہے اور اس کا بھی متعلقہ مہینے یا عرصے کے پہلے ہفتے کے اندر اندر اوزان کے ساتھ کیا جائے گا۔"

اس سے یہ ثابت ہوا کہ مروجہ اسلامی بینکوں میں مضاربہ شروع کرتے وقت منافع کے تقسیم کی شرح معلوم نہیں ہوتی بلکہ بعد میں بتائی جاتی ہے اور بینک جب چاہے اس کو تبدیل بھی کر سکتا ہے جس سے مضاربہ باطل ہو جاتا ہے۔

تیسرا اصول

شرعی نقطۂ نظر سے مضاربہ ایگریمنٹ میں سرمایہ کار کا حق فائق ہوتا ہے یعنی وہ مضارب پر کسی مخصوص شخص یا کمپنی کے ساتھ لین دین کرنے یا کسی خاص جگہ پر کاروبار کرنے کی پابندی عائد کر سکتا ہے اور ان اشیاء کا تعین بھی کر سکتا ہے جن کے علاوہ تجارت نہیں کی جا سکتی اور اگر مضارب اس کی ہدایات پر عمل نہ کرے تو وہ سرمایہ کار کے سرمائے کا ذمہ دار ہو گا جیسا کہ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب وہ کسی کو مضاربہ پر مال دیتے تو یہ شرط عائد کرتے:

أن لاتجعل مالي في كبد رطبة و لاتحمله في بحر و لاتنزله به في بطن مسيل، فان فعلت شيئا من ذلک فقد ضمنت مالی

بلوغ المرام: باب القراض

"میرے مال سے جانور نہیں خریدو گے اور نہ اس سے سمندر اور کسی وادی میں تجارت کرو گے اور اگر تم نے ایسا کیا تو میرے مال کے نقصان کی ذمہ داری تم پر ہو گی۔"

مروجہ اسلامی بینکوں کے کھاتے داران اس حوالے سے بھی بے بس دکھائی دیتے ہیں کیونکہ ان کا کام صرف رقوم جمع کرانا ہے۔ان رقوم سے کونسا کاروبار کرنا ہے یا بینک اس کو کہاں استعمال کرے گا یہ اس کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے، کھاتے دار اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتے۔چنانچہ ہر اسلامی بینک کے اکاؤنٹ اوپننگ فارم میں یہ صراحت ہوتی ہے:

" بینک بحیثیت مضارب اپنی صوابدید پر صارفین سے وصول شدہ رقم کی سرمایہ کاری وعدم سرمایہ کاری کسی بھی کاروبار (کاروبار، ٹرانزیکشن، پروڈکٹ) میں کر سکتا ہے جو بینک کے شریعہ ایڈوائزر سے منظور شدہ ہو۔"

یہ درست ہے کہ سرمایہ کار مضارب کو یہ اختیار دے سکتا ہے کہ وہ جس کاروبار اور تجارت میں پیسہ لگانا چاہے لگا سکتا ہے یا جس علاقے میں مناسب سمجھے کاروبار کر سکتا ہے لیکن مضارب کی طرف سے سرمایہ کار کا یہ حق سلب کیا جانا غیر منصفانہ اقدام ہے جس کی تائید نہیں کی جا سکتی۔

چوتھا اصول

مضاربہ میں سرمایہ کار یہ گارنٹی تو طلب نہیں کر سکتا کہ اسے اتنے فیصد منافع ہر حال میں ادا کیا جائے گا خواہ مضارب کو فائدہ ہو یا نقصان کیونکہ ایسا منافع سود کے زمرے میں داخل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہو گا لیکن وہ مضارب سے یہ گارنٹی لے سکتا ہے کہ وہ اپنا فرض پوری دیانتداری اور تندہی سے ادا کرے گا اور ان شرائط کے مطابق ہی کاروبار کرے گا جو فریقین کے مابین طے ہوئی ہیں اور اگر معاہدے میں طے شدہ شرائط کی خلاف ورزی یا اس کی غفلت اور بے احتیاطی کی وجہ سے کوئی نقصان ہوا تو وہ اس کا ازالہ کرے گا جیسا کہ المعاییر الشرعیہ میں ہے:

يجوز لرب المال أخذ الضمانات الكافية و المناسبة من المضارب بشرط أن لاينفذ رب المال هذه الضمانات الا اذا ثبت التعدى أو التقصير أو مخالفة شرو ط عقد المضاربة

"ربّ المال مضارب سے کافی اور مناسب ضمانتیں لے سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ رب المال ان ضمانتوں کو اسی صورت نافذ کرے گا جب مضارب کی زیادتی یا کوتاہی یا عقد مضاربہ کی شرائط کی خلاف ورزی ثابت ہو جائے۔"
خود اسلامی بینک بھی سیکورٹی ڈپازٹ کے بغیر اپنے کلائنٹ کے ساتھ اجارہ وغیرہ کا معاملہ نہیں کرتے لیکن ایک بھی اسلامی بینک ایسا نہیں جو اپنے ڈپازٹر کو یہ گارنٹی دیتا ہو۔

پانچواں اصول

کتبِ فقہ میں مضاربہ کی بحث میں ایک اصول یہ بھی بیان ہوا ہے کہ مضاربہ کی بنیاد پر لئے گئے سرمائے سے صرف تجارت (Trading) ہی کی جاسکتی ہے، تجارت کے علاوہ اسے کسی اور مقصد کیلئے استعمال نہیں کیا جاسکتا ۔چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

عقد القراض يقتضي تصرف العامل في المال بالبيع والشراء، فإذا قارضه على أن يشتري به نخلا يمسك رقابها ويطلب ثمارها لم يجز لانه قيد تصرفه الكامل بالبيع والشراء، ولان القراض مختص بما يكون النماء فيه نتيجة البيع والشراء وهو في النخل نتيجة عن غير بيع وشراء فبطل أن يكون قراضا ولا يكون مساقاة، لأنه عاقده على جهالة بها قبل وجود ملكها، وهكذا لو قارضه على شراء دواب أو مواشي يحبس رقابها ويطلب نتاجها لم يجز لما ذكرنا

المجموع: ج،14ص:371۔

"عقد مضاربہ کا تقاضا یہ ہے کہ مضارب خرید وفروخت کے ذریعے ہی مال میں تصرف کرے لہٰذا جب وہ اس طرح مضاربہ کرے کہ وہ اس مال سے کھجوروں کے درخت خریدے گا اور ان سے پھل حاصل کرے گا تو یہ جائز نہیں ہوگا کیونکہ قید یہ ہے کہ کامل تصرف خرید وفروخت کے ذریعے ہو اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مضاربہ ان معاملات کے ساتھ مختص ہے جہاں مال میں اضافہ خرید وفروخت کے نتیجے میں ہو جبکہ کھجوروں میں یہ اضافہ خرید وفروخت کے نتیجے میں نہیں اس لیے اس کا مضاربہ باطل ٹھہرا اور یہ مساقات کا معاملہ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ اس صورت میں یہ کھجوروں کی ملکیت وجود میں آنے سے پہلے مجہول درختوں پر عقد ہوگا۔اسی طرح اگر اس طرح مضاربہ کرلے کہ وہ جانور یا مویشی خریدے گا جو بذات خود تو اس کے پاس محفوظ ہوں گے مگر ان کی پیداوار حاصل کرے گا تو یہ بھی جائز نہیں ہوگا۔وجہ وہی ہے جو ہم نے اوپر ذکر کی ہے یعنی یہ نفع خرید وفروخت کے نتیجے میں حاصل نہیں ہوا۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

لو قارضه على أن يشتري الحنطة فيطحنها ويخبزها والطعام ليطبخه ويبيعه والغزل لينسجه، والثوب ليقصره، أو يصبغه، والربح بينهما، فهو فاسد... قارضه على دراهم على أن يشتري نخيلا أو دواب أو مستغلات ويمسك رقابها لثمارها ونتاجها وغلاتها وتكون الفوائد بينهما فهو فاسد لأنه ليس ربحاً بالتجارة بل من عين المال

روضة الطالبين: ج2، ص188

"اس کا مطلب یہی ہے کہ مضاربہ کا مال تجارتی سرگرمیوں کے علاوہ دوسری پیداواروں سکیموں میں استعمال نہیں ہو سکتا جیسے کوئی اس بات پر مضاربہ کرلے کہ وہ گندم خرید کر اسے پیسے گا اور روٹی پکا کر اسے بیچے گا اور نفع دونوں میں تقسیم ہو گا تو یہ مضاربہ فاسدہ ہو گا کیونکہ یہ نفع تجارت کے ذریعے حاصل نہیں ہوا بلکہ اس نے خود مال سے جنم لیا ہے"

امام ابوالقاسم عبدالکریم الرافعی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

لو قارضه على أن يشترى الحنطة فيطحنها ويخبزها والطعام ليطبخه ويبيع والربح بينهما فهو فاسد وتوجيه الملتئم من كلام الاصحاب أن الطبخ والخبز ونحوهما أعمال مضبوطة يمكن الاستئجار عليها وما يمكن الاستئجار عليه فيستغني عن الفراض إنما القراض لما لا يجوز الاستئجار عليه وهو التجارة التى لا ينضبط قدرها

فتح العزيز شرح الوجيز: ج12 ص11

"یعنی مضاربہ کے مال سے صرف تجارت کی جا سکتی ہے دوسرے نفع بخش کاموں میں لگانے کی اجازت نہیں کیونکہ مضاربہ وہاں ہوتا ہے جہاں اجارہ نہ ہو سکے اور وہ تجارت ہے۔ جہاں اجارہ ہو سکے وہاں مضاربہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

فقہاء حنفیہ کے نزدیک بھی مضاربہ کا مال صرف تجارت اور اس سے متعلقہ سرگرمیوں میں ہی لگایا جا سکتا ہے ،چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے:

فينتظم العقد صنوف التجارة وما هو من صنيع التجار

هداية مع البناية: ج10 ص52

”مضاربہ کا عقد تجارتی سرگرمیوں کو ہی شامل ہے جبکہ یہ (ایک خاص مسئلہ کی طرف اشارہ) تاجروں کا کام نہیں ہے۔“

دوسری جگہ ایک مسئلہ کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

”کہ یہ امام محمد اور امام ابو حنیفہ ؒ کے نزدیک اس لیے جائز نہیں کہ یہ تجارت میں شامل نہیں اور عقد مضاربہ کا مقصد صرف تجارت میں کسی کو ایجنٹ بنانا ہے۔“

مزید لکھتے ہیں:

”جب یہ تجارت نہیں ہے تو مضاربہ میں بھی شامل نہیں ہے“۔]4[

علامہ زکریا انصاری رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

لَوْ قَارَضهُ عَلَى أَنْ يشْتَرِيَ بِالدَّرَاهم نَخْلًا لِيسْتَغِله، وَالرِّبْحُ بَينهما؛ لِأَنَّ مَا حَصَلَ لَيْسَ بِتَصرف الْعَامِلِ وَإِنَّماهوَ مِنْ عَيْنِ الْمَالِ

البهجة الوردية: باب القراض ج11 ص480

”اگر کوئی اس طرح مضاربہ کرے کہ وہ دراہم سے کھجوروں کے درخت خریدے گا تاکہ ان کی آمدن حاصل کرے اور نفع دونوں کے درمیان تقسیم ہو تو یہ بھی جائز نہیں ہوگا کیونکہ اس صورت میں جو نفع حاصل ہوا ہے وہ مضارب کے تصرف کا نتیجہ نہیں ہے وہ تو خود مال کا کمال ہے۔“

جب کہ اسلامی بینک مضاربہ کی بنیاد پر لیا گیا سرمایہ اجارہ وغیرہ میں بھی لگاتے ہیں جس سے اسلامی بینکوں میں رائج مضاربہ مشکوک قرار پاتا ہے۔ چونکہ اس نقطہ نظر کے حق میں دلائل نہیں ہیں اس لیے اسلامی بینکاری کے حامی بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ بنیادی طور پر مضاربہ تجارت میں ہی ہوتا ہے۔

زرعی اور صنعتی منصوبوں میں اس کا استعمال اس کے مفہوم میں وسعت پیدا کر کے کیا جانے لگا ہے۔ چنانچہ المعاییر الشرعیۃ میں ہے:

والمضاربة من الصيغ التي تستخدم غالبا في التجارة ثم توسعت استخداماتها حتى شملت مجالات الاستثمار التجارية والزراعية والصناعية والخدمية وغيره

ایضًا۔ ص232

"مضاربہ ان طریقوں میں سے ہے جو زیادہ تر تجارت میں استعمال کیا جاتا ہے پھر اس کے استعمال میں وسعت پیدا ہو گئی یہاں تک کہ تجارتی، زرعی اور صنعتی سرمایہ کاری وغیرہ کو بھی شامل ہو گیا۔"

مضاربہ کے مفہوم میں یہ وسعت کس نے پیدا کی، کب کی اور کس بنیاد پر کی؟ اسلامی بینکوں کے مفتیان کرام اس بارے میں بالکل خاموش ہیں۔

چھٹا اصول

مضاربہ میں نفع کا صحیح اندازہ تب ہی ہو سکتا ہے جب مضاربہ کاروبار کے غیر نقد اثاثوں کو بیچ کر نقد میں تبدیل کر لیا جائے۔ اسی لئے ماہرین شریعت یہ کہتے ہیں کہ لیکویڈیشن سے پہلے منافع کی تقسیم درست نہیں ہے۔ چنانچہ معروف حنفی فقیہ جناب علامہ علاؤالدین کاسانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ویشترط لجواز القسمة قبض المالک رأس المال، فلاتصح قسمة الربح قبل قبض رأس المال

الموسوعة الفقهية

"مضاربہ میں نفع کی تقسیم کی شرط یہ ہے کہ ربّ المال اپنے رائس المال پر قبضہ کر لے۔ چنانچہ اصل سرمائے کو قبضہ میں لینے سے قبل نفع کی تقسیم درست نہیں ہو گی۔"

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر لیکویڈیشن کے بغیر منافع تقسیم کر دیا جائے اور بعد میں مال ضائع یا بازار میں مندی ہو جائے تو اس سے رب المال کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ کیونکہ اصول یہ ہے کہ اگر کسی کاروبار کو ایک مدت کے دوران نقصان اور دوسری مدت کے دوران منافع ہو تو پہلے اس منافع سے نقصان کو پورا کیا جائے گا اور اگر نفع کی کوئی رقم باقی بچ رہی ہو تو وہ ربُّ المال اور مضارب کے درمیان طے شدہ فارمولے کے مطابق تقسیم ہو گی۔

لیکویڈیشن سے قبل منافع کی تقسیم کی صورت میں چونکہ مضارب سابقہ مدت کے نفع سے اپنا حصہ وصول پا چکا ہوتا ہے جس کی واپسی کا مطالبہ فریقین کے مابین نزاع اور کشیدگی کا سبب بن سکتا ہے اس لئے لیکویڈیشن سے پہلے منافع کی تقسیم کا عمل درست نہیں ہو سکتا۔

اسلامی بینکوں میں چونکہ رقمیں جمع کرانے اور نکالنے کی کوئی تاریخ متعین نہیں ہے کہ تمام اکاؤنٹ ہولڈر اسی ایک تاریخ میں رقمیں جمع کرائیں اور نکالیں بلکہ یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے اس لئے منافع کی تقسیم سے قبل غیر نقد اثاثوں کو بیچ کر نقد میں تبدیل کرنے کی نوبت نہیں آتی، صرف ان اثاثوں کی بازاری قیمت کا اندازہ کیا جاتا ہے

، عملاکاروبار ختم نہیں ہوتا۔ یہ طریقہ علامہ کاسانی رحمہ اللہ کی بیان کردہ شرط کاتقاضاپوراکرتاہے یہ غور طلب پہلو ہے جس کا باریک بینی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

وصلی اللہ وسلم علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین

[1] سنن دار قطنی: کتاب البیوع، (یہ حدیث صحیح ہے)

[2] مؤطاامام مالک

[3] مؤطاامام مالک

[4] ھدای ۃ مع البنای ۃ: ج10 ص87

(13) دینِ اسلام میں خرید و فروخت کی بنیادی شرائط

الشیخ حماد امین چاولہ حفظہ اللہ

شرط کی لغوی واصطلاحی تعریف

لغوی تعریف:

شرط:(”را“ پر جزم وسکون کے ساتھ)کالغوی معنی ہے:کسی بھی چیز کولازم پکڑلینااس سے چمٹ جانا۔

اصطلاحی تعریف:

فقہاء وعلماء اصول کے مطابق شرط کی تعریف یہ ہے کہ:

”جس کے فقدان سے کسی چیز کا نہ ہونالازم ہواوراس کے وجود سے ہونایانہ ہونالازم نہ آئے“۔[1]

آسان الفاظ میں یوں کہاجاسکتاہے کہ:کوئی بھی عمل اس وقت تک درست نہیں ہوسکتاجب تک کہ اس کی مطلوبہ شرط مکمل نہ ہو،اگر شرط مکمل نہیں ہوئی تو عمل بھی درست نہ ہوگا۔

لہٰذا خرید وفروخت کی شرائط سے مراد وہ شرائط ہیں کہ جنہیں شریعتِ مطہّرہ نے کسی بھی معاہدہ بیع کی درستگی کے لئے لازمی قرار دیاہے اوراگران میں سے ایک شرط بھی مفقود ہوئی تووہ بیع شرعی اعتبار سے صحیح نہیں ہوگی۔

لہٰذاہر لین دین کرنے والے اور ہر کاروبای تاجر حضرات کیلئے ان شرائط کا علم رکھنا انتہائی ضروری ہے کیونکہ خرید وفروخت کا جائزوناجائز ہونا انہی شرائط پر مبنی ہوتاہے۔

اہل علم نے شرعی نقطہ نگاہ سے کسی بھی بیع کے درست ہونے کیلئے بنیادی طور پر چھے(6)اہم شرائط ذکر کی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

پہلی شرط:طرفین(خریداروفروخت کنندہ)حقیقی طور پر رضامند ہوں

کوئی بھی بیع اس وقت تک درست نہیں ہوسکتی جب تک بیچنے والااسے بیچنے اور خریدنے والااُسے خریدنے پر حقیقی طور پر رضامند نہ ہوں۔

مذکورہ شرط کے دلائل:

ربّ العالمین کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ﴾

النساء:29

ترجمہ: ”اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، درست صورت یہ ہے کہ باہمی رضامندی سے آپس میں لین دین ہو۔“

مذکورہ بالا آیت میں تجارت و لین دین کے تمام معاملات میں طرفین کی حقیقی رضامندی کو بنیادی شرط کے طور پر ذکر کیا گیا اور جن معاملات میں فریقین کی باہمی حقیقی رضامندی شامل نہ ہو انہیں باطل قرار دیا گیا ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ مبارک ہے: ” خرید و فروخت صرف باہمی رضامندی سے ہی ہونی چاہئے“۔[2]

اس طرح عقلِ سلیم بھی اس امر کی متقاضی ہے کہ اگر معاملات میں باہمی حقیقی رضامندی کی شرط عائد نہ کی جائے، تو لوگ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقوں سے کھانا شروع کر دیں گے، ایک طاقتور شخص اگر اپنے سے کمزور کے پاس اپنی من پسند چیز دیکھے گا تو اس سے زور زبردستی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جس سے معاشرہ میں سوائے نفرت، دشمنی، فساد اور بربادی کے کچھ باقی نہ بچے گا، لہٰذا اسی بنا پر شریعتِ اسلامیہ میں کسی کی چیز بغیر اجازت حاصل کرنا یا کسی کو اس کی چیز بیچنے پر مجبور کرنا یا زبردستی اپنی پسند کی قیمت پر اُسے خریدنا حرام ہے۔

رضامندی حقیقی ہونی چاہئے

اس حوالہ سے عصرِ حاضر کے معروف عالم فضیلۃ الشیخ حافظ ذوالفقار علی فرماتے ہیں:

”واضح رہے کہ یہ رضامندی حقیقی ہونی چاہئے نہ کہ مصنوعی۔ لہٰذا کسی دباؤ کے تحت یا غلط تاثر کی بنیاد پر یا دوسرے فریق کو چیز کی حقیقت سے بے خبر یا اصل قیمت سے دھوکے میں رکھ کر حاصل کی گئی رضامندی قابل اعتبار نہیں ہے کیونکہ یہ مصنوعی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے شریعت نے اس قسم کی دھوکہ دہی کی صورت میں متاثرہ فریق کو معاملہ منسوخ کرنے کا اختیار دیا ہے۔

اسی طرح ایک شخص اگر انتہائی بے بسی اور مجبوری کی بنا پر اپنی چیز بیچ رہا ہو تو ایسے شخص سے مارکیٹ ریٹ سے بہت کم پر خریدنا، اگرچہ بظاہر وہ اس پر راضی بھی ہو ناجائز ہے، درست نہیں۔ معمولی کمی بیشی کی تو گنجائش ہے لیکن بہت زیادہ فرق درست نہیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قلبی خوشی کی تاکید فرمائی ہے اور یہ بات طے ہے کہ مجبور شخص خوش دلی سے غیر معمولی کم ریٹ پر بیچنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں مجبور شخص سے سستے داموں خریدنے کو ترجیح دی جاتی ہے، یہ ناپسندیدہ رویہ ہے جس کی اصلاح ہونی چاہئے"۔]3[

باہمی و حقیقی رضامندی سے متعلق چند اہم وضروری مسائل

پہلا مسئلہ: "بیع المعاطاۃ" کا حکم

بیعِ معاطاۃ سے مراد وہ بیع ہے کہ جس میں: خریدار سامان لیکر فروخت کنندہ (بیچنے والے) کو اُس کی قیمت ادا کردے بغیر زبانی کلامی بات کئے یا اس کے برعکس ہو۔ یعنی فروخت کنندہ سامان خریدار کو دیتا ہے اور خریدار اس کی قیمت ادا کر دیتا ہے۔ اور اس دوران خریدار و فروخت کنندہ کے درمیان کوئی زبانی بات چیت نہیں ہوتی دونوں طرف سے یا کسی ایک کی طرف سے قیمت و سامان کا لین دین بغیر کسی زبانی ایجاب و قبول کے ہوتا ہے۔

اس مسئلہ کو یہاں اسی لئے ذکر کیا جارہا ہے کہ ہمارے یہاں بے شمار اس طرح کے سودے ہوتے ہیں جن میں مطلوبہ چیز کو دیکھا اور پسند کیا جاتا ہے، اس کی قیمت معلوم کی جاتی ہے اور بغیر کسی زبانی رضامندی کے قیمت ادا کر کے وہ مطلوبہ چیز لے لی جاتی ہے۔ اور اس مسئلہ کی اہمیت اس صورت میں اور بڑھ جاتی ہے جب معاملہ اور سودا بڑے پیمانہ پر ہو۔

کیا ایسی صورت میں بغیر کسی زبانی رضامندی کے طے پانے والا سودا شرعاً درست ہوگا یا نہیں؟

مسئلہ مذکورہ میں اہلِ علم کے مابین اختلاف ہے۔ بعض نے اسے جائز قرار دیا ہے، اور بعض نے یہ تفریق کی ہے کہ اگر معاملہ چھوٹے پیمانے پر ہو تو جائز ہے اور بڑے پیمانے پر ہو تو جائز نہیں۔ جبکہ جمہور اہلِ علم کے نزدیک یہ بیع مکمل طور پر جائز ہے۔

اور دلائل کے مطالعہ سے جمہور علماء کی رائے ہی قریب از صواب اور راجح معلوم ہوتی ہے کیونکہ:

*رضامندی فقط قول ہی سے نہیں بلکہ عمل و فعل سے بھی واقع ہوتی ہے اور یہاں خریدار کا قیمت ادا کر کے چیز کو لینا اور فروخت کنندہ کا چیز کو دیکر قیمت وصول کرنا اُن کی باہمی رضامندی کی صریح دلیل ہے۔

زمانہ قدیم سے لوگوں کے مابین اس طرح سے معاملات کا لین دین معروف ہے، اگر زبانی ایجاب وقبول صحتِ بیع کی شرط ہوتی تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے صراحت سے ضرور بیان فرمادیتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا جو اس کے جواز کی دلیل ہے۔

شریعتِ مطہّرہ میں خرید وفروخت سے متعلقہ ہدایات واحکامات موجود ہیں، اور شریعت نے خرید وفروخت کے انعقاد کے سلسلہ میں کچھ خاص و معیّن الفاظ مقرر کرنے کے بجائے اسے معاشرہ میں رائج عرف وطور طریقوں پر چھوڑ دیا، اور جو ناجائز طریقے ہیں وہ بتادیے، اور باہمی حقیقی رضامندی کی قید لگادی تاکہ وہ جو بھی معاملات کریں انہیں باہمی حقیقی رضامندی وخوش اسلوبی سے طے کرلیں۔

دوسرا مسئلہ: "بیع المکرَہ" (زبردستی کی بیع) کا حکم

فقہاء کی اصطلاح میں "اِکراہ" سے مراد: "ایسا کام جسے کوئی انسان کسی دوسرے کے مجبور کرنے پر کرے جس میں اس کی کوئی رضامندی واختیار نہ ہو"۔

یہاں مراد ایسی بیع ہے جو خریدار یا فروخت کنندہ کو مجبور کرکے ناحق اور زور زبردستی سے کروائی جائے،، خریدار و فروخت کنندہ کو اکراہاً بیع پر آمادہ کرنا شرعاً، قانوناً واخلاقاً کسی طور بھی درست وجائز عمل نہیں، اگرچہ وہ مجبور کرنے والا حاکمِ وقت ہی کیوں نہ ہو! اگر کسی پر زبردستی کرکے مجبوراً اُسے کچھ خریدنے یا اسے اس کا سامان بیچنے پر مجبور کیا جائے تو ایسا کرنے سے یہ بیع شرعاً باطل وفاسد ہوگی اور اس پر کوئی مؤثر نتائج مرتّب نہیں ہوں گے۔

بلکہ ایسے معاملات میں شریک ہونے والوں کیلئے سخت وعید وارد ہوئی ہے انہیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانِ مبارک ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کسی انسان کے لئے اپنے (دینی) بھائی کے مال سے اُس کی رضا وخوشی کے بغیر کچھ بھی لینا جائز نہیں"۔[4]

اور دوسری روایت میں فرمایا کہ: " تم میں سے کوئی بھی اپنے (دینی) بھائی کے مال کو اس کی رضا وخوشی کے بغیر مت خریدے"۔[5]

مذکورہ روایات سے اس مسئلہ کی نزاکت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، لہٰذا اگر خریدار یا فروخت کنندہ کو یہ معلوم ہو کہ سودا طرفین میں سے کسی ایک کی بھی رضامندی وخوشی کے بغیر ہو رہا ہے تو سودا کرنا جائز نہیں ہے حتّٰی کہ اس میں طرفین کی باہمی وحقیقی رضا وخوشی شامل نہ ہو۔

بلکہ اہلِ علم نے مذکورہ روایت کے عموم کو سامنے رکھتے ہوئے یہ مسئلہ بھی بیان کیا ہے کہ:

تحفہ وہدیہ بھی اس وقت قبول کرنا جائز نہیں ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ تحفہ دینے والے نے وہ تحفہ ناچاہتے ہوئے یا کسی خجالت وحیاء میں یا مجبوری میں دیا ہے، کیونکہ اگرچہ تحفہ دینے والا اس کی صراحت یا اظہار نہ کرے لیکن اُس کی ظاہری حالت وقرائن یہی ہوں کہ وہ اس پر راضی وخوش نہیں ہے۔

تیسرا مسئلہ: "بیع الجبری" زبردستی کی بیع کی چند استثنائی صورتیں

حکومت وقت، عدالت یا کوئی مجاز اتھارٹی بعض ناگزیر صورتوں میں مالک کو اپنی چیز بیچنے پر مجبور کر سکتی ہیں۔ جسے فقہاء کی اصطلاح میں بیع الجبری کے نام سے جانا جاتا ہے۔

وہ صورتیں جن میں مالک کو اس کی چیز بیچنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے درج ذیل ہیں:

معروف عالم دین حافظ ذوالفقار علی حفظہ اللہ نے اُن صورتوں کو جمع کیا ہے ہم معمولی ردّوبدل کے ساتھ انہیں ذکر کر رہے ہیں:

پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی مقروض اپنے ذمے (واجب الاداء) قرض ادا نہ کر رہا ہو اور اس کے پاس نقد رقم بھی موجود نہ ہو تو عدالت اس کو اپنی جائیداد فروخت کر کے قرض ادا کرنے کا حکم دے سکتی ہے۔ اگر وہ عدالتی حکم کے باوجود لیت ولعل سے کام لے تو عدالت قرض خواہ (مقرِض یعنی قرض دینے والے) کی دادرسی کے لئے خود بھی اس (مقروض) کی جائیداد مارکیٹ ریٹ پر فروخت کر سکتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی شخص نے اپنی جائیداد یا کوئی اور چیز رہن (گروی) رکھ کر قرض لے رکھا ہو اور مدّتِ ادائیگی گذر جانے کے بعد وہ متعدد مرتبہ کی یاد دہانی کے باوجود ادائیگی نہ کر رہا ہو تو قرض خواہ رہن شدہ جائیداد فروخت کر کے اپنا حق وصول کر سکتا ہے، چاہے مقروض اس پر راضی نہ بھی ہو بشرطیکہ عدالت اور قرض خواہ منصفانہ قیمت پر بیچنے کو یقینی بنائیں، اپنی رقم کھری کرنے کے لالچ میں کوڑیوں کے بھاؤ بیچنے کی اجازت ہر گز نہیں ہے۔

تیسری صورت جب غذائی اشیاء کی قلت ہو اور کچھ لوگ ذخیرہ اندوزی کر رہے ہوں تو حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ تاجروں کو ذخیرہ کی گئی اشیاء فروخت کرنے کا حکم دے، اگر وہ حکم کی تعمیل نہ کریں تو حکومت ان کی مرضی کے خلاف خود بھی مارکیٹ ریٹ پر فروخت کر سکتی ہے۔

جیسا کہ الموسوعۃ الفقھیۃ، ج2، ص95 میں ہے:

"جب عوام کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہو تو حاکم ذخیرہ اندوز کو مجبور کرے گا بلکہ اس سے ذخیرہ شدہ مال لے کر فروخت کر دے گا اور اس (ذخیرہ اندوز) کو اس مال ہی کا مثل جب موجود ہو یا اس کی قیمت دے گا۔ اتنی بات تمام ائمہ میں متفق علیہ ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے"۔

چوتھی صورت:

یہ ہے کہ حکومت کو مقاصد عامہ کے لئے کسی جگہ (جیسے دوکان، گھر وغیرہ) یا کسی چیز کی حقیقی ضرورت ہو اور مالکان بیچنے پر آمادہ نہ ہوں تو حکومت وہ جگہ یا چیز زبردستی بھی حاصل کر سکتی ہے، تاہم حکومت پر فرض ہو گا کہ مالکان کو مارکیٹ ریٹ کے حساب سے قیمت کی ادائیگی کرے۔ البتہ حکومت بازاری قیمت ادا کئے بغیر کسی شہری کو اس کی جائیداد و ملکیت سے محروم نہیں کر سکتی۔

چوتھا مسئلہ: بیع التلجئۃ (مجبوری میں کی جانے والی غیر حقیقی بیع) کا حکم

فقہاء کی اصطلاح میں بیع التلجئۃ سے مراد وہ معاملہ ہے جس میں فریقین (خریدار و فروخت کنندہ) دلی ارادہ کے بغیر، محض دکھلاوہ کی غرض سے ایک تصوّراتی سودا کریں اور حقیقت میں اُس کا کوئی ارادہ و حیثیت نہ ہو، اور اس سے عاقدین کا مقصد ظالم حاکم یا کسی دشمن کے خوف سے بچنا ہو لیکن تمام ارکان و شرائط بیع کی تکمیل کے ساتھ حیلہ کے طور پر یہ سودا کیا جائے۔ اس بیع کو شافعیہ "بیع الأمانۃ" سے تعبیر کرتے ہیں۔

کیا ایسی صورت میں شرعاً یہ بیع درست متصور ہو گی کہ نہیں؟؟ کیونکہ عاقدین کا مقصد اگرچہ اس سے حقیقی بیع نہیں ہے لیکن بیع کے تمام شرائط و ارکان پورے ہیں۔

ایسے عقد کے صحیح یا باطل ہونے کی دونوں آراء اہل علم میں موجود ہیں لیکن دلائل کی روشنی میں راجح و درست رائے یہی ہے کہ ایسا عقد شرعاً باطل ہے، کیونکہ:

باہمی و حقیقی دلی رضامندی اس عقد میں مفقود ہے، جو کہ کسی بھی بیع کی درستگی کے لئے بنیادی شرط ہے۔

معاملات و معاہدات میں اعتبار مقاصد و معانی کا ہوتا ہے نا کہ الفاظ و مبانی کا، جیسے مسائل بیوع میں مسلّمہ قاعدہ ہے کہ:

"العبرۃ فی العقود للمقاصد و المعانی لا للألفاظ و المبانی"۔

دوسری شرط: طرفین خرید و فروخت کی اہلیت و قابلیت رکھتے ہوں

یہاں اہلیت وقابلیت سے مراد یہ ہے کہ عاقد (خریدار یا فروخت کنندہ) اپنے مال وسامان سے متعلقہ امور میں تصرّفات کرنے کا اہل ہو اور وہ جو بھی تصرّف کرے وہ نافذ العمل ہو، اُس کا اعتبار کیا جائے اور اس کے تصرّفات حکم کے اعتبار سے نتائج واثر رکھتے ہوں۔

اہلیت وقابلیت کے لئے مندرجہ ذیل پانچ اوصاف کا موجود ہونا ضروری ہے:

پہلا وصف: وہ آزاد ہو غلام نہ ہو

کیونکہ غلام کا اپنے مالک کی اجازت کے بغیر خرید وفروخت کرنا شرعاً درست نہیں کہ وہ خود کسی کی ملکیت میں ہے جیسا کہ فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: ''جو کوئی غلام خریدے اور اس کے پاس مال ہو تو وہ اس کے خریدار مالک کی ملکیت ہے الا یہ کہ جس سے غلام خریدا گیا ہے وہ اسے مستثنیٰ رکھے''۔[6] (دور حاضر میں غلام کا تصور نہیں ہے لہٰذا اس حوالہ سے مسئلہ کی تفصیل سے اجتناب کیا گیا ہے)۔

دوسرا وصف: کہ وہ بالغ ہو، بچہ نہ ہو۔

تیسرا وصف: کہ وہ عقل مند وباشعور ہو، پاگل نہ ہو کیونکہ پاگل کا تصرّف درست نہیں۔

چوتھا وصف: کہ وہ سمجھدار ہو بے وقوف نہ ہو۔

جو اپنے مال میں صحیح تصرّف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، بے مقصد اشیاء میں پیسے لٹانے والا نہ ہو اور مال وزر کی صحیح قیمت اور ویلیو (Value) وغیرہ سے واقف ہو، جیسے سو کی چیز دس، بیس میں نہ بیچ ڈالے، لہٰذا بے وقوف کا تصرّف اُس کے سرپرست کی اجازت کے بغیر درست نہیں اور نہ ہی نافذ العمل ہے۔

بے وقوفی کا ضابطہ:

اہلِ علم نے معاملات میں بے وقوفی کی پہچان کا یہ ضابطہ بیان کیا ہے کہ: جو لین دین میں اچھے ومناسب کی سمجھ نہ رکھتا ہو یا پھر، اپنے عمل سے یہ ظاہر کرے کہ وہ اپنے مال میں بہتر مصرف کی پہچان نہیں رکھتا۔

نوٹ:

بے وقوفی سے مراد پاگل پن نہیں ہے، اگرچہ دونوں ہی تصرف کے قابل نہیں لیکن دونوں میں معنی واحکام کے لحاظ سے واضح فروق موجود ہیں۔

پانچواں وصف: اُس پر مالی تصرّفات میں کسی بھی قسم کی کوئی پابندی وروک نہ لگائی گئی ہو۔

اب خواہ یہ پابندی کسی دوسرے کی مصلحت کی غرض سے ہو۔

جیسے: قرضہ دینے والوں کی مصلحت کی خاطر، مقروض مفلس (کنگال) پر اسکے اپنے مال میں تصرف کرنے پر پابندی لگانا، یا جس کے پاس کچھ گروی رکھوا کر قرض لیا گیا ہو کی مصلحت کی خاطر گروی رکھنے والے پر پابندی لگانا کہ وہ اپنی گروی رکھی ہوئی چیز میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا، یا پھر ورثاء کی مصلحت کی خاطر مرض الموت میں مبتلا مریض پر اس کے اپنے مال میں ثلث (تیسرے حصہ) کی وصیت کرنے پر پابندی لگانا۔

یا یہ پابندی اُس کی اپنی مصلحت کی بناء پر عائد کی جائے۔

جیسے: مجنون، بچے اور بے وقوف و ناسمجھ پر اُن کے اموال میں تصرّف کرنے پر پابندی لگانا کہ وہ اپنے مال میں تصرف نہیں کر سکتے۔

مذکورہ پانچ اوصاف کو مدّ نظر رکھتے ہوئے عاقد کی اہلیت و نااہلی کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

اہلیت رکھنے والے عاقد میں ان پانچوں اوصاف کا ہونا ضروری ہے، اگر ان میں سے ایک وصف بھی مفقود ہوا تو عاقد شرعی اعتبار سے نااہل قرار پائے گا۔ اور اسے خرید و فروخت کی اجازت نہیں ہو گی۔

طرفین کی اہلیت سے متعلقہ چند ضروری وضاحتیں:

نابالغ بچہ کی طرف سے سودا (خرید و فروخت) کرنے کا حکم

اگر نابالغ بچہ ممیّز ہو یعنی صحیح اور غلط میں فرق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اُس کا اپنے مال میں تصرّف کرنا اپنے سرپرست کی اجازت سے درست ہے۔ (سرپرست کی اجازت شرط ہے)۔ اور یہی رائے راجح اور دلائل کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے، کیونکہ:

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے نابالغ بچہ کی جائداد، کاروبار و ملکیت اُس کی بلوغت سے پہلے اُس کے حوالہ کرنے سے منع فرمایا ہے الا یہ کہ اُس کا امتحان لیا جائے، اُسے آزمایا جائے (تھوڑا مال اُس کے سپرد کر کے، اُسے کوئی ایک آدھ سودا سونپ کے، اُس کے تصرّفات کا جائزہ لیکر دیکھا جائے) کہ وہ اس قابل بھی ہے کہ نہیں؟

ہاں اگر وہ صحیح اور غلط میں فرق کرنے کی صلاحیت رکھے اور سمجھداری کے قابل ہو جائے تو اُسے اپنے مال میں تصرّف کی اجازت ہے، اور ولی و سرپرست کی اجازت کی شرط کے ساتھ جو نقصان کے خدشات تھے وہ بھی دور ہو گئے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَابۡتَلُوا الۡيَتَامَىٰ حَتّٰىۤ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنۡ آنَسۡتُم مِّنۡهُمۡ رُشۡدًا فَادۡفَعُوا إِلَيۡهِمۡ أَمۡوَالَهُمۡ ۖ وَلَا تَأۡكُلُوهَا إِسۡرَافًا وَبِدَارًا أَن يَكۡبَرُوا ۚ وَمَن كَانَ غَنِيًّا فَلۡيَسۡتَعۡفِفۡ ۖ وَمَن كَانَ فَقِيرًا فَلۡيَأۡكُلۡ بِالۡمَعۡرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعۡتُمۡ إِلَيۡهِمۡ أَمۡوَالَهُمۡ فَأَشۡهِدُوا عَلَيۡهِمۡ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا﴾

النساء:6

ترجمہ:" اور یتیموں کو ان کے بالغ ہونے تک سدھارتے اور آزماتے رہو پھر اگر ان میں تم ہوشیاری اور حسن تدبیر پاؤ تو انہیں ان کے مال سونپ دو اور ان کے بڑے ہو جانے کے ڈر سے ان کے مالوں کو جلدی جلدی فضول خرچیوں میں تباہ نہ کردو مال داروں کو چاہیے کہ (یتیم کے مال سے) بچتے رہیں ہاں یتیم کا سرپرست اگر مسکین محتاج ہو تو دستور کے مطابق واجبی طرح سے کھالے، پھر جب انہیں ان کے مال سونپو تو گواہ بنالو دراصل حساب لینے والا اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے"۔

نوٹ:

یتیم اس بچہ کو کہتے ہیں کہ بلوغت سے پہلے جس کے والد فوت ہو جائیں۔

بچہ کو بالغ ہونے سے پہلے مالی تصرّفات کی اجازت عموماً اسوجہ سے نہیں دی جاتی کیونکہ اُس میں صحیح اور غلط کی پہچان، ان میں فرق کرنے کی صلاحیت اور معاملات کی مناسب سمجھ بوجھ نہیں ہوتی، لہٰذا اگر بچہ میں یہ علتِ ممانعت موجود نہ ہو اور مطلوبہ صلاحیت موجود ہو تو ممانعت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی، اور پھر ولی وسرپرست کی اجازت کی شرط بھی اس منفی احتمال کو ختم کر دیتی ہے۔

کیا ایک ہی شخص ایک ہی وقت میں بائع ومشتری یعنی خریدار اور فروخت کنندہ ہو سکتا ہے؟

اس مسئلہ کی وضاحت کچھ اس طرح سے ہے کہ ایک شخص کسی کو خرید وفروخت کے سلسلہ میں اپنا وکیل مقرر کرتا ہے:

اب اگر وہ وکیل اپنے مؤکل کی طرف سے کسی چیز کو خریدنے کا پابند ہے تو وہ وکیل خود اس مطلوبہ چیز کو اپنے مؤکل کو بیچتا ہے، یعنی وہ خود وکیل بن کر اپنے مؤکل کی طرف سے اُسے خرید بھی رہا ہے اور خود فروخت کنندہ بن کر اُسے بیچ بھی رہا ہے۔

اس کے برعکس اگر وہ وکیل اپنے مؤکل کی طرف سے کسی چیز کو بیچنے کا پابند ہے تو وہ وکیل خود اس مطلوبہ چیز کو اپنے مؤکل سے خرید لیتا ہے، یعنی وہ خود وکیل بن کر اپنے مؤکل کی طرف سے اُسے بیچ بھی رہا ہے اور خود خریدار بن کر اُسے خرید بھی رہا ہے۔

مذکورہ دونوں صورتوں کو آسان الفاظ میں یوں سمجھئے کہ:

ایک وکیل جو اپنے مؤکل کی طرف سے اس کی چیز بیچنے والا ہو تو کیا وہ اُسے اپنے لئے خرید سکتا ہے؟ یا وہ جو اپنے مؤکل کی طرف سے کوئی چیز خریدنے والا ہو تو کیا اپنی چیز اُسے بیچ سکتا ہے؟

یا اسکی تیسری صورت یہ ہے کہ: اُس وکیل کو اُس کا مؤکل ایک چیز۔ مثلاً ایک زمین بیچنے کا حکم دیتا ہے، اور اُس کا دوسرا مؤکل اُسے ایک زمین خریدنے کا حکم دیتا ہے تو وہ اُسی زمین کو (اپنے ایک مؤکل کے لئے) بیچتا بھی ہے اور اُسی زمین کو (اپنے دوسرے مؤکل کے لئے) خریدتا بھی ہے، اس طرح وہ اپنے دونوں مؤکلین کی طرف سے اُس ایک ہی زمین کا (وکیل ہونے کی حیثیت سے) خریدار بھی ہے اور فروخت کنندہ بھی۔

اس مسئلہ میں اہل علم میں سے کچھ جواز اور کچھ عدمِ جواز کی رائے رکھتے ہیں، جبکہ درست و قوی رائے یہی ہے کہ ایسا کرنا وکیل کے لئے جائز و درست ہے بشرطیکہ:

وکیل بازاری قیمت (Market Value) سے بہتر ڈیل اپنے مؤکل کو فراہم کرے۔ یعنی اگر وہ اپنے مؤکل سے خود خرید رہا ہے تو اُسے بازاری قیمت (Market Value) سے زیادہ میں خریدے اور اگر اپنے مؤکل کو اپنے پاس سے بیچ رہا ہے تو بازاری قیمت (Market Value) سے کم قیمت میں اُسے بیچے، تاکہ وکیل دھوکہ کی تہمت سے بری ہو سکے۔

یا پھر اپنے مؤکل کو معاملہ کی مکمل معلومات فراہم کرے اور سب کچھ اس کی اجازت و مرضی سے کرے۔

مذکورہ دونوں باتوں میں سے ایک کو اختیار کرنا لازم ہے وگرنہ وکیل کا عمل ناجائز اور قابل مذمت و گرفت ہوگا۔

مسئلہ مذکورہ میں جواز کی بنیادی دلیل یہ مستقل قاعدہ و ضابطہ ہے کہ: معاملات، لین دین و خرید و فروخت میں قاعدہ یہ ہے کہ وہ جائز ہے سوائے اس کے کہ جس کی حرمت شریعت بیان کرے، لہٰذا ایک ہی وقت میں وکیل کا بائع و مشتری ہونا بیان کردہ تفصیل کے مطابق جائز ہے کیونکہ اس کی حرمت شریعت سے ثابت نہیں ہے اور جہاں تک دھوکہ کے امکان کا تعلق ہے تو وہ مذکورہ شرط سے دور ہو جاتا ہے۔

تیسری شرط: خریدی و فروخت کی جانے والی چیز شرعی اعتبار سے خرید و فروخت کے قابل ہو

یعنی وہ پاک ہو، حلال ہو اور شرعی طور پر نفع بخش ہو۔

الغرض ثمن (قیمت) مثمن (سامان) دونوں شرعی اعتبار سے پاک اور حلال ہوں اور عام حالات میں شرعی طور پر اُس سے فائدہ بھی حاصل کیا جاسکتا ہو، کیونکہ جن سے عام حالات میں شرعاً فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا اُن کی خرید و فروخت ہر حال میں حرام ہے، جیسے شراب وغیرہ۔

(عام حالت سے مراد عمومی یعنی غیر اضطراری حالات ہیں، کیونکہ اضطرار و مجبوری میں کچھ چیزیں عارضی طور پر جائز ہو جاتی ہیں)۔

مذکورہ تینوں اوصاف (پاک ہونا، حلال، ہونا اور جائز نفع بخش ہونا) ان میں سے اگر ایک وصف بھی مفقود ہو تو اس چیز کی خرید و فروخت شریعتِ مطہّرہ میں جائز نہیں ہے۔

اس حوالے سے ایک اور مسقل قاعدہ ہے کہ:

"تمام حلال و پاک اشیاء کی خرید و فروخت مطلقاً جائز ہے، اسی طرح جن اشیاء سے نفع و فائدہ اٹھانا شرعاً صحیح و درست ہو تو ان کی خرید و فروخت بھی درست ہے سوائے اُن صورتوں میں جن میں شریعتِ مطہّرہ نے دیگر حکمتوں و مقاصد کے پیشِ نظر اُن کی خرید و فروخت کو جائز قرار نہیں دیا۔

جیسا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ مبارک ہے کہ:

یقیناً اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب (خمر)، مردار، خنزیر اور بت و مورتیوں کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے، کہا گیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مردہ جانور کی چربی کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں (یعنی کیا اس کی بیع بھی حرام ہے؟) جن کے ذریعہ لکڑی کی کشتیوں کی پیوند کاری کی جاتی ہے اور کھالوں کو دھن دیا جاتا ہے (تاکہ وہ نرم پڑ جائیں) اور لوگ اُن کے ذریعہ روشنی حاصل کرتے ہیں۔؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: نہیں وہ (چربی کی خرید و فروخت) بھی حرام ہے پھر اس وقت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (تین مرتبہ) یہ فرمایا کہ: اللہ یہودیوں کو ہلاک و برباد کرے جن پر اللہ تعالیٰ نے چربیوں کو حرام قرار فرمایا مگر اُنہوں نے (اُسے خود تو استعمال نہیں کیا بلکہ) اسے پگھلایا، پھر اُسے بیچا اور اُسکی قیمت کھا گئے"۔[7] اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یقیناً جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر کسی چیز کے کھانے کو حرام فرما دیتا ہے تو اُس قوم پر اُس کی قیمت کو بھی حرام فرما دیتا ہے، (یعنی اُسے بیچنا اور بیچ کر اُس کی قیمت کھانا بھی حرام ہے)۔[8]

اور شراب کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ مبارک ہے:
بے شک جس اللہ تعالیٰ نے شراب کے پینے کو حرام قرار دیا ہے اُس نے اُس کی خرید و فروخت، تجارت و کاروبار کو بھی حرام قرار دیا ہے۔

نوٹ:

گذشتہ حدیث میں میتۃ یعنی وہ حلال خشکی کا جانور جو بغیر ذبح کیے مر جائے اسے حرام قرار دیا گیا ہے لیکن دوسری روایات میں کچھ چیزیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جیسے:
جراد یعنی ٹڈی کا استثناء موجود ہے کہ جس کا کھانا، استعمال اور بیع بھی حلال ہے، ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: " ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چھے یا سات غزوات میں شرکت کی جن میں ہم آپ کے ساتھ ٹڈی کھاتے رہے"۔]9 [اسی طرح مردہ جانور کی کھال کو رنگ دیا جائے تو اسے بھی استعمال اور خرید او بیچا جا سکتا ہے جیسا کہ حدیث میں اس کا استثناء موجود ہے، البتہ بغیر رنگے مردہ جانور کی کھال بالاتفاق ناپاک ہے۔
اسی طرح اس کے وہ اجزاء جن پر زندگی اثر نہیں کرتی وہ بھی اس حرمت سے مستثنیٰ ہیں، جیسے بال، اون وغیرہ کا استعمال اور خرید و فروخت بھی جائز ہے۔ بشرطیکہ اُنہیں جسم سے لگی کھال یعنی جڑ سے الگ کر دیا جائے ورنہ وہ پاک و جائز نہ ہوں گے۔

حرام اشیاء میں شامل دیگر امور

شریعتِ مطہّرہ میں شراب، مردار، خنزیر بشمول اُس کے تمام اجزاء اور بت و مورتیوں کے علاوہ: جوّا، فال نکالنے کے تمام طریقے، حلال جانور کو ذبح کرتے وقت بہایا جانے والا خون اور بے مقصد، دلفریب اور غافل کرنے والی باتوں کی حرمت بیان کی گئی ہے"۔
شراب کے علاوہ دیگر منشیات اور مخدّرات کا بھی یہی حکم ہے۔ اسی طرح بتوں کے علاوہ باقی شرکیہ آلات بھی اس حرمت میں داخل ہیں۔ جب کہ بے مقصد، دلفریب اور غافل کرنے والی باتوں میں گانے، موسیقی اور اُس کے تمام آلات، گانوں اور موسیقی پر مشتمل آڈیو، ویڈیو کیسٹیں، سی ڈیز، فحاشی و عریانیت پر مشتمل رومانوی ناول، فحش لٹریچر سب شامل ہیں، جبکہ جادو اور علمِ نجوم کی تعلیم پر مبنی کتابیں اور اسی طرح تمام باطل افکار و نظریات پر مشتمل کتب، مذکورہ تمام اشیاء کی تجارت حرام ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر اُس چیز کی بیع جو شرعی اعتبار سے ناپاک ہو یا حرام کردہ ہو یا عام حالات میں اُن سے شرعی طور پر فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا تو وہ جائز و درست نہیں ہے ان سے کُلی اجتناب کرنا ہر مسلم پر واجب ہے

۔

چوتھی شرط: مال وزر فروخت کنند و خریدار کی ملکیت میں ہو

اس شرط سے مراد یہ ہے کہ: کسی بھی شخص کا کسی متعیّن شے پر کُلی ملکیت واختیار سے پہلے اس کا سودا کرنا جائز و درست نہیں ہے، اور اس ملکیت کے حکم میں مال اور زر دونوں شامل ہیں یعنی خریدنے والے کا مال اُس کی ذاتی ملکیت ہو اور اُسے اس میں تصرّف کا اختیار ہو اور بیچنے والے کا سامان اُس کی ذاتی ملکیت میں ہو۔

ہمارے معاشرے میں یہ بات بہت عام ہے کہ لوگ اس چیز کا سودا طے کر لیتے ہیں جو سودے کے وقت اُن کی ملکیت میں نہیں ہوتی یعنی انہوں نے اُسے خریدا ہی نہیں ہوتا بلکہ اُن کا مقصد بعد میں مارکیٹ سے خرید کر اسے خریدار تک پہنچانا ہوتا ہے جو کہ شرعاً ایک ناجائز عمل ہے، کیونکہ اس میں نقصان کے کافی احتمالات ہیں، جیسے: اُس چیز کا مارکیٹ سے ہی ختم ہو جانا، جس قیمت پر اُس نے سودا کیا ہو وقتِ خرید اُس قیمت کا بڑھ جانا وغیرہ وغیرہ، اور پھر اس کے نتیجہ میں تنازع، نفرت، عداوت و فساد بھی ہو سکتا ہے، لہٰذا مال وزر، عزت و جان کی حفاظت کی خاطر شریعت ایسے کاموں سے سختی سے روکتی ہے۔

قرآن حکیم میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ﴾

النساء:29

ترجمہ: " اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، درست صورت یہ ہے کہ باہمی رضامندی سے آپس میں لین دین ہو۔"

اور باطل طریقے سے مال کھانے کی صورتوں میں سے ایک صورت یہ بھی ہے۔

اسی طرح یقیناً کوئی شخص بھی اس بات پر راضی نہیں ہوگا کہ کوئی دوسرا اُس کے مال میں تصرّف کرے اور اُسے بیچ ڈالے۔ صورتِ ہذا میں بیچنے والا کسی دوسرے کے مال کو جو ابھی اِس کی ملکیت میں نہیں آیا اُسے بیچ رہا ہے جو مالِ غیر میں تصرّف کے مترادف ہے۔

سیدنا حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ: میرے پاس ایک آدمی آتا ہے جو مجھ سے ایسی چیز کا سودا کرنا چاہتا ہے جو میرے پاس نہیں ہوتی۔ کیا میں اس چیز کا اس سے سودا کر لوں پھر وہ چیز بازار سے خرید کر اسے دے دوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا: جو چیز تمہارے پاس (یعنی تمہاری ملکیت میں، یا قدرت واختیار میں) موجود نہیں اُسے فروخت نہ کرو"۔[10]

نوٹ (الف)

خرید وفروخت کی جانے والی شے دو قسم کی ہوتی ہے:

(1) کبھی تو متعیّن و محدّد ہوتی ہے، جسے دیکھا جا سکتا ہو، جیسے کوئی کہے کہ: میں تمہیں یہ گاڑی جو اُس کی نظروں کے سامنے ہو، جو Honda کمپنی کی ہے جس کا نام Civic ہے اسے بیچتا ہوں۔

(2) اور کبھی وہ شے متعین نہیں ہوتی بلکہ اس کی مخصوص قسم کی صفات واضح ہوتی ہیں، لیکن وہ شے نہ ہی سامنے ہوتی ہے اور نہ ہی اُسے دیکھا جا سکتا ہے، جیسے کوئی کہے کہ میں تمہیں فلاں کمپنی کی فلاں صفات والی گاڑی بیچتا ہوں۔

مذکورہ روایت میں سیدنا حزام رضی اللہ عنہ کے سوال سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا سوال پہلی قسم سے تھا یعنی متعین شے کے سودے کے حوالہ سے تھا، جس کا معنی ہے کہ اگر خرید وفروخت کی جانے والی چیز متعیّن ہو تو ایسا سودا ملکیتِ کاملہ سے پہلے جائز نہیں۔

مسئلہ بیع السلم یا بیع السلف

لیکن اگر چیز کے تعیّن کی بجائے اُس کی مخصوص صفات بیان ہوں اور بیچنے والا اسے مستقبل کی ایک خاص مدّت کے اندر (جس میں فریقین کا اتفاق طے پائے) مہیّا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ اُس کی مکمل قیمت پیشگی ادا کر دی جائے تو یہ سودا جائز ہے جسے شرعی اصطلاح میں

بیع السلم یا بیع السلف

کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی سورۃ البقرۃ، آیۃ نمبر: 282 اور صحیح بخاری و صحیح مسلم کی حدیث کی روشنی میں بیع سلم یا سلف صحیح و درست ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ مبارک ہے کہ: تم میں سے جو بھی بیع سلف (سلم) کرنا چاہتا

ہے تواُسے چاہیئے کہ وہ معلوم و متعیّن وزن وپیمانے (یعنی معلوم صفات)اور معلوم و متعیّن مدّت کے ساتھ کرے۔]11[

بیع سلم یہاں ہمارا موضوع نہیں، لہٰذا بیع سلم میں رأس المال اور مسلم فیہ والیہ وغیرہ سے متعلق شرائط واحکامات ودیگر تفصیل اس کے اپنے مقام پر دیکھی جاسکتی ہے، یہاں مذکورہ شرط کے حوالہ سے جو ضروری وضاحت تھی وہ کردی گئی ہے۔]12[

یہاں یہ بھی معلوم ہو کہ اگر قیمت ومال دونوں ہی ادھار پر ہوں، تو یہ

''بیع الکالی بالکالی''

ہو جائیگی جو شرعاً ناجائز ہے۔

نوٹ(ب):

مذکورہ شرطِ ملکیت کے حکم سے چار قسم کے لوگ مستثنیٰ ہیں

جو مالک تو نہیں بلکہ مالک کے قائم مقام تصوّر کیے جاتے ہیں اور وہ ملکیت کی مذکورہ شرط سے اس طور سے مستثنیٰ ہیں کہ وہ مال وزر میں ذاتی ملکیت رکھے بغیر کچھ شروط وقیود کے ساتھ خرید وفروخت اور تصرّف کے مجاز ہیں، اور وہ درج ذیل ہیں:

(1)

وکیل(Agent)۔

(2)وصی۔

(3)ناظر) :نگہبان،(Supervisor۔

(4)ولی) سرپرست،(Guardian۔

ان چاروں کی مختصراً وضاحت درج ذیل ہے:

وکیل :(Agent)وہ شخص جسے مالک کی طرف سے اُس کی زندگی میں اُس کے مال میں تصرّف کی اجازت و اختیار دیا گیا ہو، یا: جو اپنے مالک کی طرف سے کسی متعین چیز کی خریداری یا فروخت کے لئے مقرر ہو۔

جیسے مینیجر، بروکر اور ایجنٹ وغیرہ، مثال کے طور پر مالک ایک شخص کو اپنی کوئی جائداد، یا گاڑی وغیرہ دیکر اُسے اس کے بیچنے کی ذمہ داری سونپ دے۔ وہ شخص مالک کی طرف سے اس کی متعیّن چیز کا وکیل ہو گا اور اسکی بیع بھی درست ہو گی۔

وصی: وہ شخص جسے مالک کے اپنے مکمل مال کے ثلث (تیسرے حصے) میں کی ہوئی وصیت میں، اس کی موت کے بعد تصرّف کی اجازت واختیار دیا گیا ہو۔

یہ بھی عرفِ عام میں وکیل ہی ہوتے ہیں لیکن انہیں عربی میں وصی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ وصیت کے مال میں تصرف کا اختیار رکھتے ہیں۔ جیسے ایک شخص اپنے ثلث المال میں سے کسی خاص مصرف مثلاً فی سبیل اللہ کی مد میں پیسہ دینا چاہتا ہو اور وہ کسی خاص شخص کو اپنا وصی مقرر کرے تو وہ وصی، وصیت کئے گئے مال کو فی سبیل اللہ کے مصارف میں سے کسی بھی مناسب مصرف میں خرچ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔

ناظر) نگہبان: (Supervisor اس سے مراد وہ شخص ہے جو کسی بھی وقف (Endowment) وٹرسٹ پر نگہبان وذمہ دار بنایا گیا ہو۔[13] اب اس وقف کا نگہبان، ذمہ دار (Supervisor) اس میں مطلوبہ ہدف کی تکمیل کے تصرّفات کا اختیار رکھتا ہے، جیسے ایک شخص اپنے کسی گھر کو فقراء ومساکین کے لیے وقف کر دیتا ہے اور اس کے معاملات دیکھنے کی ذمہ داری عبداللہ کو سونپتا ہے تو عبداللہ کو اس میں مطلوبہ مقصد کی تکمیل کے لئے تصرّف کا اختیار ہے۔

ولی) سرپرست،: (Guardian ولایت (سرپرستی) کی دو قسمیں ہیں: ولایتِ عامہ اور ولایتِ خاصہ۔

ولایتِ عامہ سے مراد: حکمران کی ولایت ہے، جیسے ملک کے وہ اموال، اراضی واملاک کہ جن کا کوئی مالک نہیں اُن کی ملکیت وتصرّف کا اختیار حاکم کے پاس ہوتا ہے، اسی طرح اس یتیم کے اموال واملاک کہ جس کا کوئی خاص ولی و سرپرست نہیں، اُن کی ولایت بھی حاکم کے پاس ہوتی ہے۔

ولایتِ خاصہ سے مراد: وہ ولایت ہے جو یتیم کے کسی خاص ولی وسرپرست کی ہوتی ہے، جیسے چچا کی ولایت اس کے یتیم بھتیجے پر۔ ایسی صورت میں یتیم اور اس کے مال کی کفالت اور سرپرستی اس کے خاص ولی کی ذمہ داری ہے جسے شریعت یتیم کے مال میں جائز وحلال طریقہ سے اس وقت تک تصرّف کی اجازت دیتی ہے جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے یا ممیز یعنی صحیح اور غلط میں فرق پہچاننے والا نہ ہو جائے۔

ولی اور وکیل میں فرق:

مذکورہ چاروں صورتوں میں ملکیت نہ ہونے کے باوجود تصرّف کا اختیار حاصل ہے لیکن پہلی تین صورتیں وکالت ہیں جن میں تصرف کا اختیار مالک کی طرف سے حاصل ہوتا ہے جبکہ چوتھی صورت میں یعنی ولی کو تصرّف کا اختیار شرع کی طرف سے حاصل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

پانچویں شرط: خریدی ہوئی چیز کو قبضہ میں لینا اور قبضہ سے قبل اُسے فروخت نہ کرنا

خرید و فروخت کی شرائط میں سے ایک اہم و بنیادی شرط جس سے آج عوام الناس بالخصوص کاروباری و تاجر حضرات بہت غفلت برتتے ہیں وہ قبضہ و انتقال سے قبل ہی خریدی ہوئی شے کا آگے سودا کر دینا یعنی اُسے بیچ دینا ہے جو شرعی لحاظ سے ناجائز عمل ہے۔

لہٰذا خریدا ہوا مال قبضہ میں لیں اور اُسے خریدی ہوئی جگہ سے کسی دوسری جگہ منتقل کریں اور پھر اُسے آگے جہاں چاہیں فروخت کریں، قبضہ سے پہلے اور خریدی ہوئی جگہ پر بیچنا دونوں ہی شرعاً ممنوع ہیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ”جو شخص غلہ خریدے، تو اُسے اس وقت تک فروخت نہ کرے جب تک کہ وہ پوری طرح اُسے اپنے قبضہ میں نہ کر لے“۔[14] اسی طرح صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں غلہ خریدتے تو ہمارے پاس (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے) ایک شخص کو بھیجا جاتا جو ہمیں حکم دیتا کہ ہم اُسے بیچنے سے پہلے خریدی ہوئی جگہ سے اُٹھا کر کسی دوسری جگہ منتقل کر لیں“۔[15]

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خریدی ہوئی جگہ پر فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے یہاں تک کہ تاجر اُسے اپنے مقامات پر منتقل کر لیں“۔[16]

قبضہ سے قبل فروخت کی ممانعت کی علت

یہ عمل آج اتنا عام ہو گیا ہے کہ درآمد کی جانے والی اشیاء ملک میں آتے آتے کئی جگہ فروخت ہو چکی ہوتی ہیں، جو اسلامی شریعت میں ایک مذموم عمل ہے۔

اس کے دنیاوی نقصانات میں سے اہم ترین نقصان یہ ہوتا ہے کہ چونکہ وہ منزل تک پہنچتے پہنچتے کئی ہاتھوں میں فروخت ہو چکی ہوتی ہے اس لئے جب وہ گھر میں پہنچتی ہے تو اُس کی انتہائی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے جس کی وجہ سے مارکیٹ میں چڑھاؤ آتا ہے جو غریب و متوسط طبقہ کے لئے بالخصوص ظلم کے مترادف ہے۔

اور دوسرا بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بار برداری کے شعبہ سے وابستہ مزدوروں کا روزگار متاثر ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ حکمت و بصیرت، دور اندیشی اور عدل وانصاف پر مشتمل اسلامی شریعت اس عمل کی بلکہ ہر اُس عمل کی سختی سے مذمت کرتی ہے جو عدل وانصاف کے تقاضوں پر پورا نہ اترے، بلکہ معاشرے میں موجود متوسط اور غریب افراد پر ناحق بوجھ اور ظلم وزیادتی کا باعث بنے۔

گذشتہ اسباب کے علاوہ شریعت میں اس کی حرمت کا بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ یہ بیع الغرر (Uncertainty اور جہالت، ودھوکہ) میں سے ہے اور بیع الغرر سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

بیع الغرر سے مراد وہ بیع ہے جس میں کسی بھی لحاظ سے جہالت (لاعلمی)، یا دھوکہ ہو، یا جس میں بیچی یا خریدی جانے والی چیز کا ذریعہ حصول معلوم نہ ہو یا اس کی حقیقت یا مقدار معلوم نہ ہو۔

اور جب تک انسان کے قبضہ میں مال نہیں آجاتا اس وقت تک اس کی حقیقت مجہول ہی کے حکم میں ہے جو کہ غرر ہے، اور غرر اس طور پر بھی ہے کہ قبضہ سے قبل فروخت کرنے والا اگر اُسے سستی قیمت میں بیچتا ہے اور خریدار کو وہ چیز حاصل ہو جاتی ہے تو وہ فائدہ مند ہوگا وگرنہ نقصان میں، اور فائدہ ونقصان کے درمیان یہی غرر ہے۔

اس کے علاوہ اس میں سود کی مشابہت بھی پائی جاتی ہے، جیسا کہ سیدنا ابن عبّاس رضی اللہ عنہ اس کی ممانعت کی علت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ذاک دراھم بدراھم والطّعام مرج'' کہ ''یہ درہم کے بدلے درہم کا لین دین ہے جبکہ (خریدا ہوا بغیر قبضہ میں لیا) غلہ وہیں اپنی جگہ موجود ہے''۔یعنی یہ سودا ایک طرح سے نقدی کا لین دین ہی ہے، جیسے کسی نے ایک لاکھ میں غلّہ خریدا اور اسے اپنے قبضہ میں لئے بغیر اور منتقل کیے بغیر وہیں ایک لاکھ دس ہزار میں بیچ دیا گویا ایک لاکھ کی نقدی کے بدلہ دس لاکھ کی نقدی کا سودا کر کے منافع کمایا۔

امام ابن قیّم رحمہ اللہ نے اس حوالہ سے انتہائی مفید گفتگو فرمائی ہے، آپ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ عمل ممنوع اس لئے ہے کہ: خریدار کا خریدی ہوئی چیز پر اُسے منتقل کیے بغیر نہ تو قبضہ مکمل ہوا ہے اور نہ ہی فروخت کنندہ سے تعلق کُلّی طور پر ختم ہوا ہے، لہٰذا جب فروخت کنندہ کو یہ معلوم ہوگا کہ اُس سے خرید کر آگے فروخت کرنے والے کو اس سے خوب نفع حاصل ہو رہا ہے تو وہ قبضہ دینے میں حیل وحجت سے کام لے گا یا پھر وہ سودا ختم بھی کر سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ سودا ختم کرنے کے لئے بات تنازع تک اور پھر عداوت ودشمنی تک جا

پہنچے جیساکہ واقعات اس کے شاہد ہیں۔چنانچہ حکمت پر مبنی شریعتِ کاملہ کی یہ خوبی ہے کہ اس نے خریدار پر یہ شرط عائد کر دی ہے کہ وہ خریدی گئی چیز پر اس وقت تک کوئی تصرّف نہ کرے جب تک اُسے فروخت کنندہ سے لیکر اپنے قبضہ میں نہ لے لے اور فروخت کنندہ سے اس کا مکمل تعلق ختم نہ ہو جائے،تاکہ وہ سودا فسخ(ختم) کرنے یا قبضہ نہ دینے کا سوچ بھی نہ سکے۔یہ وہ حکمتیں وفوائد ہیں جن کو شارع نے نظرانداز نہیں کیا،یہاں تک کہ شریعت کا علم نہ رکھنے والے تاجر وکاروباری حضرات بھی اُنہیں تسلیم کرتے ہیں کیونکہ ان کے خیا ل میں بھی ایک طرف مصلحت اس کی متقاضی ہے اور دوسری طرف معاملات میں موجود فساد وخرابیوں کا خاتمہ بھی اسی طرح ممکن ہے۔]17[

بعض اہلِ علم کے نزدیک مکمل قبضہ کے لئے خریدی گئی شے کا کسی دوسری جگہ منتقل کرنا ضروری نہیں بشرطیکہ فروخت کنندہ کی طرف سے خریدار کو خریدی گئی شے میں تصرّف کا مکمل اختیار حاصل ہو اس طور پر کہ:

خریدی گئی چیز کا نفع بھی اور نقصان کی ذمہ داری بھی دونوں خریدار کی طرف منتقل ہو جائیں۔کیونکہ عموماً خریدار کے قبضہ میں آنے تک خریدی ہوئی چیز کی ذمہ داری فروخت کنندہ(بیچنے والے) کی ہوتی ہے اور اُسے خریدار تک صحیح وسالم بحفاظت پہنچانا فروخت کنندہ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

اوران لوگوں کی دلیل رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے:

لاُربْحَ مَالَم یضْمَن

جامع الترمذي: كتاب البيوع، باب ماجاء في كراهية ماليس عندك (امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ھے)

کہ ” اُس چیز کا منافع جائز ہی نہیں کہ جس میں نقصان کی ذمہ داری نہ لی گئی ہو“۔

اس روایت کی روشنی میں ان کا کہنا ہے کہ قبضہ سے قبل فروخت کی ممانعت کی علتِ نقصان کا خدشہ ہے اور جب نقصان کی ذمہ داری خریدار کی طرف منتقل ہو گئی تو علتِ ممانعت بھی ختم ہو گئی لہٰذا اس صورت میں قبضہ و منتقلی سے قبل فروخت کرنا جائز ہوا۔

مذکورہ استدلال درج ذیل وجوہات کی بناء پر درست نہیں:

امام ابن قیّم رحمہ اللہ ان کی بیان کی ہوئی علت کی تردید اور نقصان کی ذمہ داری خریدار کی طرف منتقل ہونے کے باوجود اسے ناجائز قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس کی علت (کے تعین) نے بعض فقہا کو مشکل میں ڈال دیا ہے، حالانکہ یہ شریعت کے محاسن میں سے ہے کہ جب پوری طرح قبضہ نہیں ہو گا اور فروخت کنندہ (بیچنے والے) کا اس سے تعلق ختم نہیں ہو گا تو وہ مشتری (خریدنے والے) کو فائدہ ہوتا دیکھ کر معاملہ منسوخ کرنے اور قبضہ نہ دینے کا لالچ کرے گا۔ اور اگر قبضہ دے گا بھی تو آنکھیں بند کر کے اور نفع سے محرومی کا افسوس لئے ہوئے دے گا، چنانچہ اس کا نفس ادھر ہی متوجہ رہے گا، اس کا طمع ختم نہیں ہو گا، یہ مشاہدے سے ثابت ہے، لہٰذا یہ شریعت کا کمال اور خوبی ہے کہ خریدار جب تک چیز کو حاصل نہ کر لے اور وہ اس کی ذمہ داری میں نہ آ جائے، اُس سے حصولِ نفع ممنوع ہے تاکہ فروخت کنندہ سودا منسوخ کرنے سے مایوس ہو جائے اور سودے سے اُس کا تعلق ختم ہو جائے]''18[

ممانعت سے متعلقہ فرامین رسول صلی اللہ علیہ وسلم جن میں فروخت کرنے سے پہلے خریدی ہوئی شے کے قبضہ اور اُسے منتقل کرنے کو شرط قرار دیا گیا ہے۔

صحابہ کرام □ بھی اسی کے قائل و فاعل تھے جیسا کہ ممانعت کے تحت مذکورہ روایات سے ظاہر ہے۔

قبضہ وانتقالِ ملکیت کے بغیر فروخت کرنے میں غرر ہے۔

قبضہ وانتقالِ ملکیت کے بغیر فروخت کرنا سود کے لین دین کے مشابہ ہے جیسا کہ سیدنا ابن عباس کا فرمان ذکر کیا گیا۔

نوٹ:

صحیح قول کے مطابق خریدی گئی چیز کو فروخت کرنے سے پہلے اس کے قبضہ و نقل و حمل کا حکم صرف غذائی اجناس کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس میں وہ تمام اشیاء داخل ہیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتی ہیں، جیسا کہ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے جس میں غلے کی بجائے سامان کا تذکرہ ہے۔

البتہ وہ اشیاء جن کی نقل و حمل ممکن نہیں جیسے اراضی اور مکانات وغیرہ، ان میں قبضہ کا معنی صرف اتنا ہے کہ ہر قسم کی کاغذی کاروائی کو مکمل کیا جائے اور فروخت کنندہ تمام رکاوٹیں دور کر کے خریدار کو تصرف کا پورا موقع فراہم کر دے۔ اسی طرح جو اشیاء ہاتھوں ہاتھ لے کر قبضہ کی جاتی ہیں جیسے کرنسی نوٹ، وغیرہ تو ان کا قبضہ یہ ہے کہ ان کو ہاتھوں میں وصول کر لیا جائے۔

چھٹی شرط: خریدی و فروخت کی جانے والی شے سے متعلق مکمل علم رکھنا

خرید وفروخت کی شرائط میں آخری شرط یہ ہے کہ: جس چیز کو خریدا یا فروخت کیا جارہا ہے، اس سے متعلقہ مکمل علم فریقین (خریدار وفروخت کنندہ) کو حاصل ہو۔

خرید وفروخت کی جانے والی شے کا علم اُس سے متعلقہ تین چیزوں کی مکمل معرفت سے حاصل ہوتا ہے:

(1) خریدی یا فروخت کی جانے والی چیز کیا ہے؟ (جس کی معرفت زبان سے اُس کا نام لے کر یا اس کی وضاحت کے ذریعہ یا اشارہ کے ذریعہ حاصل ہو گی)۔

(2) مقدار یعنی وزن وپیمانہ کی معرفت۔ (اگر خرید وفروخت کی جانے والی چیز کا تعلق وزن وپیمانہ سے ہو)۔

(3) صفات کی معرفت۔ (اگر خریدی وفروخت کی جانے والی چیز کا تعلق اس کی صفات کی معرفت سے ہو یا وہ چیز سامنے موجود نہ ہو)۔

مذکورہ اشیاء کی مختصر وضاحت

مذکورہ تینوں اعتبار سے طرفین کو سودے، اُس کی نوعیت، جنس، مقدار اور مکمل صفات سے متعلقہ کُلی علم ہونا لازمی ہے، ان میں کسی بھی طرح کا ابہام، شبہ یا لاعلمی شرعی اعتبار سے بیع کو مشکوک بنادیتی ہے، جسے شرعی اصطلاح میں "غَرَر" (Uncertainty) سے تعبیر کیا جاتا ہے جو شرعاً ناجائز ہے اور جس کی وضاحت سابقہ سطور میں گذر چکی ہے۔

خرید وفروخت کی جانے والی شے کا علم

سب سے پہلے شے کا تعیّن ہونا چاہئے خواہ وہ اس کا نام لیکر کیا جائے یا اس کی طرف اشارہ کر کے اور اس حوالہ سے طرفین میں سے کسی کو کسی بھی قسم کا کوئی مغالطہ یا شبہ نہ ہو ورنہ بیع درست نہ ہو گی۔

مقدار کا علم

یعنی وزن وپیمانہ کی معرفت، تو اس میں وہ تمام اشیاء شامل ہیں جن کی خرید وفروخت وزن، ناپ تول کے حساب سے کی جاتی ہے جیسے کھانے پینے کی اشیاء اور سائل مادّہ وغیرہ۔ ان اشیاء کی بیع اُس وقت تک درست اور مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ طرفین میں وزن، ناپ تول کے حوالہ سے اتفاق واطمینان نہیں ہو جاتا۔

ناپ تول اور وزن میں کمی کرنا

یہاں فروخت کنندہ کو خاص اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ جان بوجھ کر وزن یا ناپ تول میں کمی نہ کرے، کیونکہ یہ عمل دھوکہ دہی کی بدترین قسم ہے جو انتہائی بڑا گناہ، غضبِ الٰہی کے نزول، برکت کے خاتمہ اور معاشرے میں بگاڑ، فتنہ و فساد کا ذریعہ ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ (1) الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ (2) وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ)3(﴾

المطففين: 1-3

ترجمہ: "ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے ہلاکت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب اُنہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں"۔

سابقہ قوموں میں قومِ شعیب علیہ السلام پر عذابِ الٰہی کے نزول کی بنیادی وجہ شرک وبدعقیدگی کے بعد یہی ناپ تول میں کمی کرنا تھا، وہ بدبخت آسودگی و امیری کے باوجود اس لعنت میں مبتلا تھے جس کا انجام اُن کی بربادی کی صورت میں ہوا۔

اس کے علاوہ نبی مکرّم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی قوم پر ظالم حکمرانوں کے تسلّط اور اس قوم کی غربت، فقیری اور لاچارگی کا بنیادی سبب اسی قبیح عمل ناپ تول میں کمی کو قرار دیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لم ينقصوا المكيال والميزان إلا اخذوا بالسنين وشدة المؤنة وجور السلطان عليهم

سنن ابن ماجه: كتاب الفتن، باب العقوبات (یہ روایت صحیح ہے)

ترجمہ: "جو قوم بھی ناپ تول میں کمی کرتی ہے تو اس پر قحط سالی، سخت محنت و مشقّت (تنگی) اور حکمرانوں کا ظلم مسلط کر دیا جاتا ہے"۔

لہٰذا ناپ تول میں کمی کرنے والا اس بات کو ہمیشہ اپنے مدّ نظر رکھے کہ وہ تھوڑے سے دنیاوی عارضی مفاد کی خاطر حقیقت میں اپنی برکت، اطمینان و سکون ختم کر رہا ہے اور نہ صرف اپنی دنیا و آخرت برباد کر رہا ہے بلکہ معاشرے میں عذابِ الٰہی کے نزول کا ذریعہ بھی بن رہا ہے۔

صفات کا علم

اسی طرح شئے سے متعلّقہ صفات کی معرفت بھی اس لئے ضروری ہے تاکہ بعد میں اسے لیکر طرفین کے درمیان کسی بھی قسم کا کوئی تنازع پیدا نہ ہو جائے۔ خریدار کو چاہئے کہ خریدنے سے پہلے اُس کی مکمل صفات اچھی طرح معلوم کرلے۔اور فروخت کنندہ کو چاہئے کہ مطلوبہ صفات کی مکمل وضاحت کرے۔

جان بوجھ کر عیب چھپانا

فروخت کنندہ کا جان بوجھ کر اپنے سامان سے متعلقہ کسی بھی صفت کو چھپانا اور خریدار سے اُسے مخفی رکھنا درست نہیں ہے،اپنے سامان میں عیب کا علم ہوتے ہوئے بھی اُسے خریدار سے چھپانا ایک نہیں کئی بڑے گناہوں کا ارتکاب ہے جیسے جھوٹ، دھوکہ دہی، فریب، کسی دوسرے کو نقصان پہنچانا اور اُس نقصان کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات کا وبال بھی اسی فروخت کنندہ کو حاصل ہوگا،اب اندازہ لگائیے کہ گناہوں اور نقصانات کے نا ختم ہونے والے سلسلہ کے مقابلہ میں عیب چھپا کر اپنی چیز کو بیچ کر حاصل ہونے والے فائدہ کی کتنی اہمیت باقی رہ جاتی ہے ؟سچ بول کر حاصل ہونے والا تھوڑا فائدہ دنیا وآخرت میں حاصل ہونے والی، بے برکتی، بے اطمینانی اور رسوائی وذلت سے کہیں بہتر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:"اگر وہ دونوں (فروخت کنندہ و خریدار) سچائی کو اپنائیں اور ایک دوسرے پر حقیقتِ حال واضح کردیں تو ان کا سودا بابرکت ہوگا اور اگر دونوں نے عیب کو چھپایا اور جھوٹ کو اپنایا تو ان کے سودے سے برکت ختم کردی جائے گی]"19[

بعض بیچنے والے اپنی چیز کا نقص جانتے ہوئے بھی واضح نہیں کرتے بلکہ اس کی ذمہ داری خریدار پر ڈال دیتے ہیں کہ جی آپ خود ہی دیکھ لیں،اگر بعد میں کوئی خرابی نکلی تو ہم ذمہ دار نہ ہوں گے، معلوم ہو کہ اُن کا یہ طریقہ خلافِ شریعت ہے۔ نبی مکرّم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:" ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔اور کسی بھی مسلم کے لئے یہ حلال وجائز نہیں کہ وہ اپنی چیز میں موجود عیب کی وضاحت کئے بغیر اُس کا سودا اپنے بھائی کے ساتھ کرے"۔]20[

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص سے بیزاری ولاتعلقی کا اظہار فرمایا ہے جو چیز کا عیب ظاہر کیے بغیر اُسے فروخت کردیتا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:" ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلّے کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ اس ڈھیر میں داخل کیا۔آپ کی اُنگلیوں نے گیلا پن محسوس کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:اے غلّے والے!یہ کیا ہے ؟اُس نے کہا:اے اللہ

کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم !اس پر بارش پڑ گئی تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے اس بھیگے ہوئے غلے کو اوپر کیوں نہ کر دیا تاکہ لوگ اسے دیکھ سکتے ؟اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"جس نے دھوکا دیا،اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے"۔[21]

آخر میں ربِّ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں تمام معاملات میں قرآن وحدیث کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

والعلم عنداللہ

[1]فقہ الحدیث، باب الشروط الصلاۃ 1/343

[2] سنن ابن ماجہ: کتاب التجارات، باب بیع الخیار۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے مذکورہ حدیث کو ارواء الغلیل میں صحیح قرار دیا ہے۔

[3]معیشت وتجارت کے اسلامی احکام، ص30-31

[4]اس روایت کو امام احمد نے مسند میں "اوّل مسند البصریین" حدیث نمبر:20578 میں بیان کیا ہے۔

[5]سنن الکبری للبیهقي: کتاب النفقات (یہ روایت صحیح ھے)

[6]سنن ابی داود: کتاب الاجارۃ، باب فی العبد یباع

[7]صحیح البخاري: باب بیع المیتة والأصنام، صحیح المسلم: باب تحریم بیع الخمر

[8]سنن أبي داؤد: باب في ثمن الخمر والمیتة

[9]صحیح البخاري: کتاب الذبائح والصید، باب أکل الجراد

[10]سنن أبي داؤد: کتاب الإجارة، باب في الرجل یبیع مالیس عنده (صحیح) سنن نسائي: 4617 باب بیع مالیس عند البائع

[11]صحیح البخاري: کتاب السلم، باب السلم في وزن معلوم.

[12]بیع السلم اور سلف کے حوالے سے مکمل بحث " البیان "کی اس خصوصی اشاعت میں موجود ہے جسے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

[13]وقف سے مراد:

ذاتی ملکیت کی کوئی بھی منافع بخش شے جیسے جائداد، کاروبار، فیکٹری، پیسہ یا کوئی بھی مد جسے کسی خاص مقصد کے لئے مقرر و متعیّن کیا گیا ہو۔ جیسے کوئی شخص اپنی جائداد میں سے کسی ایک حصہ کو ہمیشہ یا کسی خاص مدّت تک کے لئے

فقراء، یتیموں و بیواؤں کی کفالت یا دیگر خیری معاملہ کے لئے مختص کر دے، یا اس جائداد کو استعمال میں لاتے ہوئے اس سے حاصل ہونے والے منافع کو مختص کر دے وغیرہ، الغرض وقف کا بہت وسیع مفہوم ہے جو چھوٹی سطح سے لیکر بڑی سطح تک جا سکتا ہے۔

[14]صحيح البخاري: كتاب البيوع، باب الكيل على البائع و المعطي

[15]صحيح المسلم: كتاب البيوع، باب بطلان بيع المبيع قبل القبض

[16]سنن أبي داود: كتاب الإجارة، باب في بيع الطعام قبل أن يستوفي (صحيح لغيره)

[17]تهذيب: ج5، ص:137

2[18]تهذيب: ج5، ص154، 153

[19]صحيح البخاری: كتاب البيوع، باب مايمحق الكذب و الكتمان فی البيع

[20]رواه ابن ماجه: كتاب التجارات، باب من باع عيبًا فليبيّنه

[21]صحيح مسلم: باب قول النبي صلى الله عليه و سلم من غشنا

(14) حلال کمائی کی اہمیت و افادیت

فضیلۃالشیخ حافظ مسعود عالم حفظہ اللہ

الحمدللّٰہ رب العالمین و صلی اللّٰہ و سلم علی أشرف الأنبیاء و المرسلین محمد و علی آلہ و أصحابہ و من تبعھم باحسان إلی یوم الدین أشھد أن لا إلہ إلا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ و أشھد أن محمدا عبدہ و رسولہ و بعد!

حلال کمائی کیوں ضروری ہے؟

انسان اس دنیا میں جو اپنی زندگی کا دورانیہ گزار رہا ہے یہ دورانیہ بہت مختصر بھی ہے اور بہت اہم بھی ہے، انسان جب اس دنیا میں شعور کی آنکھ کھولتا ہے تو اس کا اپنے چار سو پھیلی ہوئی وسیع کائنات کے ساتھ سابقہ پیش آتا ہے، وہ اپنے آپ پر غور کرتا ہے تو یہ اپنی مرضی سے نہیں آیا، اسی طرح جس ماحول میں آیا ہے وہ بھی اس نے اپنی مرضی سے منتخب نہیں کیا، اپنی شکل و صورت قد و قامت کو دیکھتا ہے تو یہ چیزیں بھی ایسی ہیں کہ جن پہ اس کا کوئی اختیار نہیں، اس کا اپنا وجود اور یہ کائنات اس کی اس بات کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ جو کچھ بھی میرے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے اس کے بنانے میں میرا کوئی عمل دخل نہیں۔ نیز یہی چیز انسان کی یہ رہنمائی بھی کرتی ہے کہ وہ جانے کہ اس جہان کو پیدا کرنے والی ایک قادر مطلق اور علیم و خبیر رحیم و کریم ہستی ہے اور وہ اللہ ربّ العزت ہے۔ یہی آواز اس کے دل کی ہوتی ہے اور کائنات کی ہر چیز اس کی اسی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ اللہ ربّ العزت نے ایک عظیم مقصد کے لئے اسے دنیا میں پیدا فرمایا ہے، قرآن نے ہمیں یہ مقصد بتایا کہ انسان اللہ ربّ العزت کی بندگی کرے اور اس کائنات کے تمام وسائل، رزق کے خزانے، جو کچھ ہے یہ سب اس لئے بنایا گیا ہے کہ یہ سب اس بندگی کے عمل کو پورا کرنے کے لئے انسان کے ممدّ و معاون ثابت ہوں نیز یہ تمام وسائل جو اللہ ربّ العزت نے اس کائنات میں پیدا فرمائے ہیں ان میں انسان کے لئے امتحان اور ابتلاء بھی ہے اور اس لئے بھی پیدا فرمائے ہیں کہ یہ انسان کی رہنمائی کریں کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا ہی اس جہاں کا فرمانروا بھی ہے اور اس ساری کائنات کا پروردگار بھی، تمام انسانوں کا رب:

﴿فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾

یٰس: 83

ترجمہ: پس پاک ہے وہ اللہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے اور جس کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے۔

ہر چیز کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے سچا بادشاہ ہے، اس لئے انسان کو اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس کا پیدا کرنے والا اس جہاں کا بادشاہ اس کے لئے کونسا طرز عمل پسند کرتا ہے اسے راضی رکھنا ہوگا اور اس کی ناراضگی سے خود کو بچانا ہوگا، اللہ رب العزت نے اس حوالے سے وحی کے ذریعے بھی رہنمائی فرمائی ہے اور عقل و فطرت کے ذریعے بھی کہ انسان کو کونسا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے؟

دنیا میں اختیارِ انسانی اور معیشت

انسان اس دنیا میں بہت ساری صلاحیتیں، بہت اعلیٰ منصب لے کر آتا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾

الأنعام: 165

ترجمہ: وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا اور ایک کا دوسرے پر رتبہ بڑھایا تاکہ تم کو آزمائے ان چیزوں میں جو تم کو دی ہیں بالیقین آپ کا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بالیقین وہ واقعی بڑی مغفرت کرنے والا مہربانی کرنے والا ہے۔

اللہ ربّ العزت نے انسان کو زمین میں اختیار دیا ہے لیکن یہ اختیار لامحدود و مطلق نہیں ہے بلکہ محدود اختیار ہے۔ اللہ ربّ العزت نے انسان کو انتخاب کا اختیار دیا ہے اور انسان کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس دنیا میں اس اختیار کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی امانت سمجھ کر استعمال کرے اور اس کا ایسا استعمال نہ کرے کہ جس سے اللہ ربّ العزت ناراض ہو جائیں اور حق تعالیٰ شانہ کا غضب اس کا مقدر ٹھہرے۔

انسانی ضروریات اور کسبِ حلال

انسان کی زندگی کو باقی رکھنے اور اس کی جسمانی قوت کو بحال رکھنے، دنیا میں نسل انسانی کو باقی رکھنے کے لئے انسان کی ضروریات بہت ہیں، اللہ تعالیٰ جو پروردگارِ عالم ہے نے بڑے وسیع اور اعلیٰ پیمانے پر انسان کی ضروریات پوری کرنے کا انتظام فرمادیا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ﴾

الأعراف: 10

ترجمہ:اور بیشک ہم نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی اور ہم نے تمہارے لئے اس میں سامان رزق پیدا کیا تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔

اس زمین کے اندر انسان کے برتنے اور استعمال کرنے کے لئے سامان زندگی فراوانی کے ساتھ پیدا فرمادیئے ہیں، اللہ تعالی نے بہت بڑے خزانے اس دنیا کے اندر رکھے ہوئے ہیں جنہیں انسان استعمال کر سکتا ہے۔

اللہ رب العزت نے چونکہ انسان کو ایک اعلی مقام و مرتبہ عزت و کرامت کا عطا فرمایا ہے، اس لئے انسان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ رب العزت کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق اسے استعمال کرے جن چیزوں کے استعمال کا اللہ رب العزت نے راستہ کھولا ہے انہیں استعمال کرے اور جن سے روکا ہے ان چیزوں سے اپنے آپ کو بچا کے رکھے، اللہ تعالی نے انسان کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے سب کچھ پیدا کیا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَآتَاكُم مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۚ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ﴾

ابراهيم:34

ترجمہ:اسی نے تمہیں تمہاری منہ مانگی کل چیزوں میں سے دے رکھا ہے اگر تم اللہ کے احسان گننا چاہو تو انہیں پورے گن بھی نہیں سکتے یقیناً انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

اشیاء کائنات میں آزمائش

اس وسیع کائنات میں ایسی چیزیں بھی اللہ نے رکھ دی ہیں جو انسان کے امتحان اور ابتلاء کے لئے پیدا فرمائی ہیں کہ ان سے انسان نے بچنا ہے، یہ چیزیں اشیاء اور اعیان بھی ہیں جن سے انسان نے اپنے آپ کو بچا کے رکھنا ہے اور انسان کے تصرفات و اعمال بھی ہیں کہ جن کا انسان نے ارتکاب نہیں کرنا۔ اللہ ربّ العزت نے جن چیزوں کی ممانعت فرمائی اور حرام قرار دیا ہے یہ ممانعت اشیاء و اعیان اس کائنات کے اندر بنائی ہوئی چیزوں سے بھی متعلق ہیں لیکن بہت تھوڑی ہیں، اور دوسری چند ایک جن کی تفصیل آسمانی کتابوں اور ان کے جامع ترین مجموعے قرآن مجید کے اندر اللہ رب العزت نے محرمات کی تفصیل بیان فرمادی ہیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ﴾

الأنعام:119

ترجمہ: حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان سب جانوروں کی تفصیل بتادی ہے جن کو تم پر حرام کیا ہے مگر وہ بھی جب تمہیں سخت ضرورت پڑجائے تو حلال ہے۔

ان حرام کردہ چیزوں کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب انسان کیلئے حلال ہے۔

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾

البقرۃ:29

ترجمہ: وہ اللہ جس نے تمہارے لئے زمین کی تمام چیزوں کو پیدا کیا۔

سب کچھ اللہ نے تمہارے لئے بنایا ہے اور یہ آسمان وزمین اور اس کے درمیان میں پھیلا ہوا یہ سارا نظام جب حرکت میں آتا ہے تو انسان کو رزق ملتا ہے، اس کے بعد ہی انسان اپنے افعال وتصرفات اور اپنی زندگی کی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکتا ہے اس لئے انسان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اللہ رب العزت کی اس ہدایت کو پیش نگاہ رکھے۔ اس لئے کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اس کا عمل اور تصرف ہے اس کا معاملہ صرف یہ نہیں کہ کیا اور معاملہ ختم ہوگیا بلکہ یہ افعال اس کی ذات پر اثرانداز ہوتے ہیں اس کی آنے والی زندگی پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اس دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی ان افعال کے اثرات باقی رہتے ہیں۔ اور یہ انسان نہیں جانتا اس کے افعال وتصرفات کے اور اس کے استعمالات اور ان تحصیلات کے جو اس دنیا کے اندر وہ سمیٹتا اور جمع کرتا ہے وہ نہیں جانتا کہ کیا کچھ اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ لیکن اللہ رب العزت سب جانتے ہیں اس ذات پر کوئی چیز مخفی نہیں نہ ماضی کی نہ حال کی اور نہ مستقبل کی۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِن شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ﴾

ابراھیم:38

ترجمہ: زمین وآسمان کی کوئی چیز اللہ پر پوشیدہ نہیں۔

ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور ہر چیز سے باخبر ہے وہ جانتا ہے کہ انسان کے افعال وتصرفات کیا ہوتے ہیں اس لئے کرم کرتے ہوئے مہربانی کرتے ہوئے انسان کے ساتھ نوازش کا معاملہ فرماتے ہوئے اللہ نے اسے ایسے تصرفات سے روکا ہے جو دنیا وآخرت میں نقصان دہ ہوتے ہیں، اس لئے اس نے وہ چیزیں حرام ٹھہرادیں، ورنہ اللہ رب العزت کو کوئی مجبوری نہیں ہے صرف انسان کی بھلائی کے لئے اللہ رب العزت نے انسان کو ان چیزوں

سے روکا ہے۔ حلال کا دائرہ اللہ تعالیٰ نے بہت وسیع بنایا ہے کہ انسان اپنے تمام کھانے، پینے، رہنے پہننے اور اپنی نسل کے بڑھنے کے سلسلے قائم رکھ سکتا ہے۔ اور اہمیت حلال کی یہی ہے کہ اگر انسان اس شاہراہ کے اوپر چلنا چاہتا ہے جو اللہ رب العزت نے اس کے لئے تجویز فرمائی ہے جو سعادت کی راہ ہے اور دونوں جہاں کی فوز و فلاح کی راہ ہے اور وہ صراط مستقیم ہے، تو پھر انسان حلال کے دائرے کے اندر اپنے آپ کو محدود رکھے اور محرمات سے اپنے آپ کو بچا کے رکھے وگرنہ انسان کی زندگی صحیح راستے پہ نہیں گزرے گی اور اس کا انجام دنیا و آخرت کی تباہی کی صورت میں نکلے گا۔

سابقہ اقوام کی معیشت کے معاملے میں حکم عدولی اور اس کا انجام

اللہ رب العزت نے انسانوں کی رہنمائی کے لئے قرآن مجید میں یہ بیان فرمایا ہے کہ بعض اقوام جنہوں نے اللہ رب العزت کی ہدایت اور رہنمائی سے روگردانی کی اور اس کی مخالفت کی اور اس دنیا کے میں بالخصوص معاشی معاملات کے اندر اپنی من مانی کرنا چاہی اللہ رب العزت نے ان کا تذکرہ فرمایا کہ کس طرح وہ تباہی اور بربادی کا شکار ہو گئے انہیں وقت کے پیغمبر شعیب علیہ السلام نے یہی کہا تھا کہ:

﴿قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ وَلَا تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ ۚ إِنِّي أَرَاكُم بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ (84) وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (85) بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ) 86(﴾

ھود: 84-86

ترجمہ: انہوں نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور تم ناپ تول میں بھی کمی نہ کرو میں تمہیں آسودہ حال دیکھ رہا ہوں اور مجھے تم پر گھیرنے والے دن کے عذاب کا خوف (بھی) ہے۔ اے میری قوم! ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کرو لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں فساد اور خرابی نہ مچاؤ۔ اللہ تعالیٰ کا حلال کیا ہوا جو بچ رہے تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے اگر تم ایمان والے ہو۔

اسی طرح ایک اور کردار اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں ذکر فرمایا ہے، قارون کا کردار جو بڑا دولت مند تھا، اسے بھی یہی کہا گیا: فرمانِ باری تعالیٰ:

﴿وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ﴾

القصص: 77

ترجمہ: جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی اچھا سلوک کر اور ملک میں فساد کا خواہاں نہ ہو یقین مان کہ اللہ مفسدوں کو ناپسند رکھتا ہے۔

یعنی: اللہ رب العزت نے تمہارے اوپر بہت نوازشات فرمائی ہیں تجھے بھی چاہئے کہ تو حسن عمل کے دائرے کے اندر اپنے آپ کو محدود رکھے اور صراط مستقیم کو چھوڑ کر فساد مچانے والا راستہ اختیار نہ کرے لیکن اس پیمائش کی اس نے بھی پرواہ نہ کی اور اسی راستے کے اوپر قائم رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ:

﴿فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُ مِن فِئَةٍ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنتَصِرِينَ﴾

القصص: 81

انسان اللہ رب العزت کے متعین کردہ دائرہ سے ظلم وعدوان، بغی وطغیان کے ساتھ نکلتا ہے، تو پھر اپنی تباہی کو دعوت دیتا ہے، جیسا کہ اللہ رب العزت نے فرمایا:

انسان اللہ رب العزت کے متعین کردہ دائرہ سے ظلم وعدوان، بغی وطغیان کے ساتھ نکلتا ہے، تو پھر اپنی تباہی کو دعوت دیتا ہے، جیسا کہ اللہ رب العزت نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾

النساء: 29

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے آپس کے مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ مگر یہ کہ تمہاری آپس کی رضامندی سے ہو خرید وفروخت اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نہایت مہربان ہے۔

اگر ناجائز طریقوں سے ایک دوسرے کا مال کھاؤ گے تو یہ اپنے آپ کو قتل کرنے کے مترادف ہوگا، تمہاری تباہی کا باعث ہوگا، اور اللہ تعالی تمہیں غرق کر دے گا، اور آج اللہ رب العزت کے نظام کو چھوڑ کر من مانی معاشی سرگرمیاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ زمین کے خزانے بے حساب ہیں رزق کے وسائل اللہ رب العزت نے بہت

زیادہ فرمائے ہیں، لیکن انسانی معاشرہ پریشانیوں کے اندر مبتلا ہے، معاشرے میں امن نہیں ہے، چین نہیں ہے ۔ جس کا باعث کسبِ حلال سے اعراض ہے۔

کسب حلال کی افادیت کیا ہے؟

رب راضی ہوتا ہے

سب سے بڑا افادیت کا پہلو تو یہی ہے اس سے انسان کا پروردگار اور بادشاہ جس کے سامنے اس نے پیش ہونا ہے اور جا کر اپنی زندگی کا جواب دینا ہے وہ اس سے راضی ہو جاتا ہے، اس سے خوش ہو جاتا ہے، اس کی خوشنودی اور رضامندی انسان کو اگر حاصل ہو جائے تو اس سے بڑھ کر انسان کے لئے اور کوئی سعادت کی بات نہیں۔

رحمتوں اور برکتوں کا نزول:

اور دوسری افادیت اس کی یہ ہے کہ اس کے ساتھ اللہ رب العزت کی رحمتیں اور برکتیں انسان کو حاصل ہوتی ہیں، فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾

الأعراف:96

ترجمہ: اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا۔

اگر لوگ دنیا کے اندر بسنے والے ایمان اور تقوی کا راستہ اختیار کریں جس کا مظہر اور مقتضی یہ ہوتا ہے کہ انسان حلال کے دائرے میں اپنے آپ کو محدود رکھے اور حرام سے اجتناب کرے تو اس ایمان اور تقوی کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت آسمان و زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں اور انسان کی عزت اور کرامت بھی اسی چیز کے اندر ہے کہ انسان اپنے آپ کو حلال کے دائرے کے اندر محدود رکھے اور حرام کی طرف تجاوز نہ کرے ۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”جو شبہات سے بچتا ہے وہ اپنی عزت کو بھی بچا لیتا اور جو شبہات میں پڑ گیا گویا وہ حرام میں پڑ گیا“۔] 1[

راحت و سکون حاصل ہوتا ہے

اگر انسان اپنے آپ کو حلال کے دائرے کے اندر محدود رکھتا ہے تو انسان کی زندگی میں راحت و سکون بھی ہوتا ہے اور اسکے افعال و تصرفات کے اندر شیرینی اور مٹھاس ہوتی ہے، پاکیزہ اور حلال چیز ہی انسان کے اندر حلاوت پیدا کرنے والی چیز ہے اور پھر یہی چیز ہے کہ جو انسان کو جنت میں لے جانے کا سبب بنے گی جنت میں وہی لوگ جائیں گے جو خود کو طیبات اور پاکیزہ رزق تک محدود رکھتے ہیں جنہیں فرشتے اس حال میں لے کر جاتے ہیں کہ انہوں نے طیّب بن کر زندگی گزاری ہے ان کا عمل، کھانا، لباس سب اچھا اور پاکیزہ، ہر عمل انہوں نے اچھا کیا ہے فرشتے انہیں لے کر جاتے ہیں اور پیغام دیں گے کہ:

﴿سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ﴾

الزمر: 73

ترجمہ: تم پر سلام ہو، تم خوش حال رہو تم اس میں ہمیشہ کیلئے داخل ہو جاؤ۔

تم پہ سلامتی ہو اللہ رب العزت کے بندو "طِبْتُمْ" تم پاک رہے اب یہ پاکیزگی کا گھر اب تمہارا ٹھکانہ ہے۔

کسب حرام کے نقصانات

ظاہر ہے کہ اگر انسان شبہات کا بھی ارتکاب کرے اور یہ اسے حرام کی طرف لے جائیں تو نہ اس کا دین بچے گا نہ اس کی عزت و کرامت بچے گی انسان ذلیل و خوار ہو جائے گا اور دین کی رہنمائی سے محروم ہو جائے گا پھر انسان کا دل ایسا ہو جاتا ہے کہ انسان کو راستہ ہی سجھائی نہیں دیتا نیکی نیکی معلوم نہیں ہوتی، برائی برائی معلوم نہیں ہوتی دل سیاہ ہو کر الٹا ہو جاتا ہے اور انسان کو کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا جبکہ کسبِ حلال پر اکتفا کرنا انسان کی عبادات اور دعاؤں کی قبولیت کا سبب ہوتا ہے حرام انسان کو ایسا بنا دیتا ہے کہ اس سے نہ انسان کی دعا قبول ہوتی ہے اور نہ عبادات جس طرح کہ فقیہ الامۃ ترجمان القرآن سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ " رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حرام کھانے سے انسان کی دعا نہیں قبول ہوتی اور دعا سب سے بڑی عبادت ہے۔" اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں فرمایا کہ " اس کی دعا قبول نہیں ہوتی نہ عبادت۔" زندگی کے اندر راحت اور سکون نہیں رہتا زندگی پریشانیوں کا مجموعہ بن جاتی ہے انسان دولت کے انبار جمع کر لیتا ہے اور کاروبار کے دائرے وسیع کر لیتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اسے نہ سکھ کی نیند آتی ہے اور نہ راحت کے ساتھ وہ زندگی بسر کر سکتا ہے بلکہ امن و امان کی صورت حال مخدوش ہو جاتی کہ انسان کسی وقت بھی

اپنے آپ کو کہیں بھی محفوظ نہیں سمجھتا اور ہر وقت اپنے آپ کو خطرے کے اندر محسوس کرتا ہے یہ اس امر کا نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان نے حلال کے دائرے سے نکل کر حرام کے اس ممنوع دائرے کے اندر قدم رکھ دیا جس سے اللہ ربّ العزت نے اسے منع کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حلال کمانے، حلال کھانے اور اپنی عبادت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

[1] صحیح مسلم: کتاب المساقاۃ، باب أخذ الحلال وترک الشبہات

فہرست

مختصر تعارف 3

تالیفات 4

(1)اسلام میں گردشِ دولت 7

(2)سود حیلہ سازی 23

(3)سودی معیشت اور جدید بینکاری 32

(4)اسلامی معیشت میں زارعت کی اہمیت اور اس سے متعلقہ احکام 42

(5)قرض نادھندگی کے مسائل اور ان کا شرعی حل 64

(6)قرضوں کی اشاریہ بندی 77

(7)اسلام کا عادلانہ نظامِ وراثت اور اس کی خصوصیات 93

(8)بازار شرعی نصوص کی روشنی میں 110

(9)مروجہ اسلامی بینکوں کے ذرائع تمویل(مروجہ مرابحہ،اجارہ اور مشارکہ متناقصہ)کی شرعی حیثیت 122

(10)نقد وادھار سودے 172

(11)بیع سلم کی مروّجہ صورتیں اور ان کا شرعی حکم 182

(12)مروجہ اسلامی بینکوں میں رائج مضاربہ کی شرعی حیثیت 197

(13)دینِ اسلام میں خرید وفروخت کی بنیادی شرائط 208

(14)حلال کمائی کی اہمیت وافادیت 233

مؤلف کی دیگر کتب کے لئے
Peaceofmindna.com
وزٹ کریں۔